مرد درویش

سوانح عمری

حضرت مولانا محمد اشرف خان سلیمانی نوراللہ مرقدہٗ

از: پروفیسر ڈاکٹر فدا محمد صاحب مدظلہ

پیش لفظ

حضرت مولانا محمد اشرف خان صاحب سلیمانیؒ کی سوانح عمری آپ کے ہاتھوں میں ہے۔اس توفیق پر بندۂ عاجز کے پاس اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ذوالجلال کے دربار میں شکرادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ جو باتیں درست لکھی گئی ہیں وہ حضرت مولانا کا فیض ہے۔ جہاں غلطی کوتاہی ہوئی وہ بندہ کی کم علمی اورکم فہمی کا نتیجہ ہے۔امید ہے کہ قارئین کی نشاندہی پر اگلے ایڈیشنوں میں کمیاں دور ہوجائیں گی۔

بندہ جناب حاجی شیر حسن صاحب کاشکر گذار ہے کہ انھوں نے کچھ معلومات بھی بہم پہنچائیں اور مسودہ کوتفصیل سے دیکھ کرمشوروں سے نوازا۔حاجی حسن خان صاحب نے بھی مسودہ کاتفصیلی محاکمہ کرکے مشورے دیے۔سب سے زیادہ حاجی بشیر طارق صاحب نے محنت کی اور مسودے کوتفصیل سے مطالعہ کرکے کئی مقامات پر مفید مشورے دیے،جس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوا۔

بندہ کے انتہائی مہربان رفیق ثاقب علی خان صاحب طاہر خیلی ازاوّل تا آخر پورے کام میں بندہ کے ساتھ رہے۔پورے مسودہ کوکمپیوٹر پرٹائپ بھی کیا اور ہر ہر صفحے اورسطر کے بارے میں بندہ کے ساتھ تفصیلی بحث کرتے ہوئے بہتر سے بہتر ترتیب اختیار کرنے میں معاون ومددگار ثابت ہوئے۔عالمگیر صاحب پروفیسر انجنیئر نگ یونیورسٹی نے پروف ریڈنگ کی اور سلیم صاحب نے ابتدائی مسودہ ٹائپ کیا۔

اللہ تعالیٰ سب کو بے انتہا اجروثواب سے نوازے۔آمین۔

انڈکس

نحمدہٗ و نصلی علٰی رسولہ الکریم اما بعد

سوانح:

انسان کی خصوصیت ہے کہ یہ کوئی بھی چیز سیکھتا ہے تو گردوپیش کے ماحول سے سن کر یا دیکھ کر سیکھتا ہے۔ چنانچہ مادرزاد بہرے نہ تو بولنا سیکھ سکتے ہیں اور نہ کوئی اور تعلیم حاصل کر سکتے ہیں کیونکہ انہوں نے کسی آواز کو سنا ہی نہیں ہوتا، جس سے کچھ سیکھ سکتے۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے سورۃ دھر کی آیت " فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا " کی حکمت سامنے آجاتی ہے۔ کہ بصر (دیکھنے) سے پہلے سمع کا یعنی سننے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

اسی طرح آنکھیں اگر نہ ہوں تو گوئی چیزیں انسان سیکھ سکتا ہے۔ پھر بھی کئی کمیاں رہ جاتی ہیں۔ جن کا ازالہ نہیں ہوسکتا۔ دیکھنا اور سننا دراصل دوسرے انسانوں کی صحبت ہے جو انسان پر اثر انداز ہوتی ہے اور انسان کو ایک رنگ میں رنگ دیتی ہے، بنا دیتی ہے یا بگاڑ دیتی ہے۔

صحبت جہاں زندہ شخصیات کی ہے۔ وہاں دنیا سے رخصت ہوئے لوگوں کی بھی ہے۔ دنیا سے انتقال کیے ہوئے لوگوں کے ساتھ بہت بڑا رابطہ ان کے احوال سن کر ہوتا ہے۔ جو یا تو ان کے صحبت یافتہ لوگوں کے ذریعے سے سن کر ہوتا ہے۔ یا ان کے لکھے ہوئے احوال پڑھ کر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں مشائخ کاملین کی سوانح عمریاں لکھنے، پڑھنے، سننے اور سنانے کا طریقہ رائج رہا ہے۔ اور اس کا بہت فائدہ محسوس ہوتا رہا ہے۔

صوفیاء کے سردار حضرت جنید بغدادیؒ کا ارشاد ہے کہ حکایتیں اللہ تعالیٰ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے، جس سے مریدین کے دلوں کو تقویّت حاصل ہوتی ہے۔ کسی نے دریافت کیا کہ اس کی کوئی دلیل؟ فرمایا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَ كُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ وَ جَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَ مَوْعِظَةٌ وَّ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ (ھود۔۱۲۰)

ترجمہ: اور پیغمبروں کے قصوں میں سے یہ سارے قصے آپ سے بیان کرتے ہیں، جن کے ذریعے ہم آپ کے دل کو تقویت دیتے ہیں اور ان قصوں میں آپ کے پاس ایسا مضمون پہنچتا ہے جو خود بھی راست اور واقعی ہے اور مسلمانوں کیلئے نصیحت اور یاددھانی ہے۔ (بیان القرآن) (بحوالہ حکایات صحابہ)

اس عاجز بندہ پر اللہ تعالیٰ کے لاتعداد احسانات ہیں۔ان میں سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ ایسے گھرانے میں آنکھیں کھولیں جہاں علمائے کرام اور مشائخ عظام کے چرچے ہوتے رہتے تھے۔بچپن میں مولانا غلام غوث ہزارویؒ اور قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ کی مجالس میں حاضری ہوئی۔خیبر میڈیکل کالج کی تعلیم کے دوران مولانا انعام الحسن صاحبؒ (نظام الدّین دہلی) کی مجلس میں حاضری ہوئی اور اُنہی سے بیعت کا تعلق قائم ہوا۔

اس قیام میں ایک تعلق حضرت مولانا محمد اشرف صاحبؒ سے ہوا۔جو پشاور یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے صدر اور پروفیسر تھے۔حضرت جی مولانا انعام الحسن صاحبؒ کی اجازت سے ذکر و اذکار حضرت مولانا محمد اشرف صاحبؒ کی نگرانی میں شروع کیے۔اور تربیت کا تعلق بھی اُنہی سے قائم کیا۔

اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور ۱۹۶۵ء تا ۱۹۹۵ء تیس سال حضرت کی خدمت میں حاضری رہی۔

حضرت موصوف کی زندگی کے عجیب وغریب پہلو سامنے آتے رہے۔ان کے آخری سالوں میں یہ بات دل میں آتی رہی کہ ان کی سوانح عمری لکھی جائے۔پھر یہ خیال بھی آیا کہ ان کے بڑے باکمال خلفاء ہیں، بعض علماء بھی ہیں۔وہی اس کے اہل ہوسکتے ہیں پھر کچھ دنوں یہ سوچ بھی ابھری کہ اسلامی کتب کی بہت بڑی تعداد ہے اس میں کیا اضافہ کیا جائے۔موجودہ کتب کو ہی اگر پڑھ لیا جائے تو غنیمت ہے۔اس طرح یہ بات ملتوی (POSTPONE) ہوتی رہی۔ایک مرتبہ بندہ نے حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ عصر کی مجلس میں اگر حضرت مولانا اپنے احوال آپ بیتی کی شکل میں خود ہی لکھوانا شروع فرمادیں تو بہت کرم ہو۔مستفیدین اور مجلس والے انہی باتوں کو سن لیا کریں اور کاتب لکھ لیا کرے۔لیکن یہ بات بھی وجود میں نہ آسکی۔حضرت مولاناؒ کی وفات کے بعد سوانح عمری کا تقاضا شدت سے دل میں وارد ہوتا رہا۔اور اس کے لیے درج ذیل وجوہات معاون اور مددگار ثابت ہوئیں۔

۱۔بزرگوں کی سوانح عمری لکھنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ اس سے ان کے مستند حالات محفوظ ہوجاتے ہیں اور غیر مستند حالات ان سے منسوب کرنے کا خطرہ ٹل جاتا ہے۔

۲۔ان کی تعلیمات اور مسلک واضح ہوجاتا ہے اور کوئی غلط تعلیمات یا غلط مسلک ان کی طرف منسوب نہیں کر سکتا اور نہ ہی خود ساختہ کرامتیں منسوب کرسکتا ہے۔

۳۔ان کے صحبت یافتہ افراد کی موجودگی میں سوانح سامنے آجانے سے اس پر بحث ہوکر غلطیوں کی اصلاح ہو

جاتی ہے۔

۴۔قریب کے زمانے کے لوگوں کے لیے اپنے زمانے کے بزرگوں کے حالات زیادہ پرکشش ہوتے ہیں اور حالات کی مماثلت کی وجہ سے زیادہ قابل عمل ہوتے ہیں۔

۵۔مریدین متوسلین اور گردوپیش کے لوگوں کو زیادہ مناسبت ہوتی ہے۔اس لیے ان لوگوں کے لیے بہت زیادہ فائدے کا سبب بنتی ہے۔

۶۔بعض اوقات ہم عصریت کسی شخصیت اور اس کے گردوپیش کے افراد کے درمیان حجاب بن جاتی ہے۔یہ حجاب شخصیت کی خوبیوں کو نگاہوں سے اوجھل رکھتا ہے۔اس لیے شخصیت سے فائدہ اٹھانے میں مشکلات حائل ہوتی ہیں۔بعد وفات کے یہ پردہ اٹھ جاتا ہے۔اس یے سوانح جو اکثر بعد وفات شائع ہوتی ہیں،زیادہ فائدہ کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

اس سوانح میں بندہ کی زیادہ کوشش یہ ہوگی کہ جو حالات وواقعات خود اپنی آنکھوں سے دیکھے یا حضرت مولاناؒ سے خود سنے وہ بیان کیے جائیں۔ان کے ساتھ حوالے کی ضرورت نہ ہوگی دوسرے حضرات کے بیان کردہ حالات وواقعات کے ساتھ ان کا حوالہ درج ہوگا۔

سوانح حضرت مولانا محمد اشرف صاحب سلیمانی

خاندانی حالات

حضرت مولاناؒ کی پیدائش پشاور شہر کے محلّہ مقرب خان میں محمد اکبر خان صاحب کے ہاں ۱۹۲۵ء میں ہوئی۔ جو مومند قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ قبیلہ مومند پشاور اور مضافات پشاور میں آباد ہے۔ یہ قبیلہ پٹھانوں کی دینداری، جفاکشی، سادہ مزاجی، بہادری اور مہمان نوازی کی روایات کا بدرجۂ اتم حامل ہے۔

محمد اکبر خان صاحب ایک پابند صوم وصلوٰۃ، صالح، ذاکر وشاغل اور باشرع بزرگ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے کاروبار میں بہت برکت دی ہوئی تھی۔ پشاور، دہلی، شملہ اور دارجیلنگ میں ان کی قالینوں کی دکانیں تھیں۔ جو کامیابی سے چل رہی تھیں اور خوب متموّل حالات میں زندگی گذر رہی تھی۔ مخیّر آدمی تھے۔ مہمانوں کی آمد ورفت اور آباد دستر خوان کے مالک تھے۔ پشاور سے جانے والے پٹھانوں کی رہائش وخورد ونوش، دہلی اور شملہ میں انہی کے ہاں ہوتی تھی۔ ہمیں حضرتؒ نے سنایا کہ مشہور خدائی خدمت گار تحریک کے بانی خان عبدالغفار خان جب دہلی وشملہ آتے تو ہمارے ہاں ہی ٹھہرتے اور والد صاحب خاص طور سے ان کے مطالبے پر ان کے لئے پائے پکواتے تھے۔

ایک دفعہ حضرت کے ساتھ ۱۹۷۵ء میں کراچی جانا ہوا۔ وہاں ایک سیٹھ صاحب کے ہاں مہمان ہوئے۔ جنہوں نے دن رات دست بستہ بہت زیادہ خدمت کی۔ بندہ کے معلوم کرنے پر پتا چلا کہ میزبان کے والد صاحب حضرتؒ کے والد صاحب کے ساتھ ملازم رہے ہیں اور وہاں سے قالینوں کے کاروبار کا ایسا تجربہ حاصل کیا کہ اب ان لوگوں کا اپنا کارخانہ ہے۔ اس وجہ سے حضرت سے بہت عقیدت اور محبت کا معاملہ فرما رہے تھے۔

حضرت کی والدہ صاحبہ جنہیں بڑھاپے میں بندہ نے دیکھا اور ان کا معالج بھی رہا، بہت زیادہ بابرکت عورت تھیں۔ شروع دور میں پیر مہر علی شاہ صاحبؒ سے بیعت ہوئیں۔ پیر صاحب کی وفات کے بعد حضرت شاہ عبدالعزیز دعاجوؒ سے بیعت ہوئیں۔ صوم وصلوٰۃ اور پردہ کی انتہائی پابند تھیں بڑھاپے میں بھی جبکہ پردہ کے احکامات شریعت کی رو سے کم ہو جاتے ہیں، سر کے بال گردن وغیرہ خوب ڈھانپ کر اپنے علاج کے سلسلے میں ملتیں۔ خاص طور پر ذاکر وشاغل عورت تھیں۔ تقریباً ۸۵ سال کی عمر میں وفات ہوئی۔ اس ضعف اور

بڑھاپے کے باوجود آخری سال کے روزے بھی پورے رکھے۔ بہت صدقہ وخیرات کرنے والی خاتون تھیں۔ حضرت کے دستر خوان پر روزانہ دو چار سے لے کر پندرہ بیس تک اور خاص موقعوں پر چالیس پچاس تک مہمان ہوتے تھے۔اس سارے بندوبست کی خودنگرانی فرماتی تھیں۔کئی بچیوں کو گھر میں رکھا اور بالغ ہونے پر شادیاں کرا کے اپنے اپنے گھروں میں آباد کیا۔ان کی وفات پر خود بندہ نے ان کے ملازمین کو روتے دیکھا۔ بشیر طارق صاحب کی روایت کے مطابق مرحومہ محترمہ نے اپنے ماموں سے درسِ نظامی کی کتب بھی پڑھی ہوئی تھیں۔

حضرت کے والد اور والدہ صاحبہ دونوں اس قدر سمجھدار لوگ تھے کہ اُس دور میں اپنے بچّے بچیوں کو خوب پڑھایا لکھایا۔ چنانچہ حضرت کے سب سے بڑے بھائی جناب محمد اکرم صاحب ایئرفورس میں سکواڈرن لیڈر رہے۔آرمی کے کوٹہ پر فارن سروس میں بڑے درجے کے افسر رہے۔ بہت صحت مند وخوش پوش شخصیّت کے مالک تھے۔ ہر وقت سُوٹڈ بُوٹڈ رہتے۔ بندہ سے فرمایا کہ دوسری جماعت سے جو نماز شروع کی ہے اب تک کبھی قضا نہیں ہوئی۔ نیز فرمایا کہ ہر وقت باوضو رہتا ہوں۔انتہائی دیانت داری اور فرض شناسی سے کام کرتے رہے۔ بہت نرم دل تھے، دینی مجلس میں انکی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔

دوسرے بھائی اسلم خان صاحب کو اُس دور میں کِنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں پڑھایا۔وہ فوجی ملازمت میں شامل ہوئے۔اور میڈیکل کور میں ایر وائس مارشل تک پہنچ کر ریٹائر ہوئے۔دورانِ سروس صوبہ سرحد کی حکومت نے ان کی خدمات بطور ہیلتھ ڈائریکٹر اور ہیلتھ سیکریٹری حاصل کیں۔ ہر دو جگہ فرض شناسی اور دیانتداری کا ریکارڈ قائم کیا۔ پابندِ صوم وصلوٰۃ شخصیّت تھے۔ریٹائرمنٹ کے بعد صوبہ سرحد کی حکومت نے دوبارہ ایڈمنسٹریٹر لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور متعین کیا۔زندگی کے آخری ایاّم میں سعودی ہلال احمر تنظیم میں افغان مہاجرین ہسپتالوں کے ڈائریکٹر رہے۔

حضرت مولانا صاحبؒ اپنے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ بڑے بھائی کو ڈاکٹر بنانے کے بعد والد صاحب مجھے انجینئر بنانا چاہتے تھے۔اس لیے میٹرک میں ڈرائنگ کا مضمون رکھا۔اس زمانے میں میٹرک کی ڈرائنگ صرف ماڈل ڈرائنگ نہیں تھی بلکہ ساتھ ساتھ انجینئرنگ کا ایک مضمون (SCALE DRA-WING) بھی اس میں شامل ہوتا تھا۔فرمایا لیکن خدا تعالیٰ کو یہ منظور نہیں تھا، اس لیے ان کی وفات پر سائنسی مضامین چھوڑ کر صرف بی۔اے کیا۔

حضرتؒ کی دینی تعلیم:

اس دور میں بچپن میں ابتدا دینی تعلیم سے کی جاتی تھی۔سکول کے مضامین کافی دینی معلومات کے حامل ہوتے تھے۔اس کے علاوہ سمجھدار گھرانے اپنے بچّوں کو گھر پر استاد (tutor) مقرر کر کے تعلیم دلواتے تھے۔حضرت کے بچپن کے دور میں ان کی مسجد میں ایک بلند پایہ عالم دین قاضی نورلاعظم باجوڑی امام تھے۔ ان کی نظر اس ہونہار بچے پر پڑی تو دینی فراست سے بچے کی خوش بختی کو بھانپ لیا۔اور خود پیشکش کر کے حضرت کو پڑھانا شروع کیا۔حضرت اپنے استاد کے بہت مدّاح تھے۔فرماتے تھے کہ قاضی صاحب اس قدر محتاط اور متّقی بندے تھے کہ عشاء کے بعد مسجد کا بلب بجھا دیتے تھے۔اور دوران تعلیم اپنا چراغ جلا کر پڑھاتے تھے۔اور فرماتے تھے کہ مسجد کا بلب ان لوگوں کی طرف سے جو چندہ دیتے ہیں صرف نماز کے اوقات میں جلانے کی اجازت ہے اس لیے دوران تعلیم اس کا جلانا جائز نہیں۔ایک دفعہ فرمایا کہ حضرت کی والدہ صاحبہ نے قاضی صاحب کو ایک نیا چغہ دیا جو حضرت مولاناؒ کے والد صاحب کے لیے بنایا گیا تھا۔لیکن وفات کی وجہ سے انہیں پہننے کی نوبت نہیں آئی تھی۔قاضی صاحب نے قبول کرنے سے انکار فرمادیا، کہ کہیں تعلیم کا معاوضہ نہ ہو جائے۔نیز میراث کی تقسیم سے پہلے، وفات پا جانے والے آدمی کی کسی چیز کو استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔قاضی صاحب کی وفات بھی بڑی عجیب ہوئی جو بظاہر ان کے مقبول عنداللہ ہونے کی علامت ہے۔چنانچہ دوران حج میدانِ عرفات میں وفات ہوئی اور وہیں دفن ہوئے۔

قاضی صاحب سے اپنے باقی اسباق کے علاوہ بُخاری شریف بھی مکمّل پڑھی۔بخاری شریف اس طرح مستحضر تھی کہ ایک دفعہ یوں ہوا کہ راقم ایک جگہ تبلیغی سلسلہ کی تقریر کر رہا تھا۔جس میں بندہ نے کہہ دیا کہ ایمان گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔مجمع میں شعبۂ اسلامیات پشاور یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر مولوی محمد عمر صاحب (Ph.D) بیٹھے تھے۔جو علاوہ ایم۔اے اسلامیات کے دارلعلوم میں بھی پڑھے ہوئے تھے۔بندہ نے بعد بیان کے ان سے عرض کیا کہ اگر کوئی غلطی ہوئی ہو تو اصلاح فرمادیں۔انہوں نے فوراً فرمایا کہ امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے۔الایمان لا یزید و لا ینقص (ایمان نہ گھٹتا ہے اور نہ بڑھتا ہے)۔لیکن ڈاکٹر صاحب آپ نے تو کہا کہ ایمان گھٹتا اور بڑھتا ہے۔بندہ کو جواب معلوم نہیں تھا۔حضرت کی خدمت میں حاضری ہوئی اور یہ سوال پیش کیا۔انہوں نے فرمایا میری بخاری شریف لاؤ۔اس کا صفحہ نکال کر حاشیہ پر اپنی پنسل سے لکھی ہوئی تحریر

پڑھی اور فرمایا دورانِ درس اس نکتہ کو میں نے پینسل سے لکھ لیا تھا۔ وہاں لکھا تھا کہ اصلی ایمان نہ تو بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے۔ کیونکہ وہ تو خاص عقائد کا نام ہے، اگر وہ ہیں تو ایمان ہے اور ان میں سے کسی ایک سے بھی انکار ہو جائے تو کُفر ہے۔ البتہ ایمان شرعی یعنی قوت ایمان میں کمی اور بیشی ہوتی رہتی ہے۔ غرض قاضی نورالاعظم صاحب سے بُخاری مکمّل فرمائی۔ ایک موقع پر فرمایا کہ استاد صاحب نے بُخاری شریف کے ختم پر پشتو میں فرمایا ''بچیہ دا بخاری شریف داسے مبارک کتاب دے چہ اُس چرتہ بہ نہ بندیگے''۔ نیز مزاحاً فرمایا ''اُس مُلا شوے رزق دے فراخ شو''۔ یعنی بیٹا یہ بُخاری شریف ایسی مبارک کتاب ہے کہ اب کہیں نہیں رکو گے۔ اور مزاحاً فرمایا کہ اب مولوی ہو گئے ہو اب تمہاری روزی فراخ ہو گئی۔

آپ کا علمی ذوق اور چسکہ اتنا شدید تھا کہ ساری عمر ہی سیکھنے کے مواقع ہاتھ سے جانے نہیں دیے۔ چنانچہ آپ کے خلیفہ پروفیسر خلیل صاحب کے والد جناب مولانا محمد امیر صاحب (جو فاضلِ دیوبند اور کہنہ مشق مدرّس عالم تھے نیز موصوف حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد اور مرید تھے)، جب پشاور منتقل ہوئے تو اپنے خاص ساتھیوں کے ہمراہ ہدایہ اور جلالین ان سے مکمل کی۔ اور یہ وہ دن تھے جب آپ عربی کے پروفیسر صدر شعبہ اور شیخ المشائخ تھے۔ گرمیوں کی چھٹیوں مین حضرت مولانا یوسف بنوریؒ صاحب کے ہاں کراچی تشریف لے جاتے اور طویل قیام فرماتے۔ اس قیام میں ان کے حدیث کے درسوں میں حاضری فرماتے۔ دورانِ درس ایسے ایسے سوالات پوچھتے کہ مدرسین اور طلباء ششدر رہ جاتے۔ ایک سندِ حدیث، محدّثِ عصر حضرت مولانا یوسف بنوریؒ صاحب نے اپنے دست مبارک اور اپنے ذاتی قلم کی تحریر کے ساتھ عطا فرمائی تھی۔

حضرت بنوریؒ کی سند کے بارے میں عجیب واقعہ بھی سنایا کہ ایک مرتبہ حضرت بنوری طواف فرما رہے تھے کہ ایک عرب عالم نے دورانِ طواف ہی آپ کا ہاتھ تھام لیا اور عرض کیا کہ مجھے سندِ حدیث عطا فرمائیں۔ حضرت نے جواباً فرمایا ''بھائی یہ کونسا سند لینے کا موقع اور محل ہے''؟ اس عالم نے عرض کیا کہ حضرت میں خود نہیں آیا بلکہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے۔ اس نے اپنا خواب سنایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی اور آپ نے فرمایا کہ میرے بیٹے یوسف بنوری سے جا کر سندِ حدیث لو۔ حضرت مطاف سے باہر تشریف لائے کتاب منگوائی مذکورہ عالم سے کچھ احادیث پڑھوائیں اور اپنے قلم سے لکھ کر سند عطا فرمائی۔

حضرت مولانا یوسف بنوری صاحبؒ سے حضرت کو بہت زیادہ محبت تھی۔ حضرتؒ بھی آپ کو بہت چاہتے تھے۔ ان کی طرف سے حضرت مولاناؒ کو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہٗ والی حدیث مسلسل بھی حاصل تھی۔ اس کا پتہ بندہ کو اس طرح چلا کہ ایک معمّر عالم آپ سے ملنے تشریف لائے۔ وہ ایک مدرسے کے مہتمم بھی تھے اور کسی بزرگ کے خلیفہ بھی تھے۔ وہ بڑے باادب اور عاجزانہ طریقے سے حضرت مولاناؒ سے ملے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ حضرت مولاناؒ سے حدیثِ مسلسل لینے کے خواہاں ہیں۔ بندہ نے سوال کیا کہ حدیث مسلسل کیا ہے؟ تو پتہ چلا کہ ایک مرتبہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہٗ سے خوش ہو کر فرمایا ''اے معاذ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں، سب نمازوں کے بعد اللّٰھم اعنی علی ذکرک وشکرک و حسن عبادتك پڑھنا نہ بھولا کرو''۔ یہ حدیث حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہٗ سے مسلسل چلتی ہوئی آئی ہے کہ جب کسی شیخ کو اپنے مرید اور شاگرد کے لیے تعلق کی وہ کیفیت محسوس ہوئی ہے تو شیخ نے اس وقت مرید کو حدیثِ مسلسل عطا کی ہے۔ مذکورہ معمر عالم کو آپ نے عطا نہیں فرمائی کیونکہ یہ صرف زبان کے بول نہیں ہوتے بلکہ قلب کی ایک کیفیت ہوتی ہے۔ بندہ پر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ ایک دن حضرت مولاناؒ نے حدیث مسلسل بندہ کو عطا فرمائی۔ حضرت کے خلیفہ حسن خان صاحب نے بتایا کہ حدیث مسلسل انھیں بھی عطا ہوئی ہے اور حضرت مولانا احمد جان صاحب کو بھی عطا ہوئی ہے۔

حضرت مولاناؒ حضرت بنوریؒ کے حالات اکثر بڑے لطف سے سنایا کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ جب حضرت بنوری نے دارالعلوم بنوری ٹاؤن کراچی جاری فرمایا تو شروع دور میں طلباء کے لیے روٹیاں تندور سے ٹوکرے میں ڈال کر خود سر پر اٹھا کر لایا کرتے تھے۔ سالن نہیں ہوتا تھا۔ ایک دفعہ بازار میں شیرہ قسم کا بہت سستا گڑ آیا ہوا تھا وہی خرید لیا کہ طلباء بطورِ سالن استعمال کرلیں گے۔ روٹیوں کے اوپر ٹوکرے میں گڑ رکھا ہوا تھا، راستے میں بارش ہوگئی۔ گڑ پگھل کر ڈاڑھی اور کپڑوں پر بہنے لگا۔ فرماتے تھے اس وقت مجھے رونا آیا اور میں نے دعا مانگی کہ یااللہ یہ طلباء تیرے مہمان ہیں تو ہی اِن کا بندوبست فرما۔

اس قدر تنگدستی اور عُسرت تھی کہ فرماتے تھے کہ گرمیوں میں میں نے ایک شامی جبّہ پہنا ہوا تھا۔ لوگ سمجھتے ہوں گے کہ بطورِ فیشن بڑا مولوی نظر آنے کے لیے پہنا ہوا ہے۔ لیکن یہ جبّہ دراصل میرے لیے ستّارالعُیوب تھا کیونکہ اس کے نیچے میں نے جو کرتا پہنا ہوا تھا، اس قدر پھٹا ہوا تھا کہ دکھانے کا نہیں تھا۔ ان مُشکلات کے باوجود مع اپنے ساتھیوں کے فاقوں کے لیے کمر باندھی ہوئی تھی۔ کسی کے آگے ہاتھ نہیں

پھیلاتے تھے اور محتاط شرائط کے بغیر کسی کے پیسے قبول نہیں کرتے تھے۔ زکوٰۃ وغیرہ حیلہ کر کے قطعاً تنخواہوں میں نہیں دیتے تھے۔ فرماتے تھے کہ مدرسہ ایسی چیز ہے کہ آخرت کی نیّت سے چلاؤ تو دنیا کا عذاب ہے اور اگر دنیا کی نیّت سے چلاؤ تو آخرت کا عذاب ہے۔ یہ قُربانیاں اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائیں اور مدرسہ بغیر چندوں کے اتنی فراخی اور آسودگی کے ساتھ چلنے لگا کہ اس معیار پر یونیورسٹیاں بھی نہیں چلتیں۔ زندگی کے آخری سالوں میں حضرت سے فرمایا کہ اپنے پیسوں کا حج اور عمرہ کر کے چالیس ہزار روپے خیرات کیے ہیں۔ یہ وہ دن تھے جبکہ سونا چھ سو روپے تولہ تھا۔

آپ کا مسلک:

آپ سختی سے علمائے دیوبند کے مسلک کے پابند تھے اور ائمۂ مجتہدین (امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ) کی تقلید کو واجب گردانتے تھے۔ ایک وقت میں ایک امام کی تقلید ہی اشد ضروری ہوتی ہے۔ کوئی مسئلہ ایک امام سے لے لینا، کوئی دوسرے سے لے لینا، اس کے بارے میں فرماتے تھے کہ یہ اطاعت نہ ہوئی بلکہ خودرائی اور نفس پرستی ہوئی۔ اس سے زیادہ خطرناک اس بات کو جانتے تھے کہ نہ تو علمی استعداد ہو، نہ فہم ہو اور نہ خوف خدا و تقویٰ ہو اور آدمی خود ہی احادیث سے مسائل کا استنباط شروع کر دے۔

ایک مرتبہ رمضان کے مہینے میں رات کو تراویح ہونے والی تھی کہ ڈاکٹر میاں سیّار صاحب سوات سے طویل سفر کر کے تھکے تھکائے حضرت کے ہاں پہنچے۔ انھوں نے بندہ سے کہا کہ اتنا تھکا ہوا اور بے دم ہوں کہ نمازِ عشاء کے علاوہ تراویح پڑھنے کی بالکل ہمت نہیں ہو رہی۔ بندہ نے جواباً کہا ''اللہ کے بندے کچھ ہمت کرو''۔ اس نے کہا کہ بالکل بے دم ہوں۔ بندہ نے پھر کہا کہ شروع تو کرو اگر کچھ نہ ہو سکے تو آٹھ رکعت تو کم از کم پڑھ لو۔ اس بات کو بغیر تفصیلات کے ڈاکٹر برہان نے شکایتاً حضرت مولانا صاحب سے کہہ دیا کہ ڈاکٹر فدا نے ڈاکٹر سیّار سے کہا ہے کہ تراویح آٹھ رکعات پڑھو۔ تراویح کے بعد حضرت مولانا کے آگے بندہ کی پیشی ہو گئی۔ حضرت اگرچہ بہت نرم مزاج تھے لیکن ایسی باتوں پر غصّے کا اظہار فرماتے تھے۔ بندہ کی ڈانٹ ڈپٹ فرمائی اور ترک تقلید پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ نیز فرمایا ''اگر ایک آدمی ایک امام کی تقلید کو چھوڑ کر کوئی مسئلہ دوسرے امام سے لے لے تو اس کی بھی شرعاً یہ سزا ہے کہ اس کے دانت نکالے جائیں''۔ برہان چونکہ ڈینٹل سرجن تھا اس لیے ساتھیوں نے کہا کہ یہ فتویٰ برہان نے اپنے دانتوں کے کام کی پریکٹس زیادہ کرنے کے لیے

کیا۔ بندہ نے تفصیلات عرض کیں تو جان چھوٹی۔ بھانت بھانت کے نئے طریقے جو وجود میں آ گئے ہیں اور اپنے آپ کو مسلک دیوبند کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں ان کو آپ پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ آپ اس کے قائل تھے کہ جو آدمی حدیث کا اشتغال طریقۂ حنفی کے مطابق نہ کرتا ہو، بیعت کے سلاسل کا قائل نہ ہو اور جہاد نہ خود کرتا ہو، نہ جہاد کی تائید کرتا ہو وہ دیوبندی نہیں ہے۔ گردوپیش سے جو مختلف مولوی صاحبان کے جھگڑوں اور فسادات کی خبریں آتی تھیں، ان کے بارے میں فرماتے تھے کہ کام کرنے والوں نے کسی کی تہہ نہیں کھائی۔ یعنی جس طرح کپڑا استری کی تہہ کھالیتا ہے تو خوشنما ہو کر پہننے کے قابل ہو جاتا ہے، بھلا لگتا ہے اور ہر کسی کو پسند آتا ہے۔ اس طرح ان حضرات نے اپنی تربیت تو کروائی نہیں اور دینی کام شروع کر کے دوسروں کی تربیت شروع کردی ہے۔ لہٰذا زمین جائیداد کے جھگڑے اور برادریوں کی چپقلشوں کی بجائے دینی جھگڑے وجود میں آ گئے ہیں۔ یعنی نفس نے وہاں کام نہ کیا، یہاں کام کرلیا۔ اور دین کا کام کرنے والے کو اپنے زعم میں تسلی رہی کہ وہ دین کا کام کررہا ہے۔ حیاتِ انبیاء علیھم السّلام (بعد وصال) کے رد کرنے والوں کو آپ بہت خطرے میں سمجھتے تھے۔

سیاسی زندگی:

یہ زمانہ سیاسی تحریکوں کے زور کا زمانہ تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آ گئی تھی اور کام کر رہی تھی۔ اس کی باگ ڈور مولانا ابوالکلام آزاد کے ہی ہاتھ میں رہی۔ جمیعۃ العلماءِ ہند جوش وخروش سے کام کر رہی تھی۔ تحریک خلافت نے ہندوستان کو ہلا دیا تھا۔ مسلم لیگ بھی وجود میں آ گئی تھی۔ ہر سمجھدار اور حسّاس آدمی کا سیاسی شعور بیدار ہو چکا تھا اور وہ کسی نہ کسی جگہ سیاسی طور سے وابستہ ہو گیا تھا۔

حضرت نے فرمایا ایک دن انگریزوں کی پولیس ہمارے گھر شملہ آ گئی۔ ہمارے والد صاحب کے بارے میں پوچھا۔ جو علاقہ اور محلّہ کی معزز شخصیت تھے۔ معلوم ہوا کہ ان کے پاس رپورٹ ہے۔ وہ مجھے (حضرت صاحب) کو گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ جُرم معلوم کیا تو پتہ چلا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو خط لکھا ہے اور سیاست میں حصہ لیا ہے۔ پولیس افسر جو حضرت مولانا کے والد صاحب کا واقف اور مدّاح تھا۔ اس نے کہا اوہو یہ تو چھوٹا لڑکا ہے اس کا سیاست سے کیا تعلق؟ یوں یہ بلا ٹل گئی۔

ایک دفعہ فرمایا کہ میں (حضرت صاحب) مولانا ابوالکلام آزاد سے خود جا کر ملا اور ہندوؤں کے ساتھ رہ کر کام کرنے کے بارے میں اور متّحدہ ہندوستان کے فارمولے کے بارے میں بحث کی اور دلائل

دیے۔ ابوالکلام آزاد جیسی زمانہ ساز شخصیّت کو حیرت ہوئی اور شفقت بزرگانہ سے فرمایا برخوردار! یہ باتیں آپ کے سوچنے کی نہیں ہیں۔ ان کا وقت آنے پر بڑے فیصلہ کرلیں گے۔ خیر جب مسلم لیگ ترقی کرنے لگی اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ اور ان کے مریدین سید سلیمان ندویؒ، شبیر احمد عثمانیؒ، ظفر احمد عثمانیؒ اور مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی تائید مسلم لیگ کو حاصل ہوئی تو ہندوستان کا دینی ذہن اس طرف متوجہ ہوا ان حضرات کا مسلم لیگ پر اتنا احسان تھا کہ جب قائداعظم محمد علی جناح سے لوگوں نے کہا کہ آپ کو علماء کرام کی تائید حاصل نہیں ہے تو انہوں نے جواباً کہا کہ مجھے ایک ایسے عالم (اشرف علی تھانویؒ) کی تائید حاصل ہے، جن کا تقویٰ پورے ہندوستان کے برابر ہے۔ شبیر احمد عثمانیؒ اور ظفر احمد عثمانیؒ کے قائداعظم اتنے ممنونِ احسان تھے کہ پاکستان کے جھنڈے کی پہلی پرچم کشائی مغربی پاکستان میں شبیر احمد عثمانیؒ اور مشرقی پاکستان میں ظفر احمد عثمانیؒ کے دست ہائے مبارک سے کرائی۔

ان حالات کے پیشِ نظر گریجویشن کے بعد حضرت مولاناؒ کا رجحان طبع مسلم لیگ کی طرف ہوا اور باقاعدہ شمولیّت اختیار کر کے سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ باوجود نوعمر ہونے کے اس قدر اخلاص اور جانفشانی سے کام کیا کہ پشاور مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد مسلم لیگ سینٹرل کونسل کے ممبر مقرر ہوئے۔ (یاد رہے کہ اس کونسل کے پورے برصغیر سے صرف سترّ ممبر ہوتے تھے۔) خود فرماتے تھے کہ انگریزوں کے نظام کو فیل کرنے کے لیے انگریزی تنصیبات و عمارات میں دھماکے کرنے کے لیے مسلم لیگ کا ایک گروہ تیار کیا گیا۔ فرماتے تھے کہ بعض اوقات میں دونوں ہاتھوں میں گرنیڈ اٹھائے ہوئے آدھی رات کو اکیلے انگریزی تنصیبات و عمارات کی طرف بڑھ رہا ہوتا تھا۔ اس زمانے میں ایک آزاد ریڈیو سٹیشن مسلم لیگ نے شروع کیا جو نو دس میل تک آزاد مملکت پاکستان کے نام سے نشریات نشر کرتا تھا۔ یہ ریڈیو سٹیشن بھی حضرت ہی کے گھر پر چلتا تھا۔ جب پولیس کا چھاپہ پڑتا تو مکان کی چھت پر چڑھ کر چھت کے راستے دوسروں کے گھر یہ سٹیشن منتقل کر دیا جاتا تھا۔

حضرت نے کئی مرتبہ یہ واقعہ سنایا کہ کانگریس کی منتخب صوبائی اسمبلی کا اجلاس، موجودہ ہائی کورٹ کی بلڈنگ (جو اس وقت کی صوبائی اسمبلی تھی) میں ہونے والا تھا۔ مرکزی مسلم لیگی قیادت کا حکم تھا کہ اس اجلاس کو ہر صورت میں ناکام بنانا ہے۔ جب مسلم لیگ جلوس لے کر نکلی تو قلعہ بالا حصار کے قریب جہاں اوپر سے ریل گزرتی ہے اور نیچے عام گاڑیاں چلتی ہیں، جسے عام طور پر پشاور والے ''سُورے پُل'' (سوراخ والا پُل) کہتے

ہیں، انگریزوں کی پولیس نے سرخ فیتا باندھا ہوا تھا۔ اوراس بات کا اعلان ہو رہا تھا کہ جس نے اس فیتے کو پار کیا اس پر گولی چلادی جائے گی۔ چنانچہ جب مسلم لیگ کے جلوس نے اس کو پار کیا تو گولی چلادی گئی۔ دو آدمی شہید ہوئے اور چند زخمی ہوئے۔ لیکن اس واقعے نے ہندوستانی سیاست کی کایا پلٹ دی۔ یہ واقعہ حضرت نے کئی بار سنایا۔ لیکن مجمل۔ بندہ کے دل میں خیال آیا کہ اب کے جب آپ یہ واقعہ سنائیں گے تو میں پوچھوں گا کہ پھر وہ فیتا کس کس نے پار (Cross) کیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب یہ واقعہ آپ نے سنانا شروع کیا تو بندہ نے سوال کیا کہ حضرت یہ فیتا کس کس نے کراس کیا تھا اور کیسے کراس کیا تھا؟ تو اس پر فرمایا کہ جب جلوس وہاں پہنچا اور فیتے پر رک گیا تو میں نے (یعنی حضرت مولانا) نعرۂ تکبیر کہہ کراس کو کراس کیا۔ ساتھ پیر مانکی شریف صاحبؒ (امین الحسنات صاحب) نے پار کیا۔ ان کے ساتھ ان کے مریدوں نے پار کیا۔ اس پر گولی چلی۔ ان کے مریدوں میں سے ایک آدمی شہید ہوا۔ اور ایک کے گھٹنے پر گولی لگی۔ لیکن اس واقعہ نے پورے برصغیر میں ہلچل مچادی اور مسلم لیگ کے ساتھ لوگوں کی والہانہ وابستگی ہوگئی۔ یہاں تک کہ پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ کے نعرے نے مسلمانوں کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع کر دیا۔ غرض اس طرح تن من دھن قربان کر کے پاکستان کیلئے کام کیا۔ اس سیاسی تگ ودو میں بھی اعلائے کلمۃ اللہ اور اشاعت دین کا کام کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ ”میں ساتھیوں سے مُصر ہوا کہ اللہ کے بندو مسلم لیگ کی رٹ لگاتے ہو۔ کم ازکم نماز تو پڑھ لیا کرو۔ خاص طور سے آج جمعہ ہے آج تو نماز کے لیے چلے جاؤ“ اس پر ایک رکن نے جواب دیا۔ مولانا بات تو نے اچھی کہی آج تو سارے ووٹ مسجد میں ہیں لہٰذا جمعہ کی نماز پڑھنی مفید ہوگی۔ فرماتے تھے کہ بعض اوقات میں اذان دے دیتا تھا کبھی سردار عبدالرّب نشتر صاحب اور کبھی میں خود نماز پڑھا دیتا تھا۔

اللہ کا فضل ہوا پاکستان بنا تو فرماتے تھے کہ میں نے کونسل سے شرعی نظام کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا۔ ایک دفعہ ایک لیڈر نے مجھ سے کہا کہ مولانا تمہیں ریاست لسبیلہ دے دیں گے اس میں تجرباتی طور پر چلا کر دکھا دو۔ مسلم لیگ کو آپ کی خدمات کا پورا احساس تھا اور پوری کونسل آپ کی سرگرمیوں کی معترف اور قدردان تھی۔ چنانچہ پاکستان بننے کے بعد جب قائداعظم محمد علی جناح پہلی مرتبہ پشاور آئے تو سپاس نامہ پیش کرنے کا مسئلہ سامنے آیا۔ مسلم لیگ تین دھڑوں میں منقسم تھی۔ اور ہر دھڑا دوسرے دھڑے کے فرد کے ذریعے سپاس نامہ پیش ہونے سے ناخوش تھا۔ آخر تینوں دھڑوں کا اتفاق آپ پر ہوا۔ چنانچہ آپ نے قائداعظم محمد علی جناح کے سامنے پہلا سپاس نامہ صوبہ سرحد کی طرف سے پیش کیا۔ اخباری تصاویر اس وقت کے مسلم لیگی حضرات

کے پاس بندہ نے بھی دیکھی ہیں جن میں حضرت مولاناؒ سپاسنامہ پیش کر رہے ہیں۔

آپ کی قربانیوں کے پیشِ نظر پاکستان بننے کے بعد آپ کو ہندوؤں کی متروکہ جائیدادوں کی دیکھ بھال اور ان کی الاٹمنٹ کے لیے ان کا سب سے بڑا افسر (custodian) بنایا گیا۔ ایسی پوسٹیں سیاسی کارکنوں کے لیے بہت زیادہ کشش کا ذریعہ ہوتی ہیں اور پارٹی والے جس پر خاص نوازش کریں اس کو ہی ایسی پوسٹیں دیتے ہیں اور یار لوگ ایسی پوسٹوں سے خوب اپنی تجوریاں بھرتے ہیں۔ لیکن آپ کی فقیر منش طبیعت اور سیر چشم مزاج دوسروں کے لیے تو کیا اپنوں کے لیے بلکہ اپنی ذات کے لیے بھی ناجائز فیصلے کرنے کا روادار نہ تھا اس لیے اس پوسٹ کو خیر باد کہہ دیا۔ باوجودیکہ خواجہ ناظم الدین، سردار عبدالرب نشتر اور خان عبدالقیوم خان کے ساتھ خصوصی تعلقات تھے اپنی ذات کے لیے کبھی مسلم لیگ یا مسلم لیگی حکومت سے کوئی مالی مفاد نہیں لیا۔

بعد میں آپ کی سیاسی وابستگی جمعیۃ العلمائے اسلام سے رہی آپ کے دور میں جمعیۃ العلمائے اسلام اپنے پورے جوبن پر تھی۔ جسے مولانا عبداللہ درخواستی صاحب جیسے امیر ملے ہوئے تھے، جو حافظ الحدیث ہونے کے علاوہ ایک صاحبِ دل شخصیت تھے۔ پورے ملک میں ان کا سلسلہ بیعت پھیلا ہوا تھا۔ ناظمِ عمومی حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی تھے۔ جن کا بغض فی اللہ، باطل شکن طبیعت اور فقرِ ابوذری پورے ملک میں مشہور و معروف تھا۔ تیسری شخصیت حضرت مولانا مفتی محمودؒ صاحب تھے، جو تقویٰ، تفقہ اور فہم و فراست کا مجموعہ تھے۔ اسی دور میں جمعیت نے الیکشن جیت کر صوبہ سرحد اور بلوچستان میں صوبائی حکومتیں بنائیں اور مرکزی حکومت میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ حضرت درخواستیؒ پشاور کے دورے پر ہوتے تو حضرت مولانا کے ہاں تشریف لا کر بیان فرمایا کرتے تھے۔ مجلس محرم ہونے کی وجہ سے ایک عجیب ربودگی اور وارفتگی کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ حضرت مولانا فرماتے تھے کہ یہ ایسے آدمی ہیں گویا ہر وقت عشقِ الٰہی کی بوتلیں چڑھائے ہوئے ہوں۔ حضرت مفتی محمود صاحب بھی تشریف لاتے تھے۔ جس وقت مفتی صاحب وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد تھے اور انھوں نے مولانا یوسف بنوری صاحب، مولانا شمس الحق افغانی صاحب اور دیگر علماء کو مشاورت کے لیے پشاور بلایا ہوا تھا، یہ وہ دن تھے جب ملک کے وزیر اعظم نے جمعیت کی حکومت کو ناکام بنانے کے لیے علاوہ اور حربوں کے صوبہ سرحد میں چینی کا بحران پیدا کیا ہوا تھا۔ چنانچہ مفتی صاحب نے حضرت مولانا کو اطلاع بھیجی کہ علماء سے ملنے کے لیے تشریف لاویں اور ساتھ چینی بھی لیتے آویں کیونکہ صوبے میں چینی کی قلت کی

وجہ سے ہمارے گھر میں بھی چینی نہیں ہے۔ یہ واقعہ حضرت مفتی صاحب کے حالات میں بھی لکھا ہوا ہے۔
حضرت درخواستی صاحب اور حضرت مفتی صاحب جب کبھی کسی جگہ جلسہ کرتے تھے تو جلسے ہی جتنی اہمیت وہاں کے صاحبِ دعا حضرات کے ساتھ رابطے کو بھی دیتے تھے۔ ان حضرات کے بعد یہ بات باقی نہ رہی۔

جب تقسیمِ ہند ہوگئی تو اکثر مسلمانوں نے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی۔ حضرت والا کا خاندان بھی پاکستان منتقل ہوا اور وسیع جائیداد دہلی، شملہ اور دارجلینگ میں رہ گئی۔ حضرت مولانا صاحب کو اپنی خدمات کی وجہ سے سب سے پہلا کسٹوڈین متروکہ املاک بنایا گیا۔ اگر آپ چاہتے تو متروکہ املاک میں سے بہت کچھ اپنے نام کر سکتے تھے۔ کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد پتہ چلا کہ مفاد پرست عناصر کی وجہ سے کام کرنا مشکل ہے اس لیے استعفیٰ دے دیا۔ خود فرماتے تھے کہ یہاں آ کر rehablitation department میں کلیم (Claim) داخل کروا کے ہندوستان کی جائیداد کے بدلے پاکستان میں ہندوؤں کی متروکہ جائیدادیں الاٹ ہو رہی تھیں۔ لیکن اس کے لیے قسم اٹھا کر حلفیہ بیان دینا ہوتا تھا۔ حلفیہ بیان میں آدمی جو (Claim) دعویٰ کرتا تھا اس کا آدھا دے دیا جاتا تھا۔ اس اصول کو جاننے کے باوجود حضرت نے فرمایا کہ بندہ سے دوگنی ملکیت پر قسم نہ ہو سکی۔ نتیجۃً ہندوستان کی جائیداد کے بدلے آدھی جائیداد یہاں ملی۔ اور یہ بھی ۱۹۶۸ء میں ہو سکا جبکہ آپ کے ایک رشتہ دار سیّد یوسف علی شاہ صاحب مغربی پاکستان صوبائی اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر ہوئے۔

سید سلیمان ندویؒ سے تعلق:

سیاسی سرگرمیوں کے دوران یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی صاحبؒ کی وفات ہوئی۔ ان کی وفات کے سانحے کا تذکرہ ڈان اخبار میں آیا۔ یہ اخبار اس وقت مسلم لیگ کا آرگن تھا۔ حالات میں لکھا تھا کہ حضرت تھانویؒ بہت بڑے مفسر، محدث اور فقیہ تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ چاروں سلسلوں کے شیخ طریقت بھی تھے، جن سے کثیر خلائق نے فیض پایا اور کئی حضرات ان سے صاحب خلافت ہوئے۔ ان کے خلفاء میں سید سلیمان ندویؒ کا نام بھی آیا۔ چونکہ مسلم لیگ کی تحریک کے سلسلے میں حضرت مولانا دونوں ناموں سے متعارف تھے اس لیے طبیعت ادھر متوجہ ہوئی۔ ایک دن فرمایا کہ سید سلمان ندویؒ کی کتاب سیرت النّبی پڑھ رہا تھا کہ اس میں صفات باری والا باب پڑھتے ہوئے اتنا متاثر ہوا کہ سید صاحب کو دل دے بیٹھا۔ بیعت کے سلاسل میں کہیں وابستگی نہیں تھی۔ چنانچہ سید سلیمان ندویؒ کو خط لکھا کہ سنا ہے کہ آپ

بیعت کرتے ہیں۔اس لیے مجھے بیعت فرمالیں۔سید صاحب نے بذریعہ خط بیعت فرمالیا اور بیعت کی ترتیب یوں لکھی کہ جب یہ خط پہنچے دو رکعت پڑھ کر بیعت کے الفاظ اپنی زبان سے ادا کرلیں۔چنانچہ اس حکم پر عمل کیا۔اور فرماتے تھے کہ ان الفاظ کو دھراتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا کہ کسی نے میرے سر پر ایک ٹوپی رکھ دی۔حضرت کو روئیداد لکھی تو انھوں نے فرمایا ''ہاں پہلے زمانے میں جب سلسلہ میں داخل کرتے تو ایک ٹوپی پہنایا کرتے تھے''۔

بیعت سے پہلے بھی حضرتؒ جو کام مسلم لیگ میں کر رہے تھے وہ خالصۃً امتِ مسلمہ کی خیر خواہی اور مسلمانوں کیلئے ایک آزاد وطن کے حصول کے جذبے سے کر رہے تھے۔بیعت کے بعد تو کلیۃً اس میدان میں کام آخرت کی نیت سے ہو گیا۔اور اپنی سرگرمیوں کے بارے میں حضرت سید سلمان ندویؒ سے رہنمائی لیتے رہے۔لیکن سیاسی رجحان آہستہ آہستہ دینی رجحان میں بدلنے لگا۔

حضرت سید سلیمان ندویؒ کی تربیت میں رہ کر آپ نے حضرت تھانویؒ کی ترتیب کے مطابق جم کر کام کر کے راہِ سلوک طے کی۔چنانچہ صفائیِ معاملات اس کے بعد فنا و بقا یعنی دفعِ رذائل (کبر حسد وغیرہ) اور حصولِ فضائل (توحید، توکل، تواضع وغیرہ) کے لیے تفصیلی مجاہدہ کیا جس کے لیے سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر کئی دن قیام فرماتے رہے اور خطوط کے ذریعے رہنمائی لیتے رہے۔یہ خطوط آپ کی کتاب شاہراہِ معرفت کی تیسری جلد میں آئے ہوئے ہیں۔اس کے ساتھ چشتیہ طریقے کے اذکار خصوصاً دوازدہ تسبیحات کی ضربوں کی ایسی مشق کیے ہوئے تھے کی ذکر گویا اعصاب میں رچا ہوا تھا۔

حضرت مولانا الیاسؒ کی تبلیغی تحریک سے تعلق:

حضرت سید سلیمان ندویؒ کی زندگی کے آخری سالوں میں انکی طرف تبلیغی جماعت والے حضرات کا رجوع ہوا۔حضرت جی مولانا محمد الیاسؒ اور انکے صاحبزادے حضرت مولانا یوسفؒ علماء اور مشائخ کا خاص اکرام فرمایا کرتے تھے۔نیز مشاہیر علماء واہل اللہ کی تبلیغی اجتماعات میں تشریف آوری کو اپنے لئے سعادت سمجھتے تھے۔چنانچہ سید صاحب کی شفقت بھی اس کام کی طرف متوجہ ہوئی۔سید صاحب اجتماعات میں تشریف لے جا کر تقاریر فرمانے لگے۔

شیخ کا اثر مرید پر ہوتا ہے۔حضرت مولاناؒ کی توجہ بھی تبلیغی جماعت کی طرف مبذول ہوئی۔حاجی ایوب صاحب تانبے کے برتنوں کے تاجر سے بندہ نے روایت سنی کہ ایک جماعت ہندوستان سے پشاور آئی

جس میں بڑے درجے کے علماء کرام اور غالباً حضرت مولانا الیاسؒ کے دو خلفاء بھی تھے۔ یہ جماعت مسجد گنج علی خان میں ٹھہری۔ جمعہ کا دن تھا۔ گنج علی خان مسجد جو گھنٹہ گھر پشاور شہر کے قریب ہے۔ اس زمانے میں خاکساروں کے قبضہ میں تھی۔ مسلم لیگی اس میں نماز نہیں پڑھتے تھے۔ جمعہ کی نماز میں دیر ہونے کے خطرہ سے حضرت مولاناؒ کو مجبوراً مسجد گنج علی خان میں جانا پڑا جو مسلم لیگ کے دفتر سے قریب ترین تھی۔ جمعہ کے بعد اعلان ہوا کہ باہر سے آئے ہوئے حضرات کچھ دین کی بات بیان کریں گے۔ چنانچہ حضرت مولانا بھی اس میں تشریف فرما ہوئے۔ بیان میں بیان کرنیوالے صاحب نے فرمایا کہ اس دور میں تبلیغ کا کام نہ کرنا ایک طرح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت کا عملی انکار کرنا ہے۔ اس بیان میں آپ نے ایک چلہ تبلیغی جماعت کے ساتھ لکھوایا۔ بقول حاجی ایوب یہ شہرت ہوئی کہ پشاور مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری نے چلہ دیا ہے۔ چنانچہ لے جانے کے لیے اس وقت کے پاکستان کے امیر اور حضرت مولانا الیاسؒ کے خاص ساتھی شفیع قریشی صاحب تشریف لائے۔ یہ چالیس دن شاہ عبدالعزیز صاحب دعا جو دہلویؒ کے ساتھ گذرے۔ شاہ صاحب جیّد عالم دین، صاحبِ نسبت بزرگ، اور شاہ یٰسین نگینویؒ کے خلیفہ تھے۔ میانوالی کی شدید گرمی میں کچھ دن گذارنے کے بعد کوئٹہ تشریف لے گئے۔ شاہ صاحب بہت زیادہ سخی اور فراخ دسترخوان والی شخصیت تھے۔ بقول حضرت مولانا صاحبؒ ۱۹۴۹ء میں شاہ صاحب نے جماعت کو خوب کھلایا پلایا۔ اور تقریباً ۱۲۰۰ اپنی جیب سے جماعت والوں پر خرچ کیے۔ یاد رہے کہ اس دور میں گندم تقریباً پانچ روپے من ہوتی ہوگی۔ شاہ صاحب جیسی جید علمی، ذاکر و شاغل اور فہم و فراست والی شخصیت کی صحبت نے تبلیغی تحریک سے گہری وابستگی پیدا کردی۔

پاکستان بننے کے بعد حضرت مولانا جیسی شخصیات کا سیاست میں زیادہ کام نہ رہا۔ کیونکہ اب اقتدار ہاتھ میں آنے کے بعد طالع آزما اور مفاد پرست عناصر مسلم لیگ میں آگے بڑھنے لگے۔ متروکہ جائیدادوں کی بندر بانٹ شروع ہوگئی اور سیاست میں جھوٹ اور فریب کا دور دورہ ہوگیا لہٰذا مولانا صاحب کا دل سیاست سے اچاٹ ہوگیا نیز سید صاحب کی تربیت اور ذکر و اذکار میں مشغولیت باطن کا رخ آہستہ آہستہ موڑتی گئی۔ سید صاحبؒ کو حکومت پاکستان نے آئینی اور قانونی رہنمائی کے لیے پاکستان بلالیا۔ سید صاحب نے دن رات ایک کر کے قراردادِ مقاصد کے بائیس نکات پر ہر مکتبہ فکر کے علماء کو متفق کیا اور قرارداد کو بطور Resolution قومی اسمبلی سے منظور بھی کروایا۔ لیکن سید صاحب کو محسوس ہونے لگا کہ ان کی رہنمائی سے

کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا بلکہ سیاسی حضرات ان کا وقت ہی ضائع کر رہے ہیں۔ حکومت نے کوئی معاشی کفالت بھی نہیں کی۔ اور ایسی شخصیت جو پونا کالج کی پروفیسری، ریاست بھوپال کی قاضی القضاۃ (Chief Justice) کی پوسٹ، اعظم گڑھ کے دارالمصنفین جیسے اہم ادارے کو چھوڑ کر محض دینی جذبے سے تشریف لائی تھی، سے فائدہ نہ لیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد اہل حکومت کوشش کرنے لگے کہ سید صاحب کو کوئی اچھی ملازمت دے کر یا اراضی دے دلا کر راضی کر دیا جائے۔ لیکن سید صاحب ان باتوں میں آنے والے نہیں تھے۔

ان ساری باتوں نے حضرت مولانا کی طبیعت کو سیاست سے متنفر کر دیا۔ فرماتے تھے جب سید صاحب کی مجلس میں حاضری ہوتی تو میں پوری سیاسی روداد سناتا۔ ایک دفعہ بطورِ افسوس عرض کیا کہ حضرت آپ کی مجلس میں ایسے غیر ضروری تذکرے بندہ سے ہو جاتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا فکر نہ کریں یہ ساری باتیں قے ہو جائیں گی۔ عربی اور فارسی کی مناسبت بچپن سے تھی، سید صاحب کی صحبت نے اس پر اضافہ کیا۔ چنانچہ سید صاحب ہی کے مشورے پر پشاور یونیورسٹی بننے پر شعبۂ عربی کے پہلے طالب علم کے طور پر ۱۹۵۱ء میں باقاعدہ داخلہ لیا۔ اس وقت صدر شعبہ ایک مصری پروفیسر تھے۔ ان کی رہنمائی میں نمایاں کامیابی کے ساتھ ایم۔ اے عربی کا امتحان پاس کیا۔ اور اپنی پہلی تصنیف جو ایم۔ اے عربی کے امتحان کیلئے مقالہ (deser-tation) کے طور پر پیش کی گئی لکھی۔ یہ انگریزی میں Early Indo Arab Relation کے نام سے ہے۔

اس کے کچھ عرصہ کے بعد ایم۔ اے فارسی پنجاب یونیورسٹی سے کر لیا۔ اس اثناء میں آپ کا تبلیغی انہماک بہت بڑھ گیا اور اس کے لیے آپ نے دن رات ایک کر دیا۔ دور دراز کے سفر فرمائے۔ پیدل روزانہ بیس بیس میل سفر کر کے صوبہ سرحد بالخصوص اور باقی ملک میں بالعموم کام کیا۔ یہاں تک کہ پوری زندگی رائے وِنڈ میں صرف کرنے کی نیت کر لی۔ اہل مشورہ حضرات نے مشورہ کرنے پر طے کیا کہ قابل اور نوعمر شخصیت ہیں۔ اگر کسی کالج میں پروفیسر ہو جائیں تو وہاں طلباء کو بہت زیادہ متاثر کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس مشورہ پر اسلامیہ کالج شعبہ عربی میں استاد (Lecturer) مقرر ہوئے۔ یہاں سے آپ نے اسلامیہ کالج اور پشاور یونیورسٹی میں خاص طور سے جبکہ پشاور شہر اور مضافاتِ پشاور میں عام طور سے، تبلیغی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں تبلیغی اکابرین کا اتنا اعتماد حاصل ہوا کہ پشاور مرکز کے امیر مقرر ہوئے۔ آپ کی امارت تقریباً پچیس سال رہی۔ اس وقت کے کالجوں میں دینی لوگ اور خصوصاً اسلامیات والے حضرات ایک

Apologetic (معذرت خواہانہ) زندگی گزار رہے تھے۔ جن کے نزدیک اس ماحول کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال کر یہاں کے لوگوں کی طرح لباس و وضع قطع اختیار کر کے، ان کی لایعنی گپ شپ میں شامل ہونا بڑا کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔ اس طبقے کے بعض افراد کی طرف سے سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان لوگوں نے انتظامیہ کے کان بھرے کہ یہ شخص طلباء کا وقت ضائع کر رہا ہے۔ چنانچہ حضرت نے فرمایا کہ میری ان سرگرمیوں کو روکنے کے لیے ایک پرنسپل صاحب نے اتنی کلاسیں دیں کہ پورا دن مصروف کر دیا۔ بلکہ ایک موقعہ پر بیک وقت ایک کلاس عربی کی تھی اور ایک فارسی کی۔ فرمایا کہ میں پرنسپل صاحب سے ملا۔ اور عرض کیا کہ ایک آدمی ہوتے ہوئے میں بیک وقت دو کلاسیں کیسے لوں۔ تو وہ صاحب جو بہت زیادہ سائنسی علوم کے مطالعہ اور تحقیق سرگرمیوں سے ذہنی توازن پوری طرح بحال نہیں رکھ سکے تھے، فرمانے لگے I Don't Know , You Will Have to Manage it. (مجھے کچھ خبر نہیں آپ کو نباہنا ہوگا)۔ اس زمانہ میں اسلامیہ کالج کی مسجد کے صحن کے درمیان میں ایک حوض (تالاب) ہوتا تھا۔ بعض حضرات نے طلباء سے کہا کہ اگر یہ یہاں تبلیغ کے لیے آئے تو اسے تالاب میں پھینکا جائے۔ فرماتے تھے کہ اس مخالفت کی وجہ سے طلباء کو یونیورسٹی سے باہر ایگریکلچر ٹریننگ انسٹیٹیوٹ (ATI) کی مسجد میں جمع کرتے اور وہاں بیان کیا جاتا۔ یا میرے (یعنی حضرت) کے گھر میں جمع کیا جاتا اور پردے گرا کر بیان کیا جاتا۔ ان دِنوں حضرت جرمنی کا تبلیغی سفر کر کے واپس تشریف لائے تھے۔ پرنسپل سے ہاسٹلوں میں جا کر طلباء کو جرمنی کے حالات سنانے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے اجازت دے دی۔ اس بہانے طلباء سے رابطہ ہوتا گیا اور طلباء مناسبت محسوس کرنے لگے۔ چنانچہ طلباء حضرت کے گھر اور مسجد کے بیانوں میں آنے لگے۔

ایک دن ایک اسرار نامی طالب علم (حالیہ پروفیسر آرکیالوجی) نے جوش میں آ کر کہا کہ حضرت مولانا آپ یہاں اسلامیہ کالج کی مسجد میں بیان فرمائیں ہم دیکھتے ہیں کوئی مائی کا لال آپ کو روک لے۔ چنانچہ اسلامیہ کالج کی مسجد میں بیان شروع ہوا۔ فرماتے تھے کہ جب سے اسلامیہ کالج بنا ہے اس کی تاریخ میں پہلی مرتبہ حضرت نے کچھ طلباء کو ساتھ لے کر اعتکاف فرمایا۔ اور یوں اعتکاف کی متروکہ سنتِ مطہرہ اس ماحول میں زندہ ہوئی۔ ایک بار بلال مسجد پشاور یونیورسٹی اور ایک بار رائیونڈ کی مسجد میں بھی اعتکاف فرمایا۔ پشاور شہر، مضافاتِ پشاور اور یونیورسٹی میں تبلیغ کا مقامی کام کرنے کے علاوہ آپ نے پورے ملک میں لمبے لمبے سفر کیے۔ فرماتے تھے کہ بعض اوقات بیس بیس میل پیدل چلا ہوں۔ جب ٹانگوں کی معذوری شروع ہوگئی تو بعض

اوقات گدھے اور ٹٹو کی پیٹھ پر بیٹھ کر بھی دور دراز دیہات میں تبلیغی جماعت کے ساتھ پہنچتا رہا۔معذوری سے پہلے فلسطین، ترکی، یوگوسلاویہ، آسٹریا اور جرمنی کا بیرونی سفر بھی کیا۔آپ کا یہ سفر ۱۹۵۶ء میں ہوا، سفر میں حضرت مولانا ظاہر شاہ صاحبؒ میاں محمد انور صاحب (فیصل آباد) اور ضیاء الاسلام صاحب (مشرقی پاکستان) ہمراہ تھے۔

اسلامیہ کالج اور پشاور یونیورسٹی کے طلباء نے خوب اثر لیا۔چنانچہ ۶۶۔۱۹۶۷ء میں جبکہ خواجہ معروف مسجد (تبلیغی مرکز) میں شبِ جمعہ کا کل مجمع تقریباً چھ سو ہوتا تھا اس میں دوسو کی تعداد اسلامیہ کالج اور پشاور یونیورسٹی کے طلباء اور اساتذہ کی ہوتی تھی۔باقی چار سو افراد پشاور شہر اور مضافات کے ہوتے تھے۔فرماتے تھے کہ اسلامیہ کالج سے پہلی جماعت جب وصول ہوئی تو اس کو رائیونڈ رخصت کرنے کے لیے پنڈی تک ان کے ساتھ گیا۔اس جماعت میں ایک طالبعلم احمد گل وزیر بھی گیا، جس کے اخراجات بھی بقول حاجی احمد خان، حضرت مولانا ہی نے برداشت کیے۔احمد گل کو تبلیغ کا انہماک نصیب ہوا۔موصوف نے ایک دفعہ خود بندہ سے کہا کہ حضرت مولاناؒ کی ٹانگیں چلنے سے کمزور ہوگئیں تو میں نے سائیکل چلانا سیکھا تا کہ انھیں بیانات کے لیے سائیکل کے کیریئر پر بٹھا کر لے جاسکوں۔احمد گل کو آپ نے اپنے ساتھ طالبعلمی کے زمانے میں ہی خود اخراجات دے کر حج کروایا۔احمد گل صاحب نے زراعت میں B.Sc کی لیکن اتفاقاً ڈویژن تھرڈ آگئی۔تبلیغ والے حضرات چاہتے تھے کہ ان کو زرعی کالج میں ہی ملازمت مل جائے لیکن یونیورسٹی کے قواعد وضوابط کے مطابق تھرڈ ڈویژن کو ملازمت نہیں مل سکتی تھی۔اس وقت زرعی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر شمس الاسلام صاحب تھے جو حضرت مولاناؒ کے معتقد تھے۔حضرت نے ڈاکٹر صاحب سے فرمایا کہ اس لڑکے کو ضرور ملازمت میں لینا ہے۔اس پر ڈاکٹر شمس الاسلام نے ایک تفصیلی نوٹ لکھا اور اس میں یہ نکتہ لکھا کہ ڈیمانسٹریٹر کی پوسٹ پر اگر فرسٹ ڈویژن B.Sc آئے تو وہ ٹھہرتا نہیں ہے جس کے نتیجے میں ہمارے پاس ہر وقت نئے آدمی آتے رہتے ہیں چنانچہ ان پوسٹوں پر ٹرینڈ آدمیوں کی ہمارے پاس کمی ہوتی ہے۔اس لیے اگر تھرڈ ڈویژن کو لے لیا جائے تو وہ کہیں جائے گا نہیں۔ہمارے پاس رہ کر ٹرینڈ ڈیمانسٹریٹر بنے گا۔اس نکتہ پر یونیورسٹی نے احمد گل صاحب کو ملازمت دے دی۔ملازمت میں آنے کے بعد حاجی احمد گل صاحب پشاور مرکز کی شوریٰ کے رکن ہوئے۔

ایک طالبعلم شاہد کو چلہ کے لیے وصول کیا۔ان کے والد حکیم حامد صاحب سنجیدہ آدمی تھے جو اپنے بیٹے کو اکیلے دور کے سفر پر نہیں چھوڑتے تھے۔حضرت مولانا نے خط لکھ کر ان کے لیے اجازت حاصل کی۔شاہد

صاحب بھی ملازمت میں آنے کے بعد تبلیغی مرکز میں شوریٰ کے رکن ہوئے۔

ایک نوجوان جن کا نام شماس گل تھا اسی دور میں تبلیغی تحریک سے وابستہ ہوئے۔ یہ دینی کتابیں بھی پڑھے ہوئے تھے۔ موصوف خوب تبلیغی تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ بعد میں انھوں نے اپنا نام تبدیل کر کے شمس الحق رکھا۔ اندرون ملک اور بیرون ملک کے کئی تبلیغی سفر کیے۔ یہ بھی مرکز کی شوریٰ کے رکن مقرر ہوئے۔ اس طرح مرکز کی شوریٰ کے آدھے افراد گویا آپ کے ذریعے تبلیغ میں لگے۔

سالانہ چلے کے دوران بعض اوقات رائے ونڈ سے ایسے علاقوں میں تشکیلیں ہوئیں جہاں تبلیغ والوں کو بریلوی حضرات کے ہاتھوں سخت رکاوٹ اور مشکلات کا سامنا ہوتا تھا ایسے علاقوں میں جب حضرت مولانا شانِ رسالت بیان فرماتے تو مخالفین علماء نرم پڑ جاتے اور انکے عوام متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ ایک بار بندہ کی جماعت کی وجہ سے باٹا پور لاہور کے علاقے سے دو بریلوی علماء رائیونڈ آئے۔ انکی آمد پر رائیونڈ میں صبح کا بیان حضرت مولانا کا طے ہوا۔ بیان میں حضرت نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر بیان کیا۔ بیان ایسا ہوا کہ بریلوی علماء نے اپنے حلقوں میں کم ہی اس طرح کا بیان سنا ہوگا۔

حضرت سید صاحبؒ کا جب انتقال ہو گیا تو حضرت مولاناؒ کو تجدیدِ بیعت اور تکمیلِ سلوک کی فکر دوبارہ دامن گیر ہوئی۔ اس سلسلے میں دعائیں اور استخارے شروع کیے، خواب میں معلوم ہوا کہ پشاور سے چالیس میل کے فاصلے پر مقصود حاصل ہوگا۔ بیدار ہونے پر آپ نے سوچا تو پشاور یونیورسٹی سے تقریباً چالیس میل دور اکوڑہ خٹک میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کے خلیفہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن کاملپوری صاحب مدرسہ الجامعہ اسلامیہ میں مدرس تھے، ان کا خیال آیا۔ ان کی خدمت میں حاضری دی لیکن بیعت کی نوبت نہ آئی۔ کچھ عرصہ بعد شاہ عبدالعزیز دعاجو دہلویؒ تبلیغی سلسلہ میں کوہاٹ تشریف لائے۔ حضرت مولانا کا ۱۹۴۹ء میں حضرت دعاجوؒ کے ساتھ بلوچستان میں چلہ کا سفر اکٹھا ہوا تھا اس لیے ان سے پورا تعارف تھا۔ کوہاٹ حاضری ہوئی تو حضرت مولانا کو اپنا خواب یاد آیا اور کوہاٹ پشاور سے چالیس میل ہے۔ چنانچہ بیعت کی درخواست کی جس کے جواب میں شاہ صاحب نے فوراً بیعت فرمالیا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب دعاجوؒ دہلی سے تعلق رکھتے تھے۔ شاہ یٰسین نگینویؒ کے خلیفہ تھے۔ نگینویؒ رشید احمد گنگوہیؒ کے واسطے سے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ سے منسلک تھے۔

شاہ صاحبؒ نے ہندوستان کے زمانے سے ہی ساری زندگی مولانا الیاسؒ کی تبلیغی تحریک کے لیے

وقف کردی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد پاکستان منتقل ہوئے اور تین جھونپڑے ڈال کر رائے ونڈ کا مرکز شروع کیا۔ کچھ عرصہ بعد ٹنڈو آدم منتقل ہوئے۔ وہاں ایک دوسرا مدرسہ اور تبلیغی مرکز بنایا، وہیں وفات اور تدفین ہوئی ۔شاہ صاحبؒ کی بیعت میں آپ ایسے وقت آئے جبکہ تربیت حضرت سید سلیمان ندویؒ سے مکمل ہو چکی تھی لیکن سید صاحبؒ کی وفات کی وجہ سے خلافت نہیں ہو سکی تھی۔ شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر چہ مجھ سے بیعت ہوئے ہو لیکن ہو سلیمانی ہی۔ شاہ صاحب سے ۱۹۶۲ء میں خلافت ملی۔ خلافت کا قصہ خود حضرتؒ کی زبانی یوں سنا۔ فرماتے تھے کہ ٹنڈو آدم میں اجتماع تھا جس کے لیے رائے ونڈ کے اکابرین، شفیع قریشی صاحبؒ و دیگر تبلیغی علماء جمع تھے۔ ایک دن اور ایک رات بیانات ہوئے لیکن لوگوں نے تبلیغی چلے کم لکھوائے۔ آخری شب کا بیان مجھ (حضرت مولاناؒ) سے کرایا۔ جس پر بہت زیادہ نام لکھوائے گئے۔ شاہ صاحب بہت خوش ہوئے۔ باقی اکابرین کو رخصت فرمایا لیکن مجھے (حضرت مولانا) کو روک لیا اور دستار خلافت و دیگر تبرکات عطا فرمائے۔ اس دور میں تبلیغی تحریک میں کچھ لوگ جن کی سلوک و طریقت سے زیادہ مناسبت نہیں تھی اور تبلیغی کام کرنے والوں کے لیے راہِ طریقت کو نقصان دہ سمجھتے تھے معترض ہوئے کہ ایک نوعمر کو خلافت دے دی۔ اگر چہ عمر اس وقت سینتیس سال تھی لیکن تقریباً پچاس سال تک اکثر بال داڑھی کے کالے تھے۔ اور نوعمر نظر آتے تھے۔ خلافت ملنے کے بعد تبلیغی کام اور سلوک و طریقت دونوں کی گاڑی کو کھینچنے کا دور شروع ہوا اور ذاتی اعمال یعنی تہجد و نوافل ذکر و تلاوت میں انہماک حد سے بڑھ گیا۔ اس کثرت سے جہری ذکر کیا ہوا تھا کہ بے اختیار زبان مبارک سے اللہ کا نعرہ اس زور سے نکلتا تھا کہ مجمع پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا اور حاضرین مجلس اپنے قلب اور اعصاب میں ایک کھلبلی سی محسوس کرتے تھے۔ بیان، ذکر، اور نعت خوانی میں یہ نعرہ زیادہ بلند ہوتا۔ دورانِ نعت خوانی اس زور سے نعرہ اللہ یا اِلا اللہ نکلتا کہ یوں محسوس ہوتا تھا گویا لنٹر والی چھت اُڑ جائے گی۔

ایک دفعہ کچھ نوعمر طلباء بیٹھے ہوئے تھے، بندہ بھی حاضر خدمت تھا۔ معظم (برادر مسرت حسین شاہ صاحب) نے عرض کیا حضرت یہ ذکر قلبی کیا ہوتا ہے؟ حضرت نے مزاحاً فرمایا تمہیں سناؤں۔ سب نے کہا سنائیں۔ سب قریب ہوئے۔ حضرت نے زبان مبارک بند فرمائی اور اللہ اللہ کہنا شروع فرمایا۔ جہاں لطیفۂ قلب ہوتا ہے وہاں سے گھڑی کی طرح ٹک ٹک کی آواز آنا شروع ہوگئی، جو بندہ نے خود سنی۔ پھر فرمایا کہ ایک دفعہ شاہ صاحب نے بھی اسی طرح ہمیں سنایا تھا۔ پھر فرمایا کہ یہ ذکر قلبی نہیں ہے۔ یہ محض کثرتِ ذکر اور مشق کا ایک اثر ہے جو بدن پر مرتب ہوتا ہے۔ ذکرِ قلبی یہ ہے کہ ہر وقت اُٹھتے بیٹھتے، بولتے تولتے، سنتے سناتے، لکھتے

لکھاتے غرض ہر حال میں دھیان چھا جانا کہ میرا اللہ مجھے دیکھ رہا ہے اور یہ دھیان گناہوں سے روک لے اور نیکی پر جما دے۔

سید صاحب اور شاہ صاحب کے علاوہ پہلے حج کے دوران نقشبندیہ سلسلے کے فیض کی خاطر مدینہ منوّرہ میں حضرت مولانا عبدالغفورؒ مہاجر مدنی کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ آپ کے خلیفہ حاجی غضنفر صاحب سناتے ہیں کہ حضرت مولانا عبدالغفورؒ صاحب جب اپنے کسی مرید کے قلب کی طرف انگلی سے اشارہ فرماتے تو مرید کو یوں محسوس ہوتا کہ گویا دل اللہ اللہ کر رہا ہے۔ جب وہ حضرت مولاناؒ کے قلب کی طرف اشارہ کرتے تو حضرت کی زبان سے زور سے بے اختیار اللہ کا نعرہ بلند ہوتا۔

آپ کے مواعظ اور آپکی مجالس:

تبلیغی اجتماعات اور چلوں کیلئے دور دراز کے سفر اور یونیورسٹی کے ہاسٹلوں میں ہفتہ وار دو تین تقریریں، نیز پشاور شہر اور دیہات میں آمد و رفت بلا ناغہ ہوتی رہی۔

سلوک و طریقت کے سلسلہ میں روزانہ عصر تا عشاء مجلس گھر پر ہوتی تھی۔ اس مجلس کا حال سننے کا نہیں دیکھنے کا ہوتا تھا۔ جس جوش و خروش، سوز و گداز، رِقت قلبی، گہرے علوم و معارف کا مظاہرہ اس مجلس میں ہوتا اس طرح کم ہی دوسری جگہوں پر ہوتا تھا۔ دیوبند والوں کے علوم، حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ کے معارف اور چشتی سوز و گداز کا ایک بہتا دریا ہوتا تھا۔ مضامین کی ایسی آمد ہوتی تھی کہ محققین بغیر تسلیم کیے نہیں رہ سکتے تھے کہ یہ عقلی و نقلی علوم نہیں ہیں بلکہ وہبی اور قلبی علوم ہیں۔

گفتہء اُو گفتہء اللہ بود　　　گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

ترجمہ:۔ اس کا بول درحقیقت اللہ کا بول ہوتا ہے اگرچہ وہ بندہ کے حلق سے ادا ہو رہا ہوتا ہے۔

اُڑائے کچھ ورق لالہ نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہے داستاں میری

حاضرینِ مجلس کسی طرف غور نہیں کر سکتے تھے بلکہ ہمہ تن گوش حضرت میں گم ہو جاتے تھے۔

میں میں نہ رہوں تُو تُو نہ رہے　　　اِک دوسرے میں کھو جائیں

کا منظر ہوتا تھا۔ بطور ڈاکٹر بندہ کو محسوس ہوتا تھا کہ یہ شخص بیان نہیں کر رہا بلکہ اپنے آپ کو جلا رہا ہے اور پگھلا رہا ہے۔ اور اک شعلہ جوالہ سے مجلس کو روشن کر رہا ہے۔ اور دل کے ٹکڑے بکھیر رہا ہے۔

من قاش فروش دلِ صدپارہء ہستیم

ترجمہ: میں سوحصوں میں تقسیم شدہ دل کے ٹکڑے فروخت کرر ہا ہوں۔

دورانِ بیانِ اللہ تعالیٰ کا نام یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آنے پر آپ کی زبان سے جذبات میں ڈوبا ہوا نعرہ بلند ہوتا تھا اسے حاظرینِ مجلس اپنے بدن اور اعصاب پر برقی رو (electric current) کی شکل میں محسوس کرتے تھے۔اس کیفیت کو بارہا بندہ نے بھی محسوس کیا۔ایک مرتبہ مولانا رفیع عثمانی صاحب و مولانا عبدالرحمٰن اشرفی صاحب حاضر مجلس تھے حضرت نے اُن پر توجہ فرمائی بندہ نے محسوس کیا کہ ایک تپش حضرت سے اٹھی جو ہر دو حضرات پر گری ان سے بندہ پر آئی اور یوں محسوس ہوا کہ کمرہ کی دیواروں تک تپش پہنچ رہی ہے اور اس سے دل میں ایک رقت وسوز و گداز کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔اس پر مولانا عبدالرّحمان صاحب نے شعر پڑھا

ساقی تیرا مستی سے کیا حال ہوا ہوگا

جب تو نے یہ مے ظالم شیشے میں بھری ہوگی

اس شعر پر بندہ کو احساس ہوا کہ عبدالرّحمان صاحب نے بھی اس کیفیت کو محسوس کیا۔

فقیہ شہر نے تہمت لگائی ساغر پر یہ شخص درد کی دولت کو عام کرتا ہے

اسی طرح ایک دوسرے موقع پر ایک مجلس کے بارے میں بندہ کے بھتیجے مشتاق احمد نے بتایا کہ دورانِ دعا ایک تپش حضرت سے اٹھ کر پوری مجلس پر گری اور دیواروں تک پھیلتی ہوئی اس نے محسوس کی۔

دورانِ دعا برخوردار سلیمان جو اس وقت بچہ تھا نے زور سے دھماکے دار آواز کے ساتھ دروازہ کھولا۔دعا کے بعد کسی نے حضرت مولانا کے ایک خلیفہ سے شکایتاً کہا کہ سلیمان نے شور مچایا۔انہوں نے جواباً فرمایا کہ ہمیں تو پتہ ہی نہیں چلا۔دراصل دورانِ دعا ایک انہماک کی کیفیت تھی۔

ڈاکٹر حضرات اس بات کو جان سکتے ہیں کہ اس قدر ذوق وشوق، جوش وخروش اور سوز وگداز سے جو آدمی بات کرے تو اُس کے کتنے زیادہ بدنی عروق (harmones) کا اخراج ہوتا ہے۔اور واقعی ایسا آدمی اپنے آپ کو جلا رہا ہوتا ہے۔

کسی لمحے تو مجلس کا یہ رنگ ہوتا تھا کہ آدمی مارے جوش کے بلا اختیار ایک نعرہ لگا کر چھلانگ لگانے کے قریب ہو جاتا تھا۔کبھی مارے سوز کے آنکھیں پرُنم ہو جاتی تھیں۔ایسا نفیس، حسین اور معیاری مزاج بھی

بیان میں شامل فرما دیتے تھے کہ مجلس تبسم ریز اور زعفران زار ہو جاتی تھی۔

شروع دور میں مضامین توحید زیادہ ہوتے تھے۔تھوڑی دیر مجلس میں شریک ہونے کے بعد اللہ کے غیر کی اہمیت اور خوف دل سے ایسے نکلتا تھا کہ غیر اللہ پر کاہ (گھاس کا تنکا) بھی نظر نہیں آتا تھا۔اور باطن اللہ تعالیٰ کی طرف ایک کشش اور ایک وابستگی محسوس کرتا تھا۔توحید کے صلہ میں توکل اور اخلاص کی ایک موج آتے محسوس ہوتی تھی۔

توحید کے سلسلے میں علاوہ اور اشعار کے کبھی کبھی مولانا محمد علی جوہر کے یہ اشعار بھی پڑھتے

کیا ڈر ہے اگر ساری خدائی ہو مخالف　　　کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے　　　یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

آخری دور میں مجلس میں حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرے زیادہ ہونے لگے تھے۔اس کیفیت کے ساتھ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی لیتے اور تذکرہ فرماتے تھے کہ مجلس میں سوز وگداز وعشق ومستی کی لہریں اور لپٹیں پھیلتی اور بکھرتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔بالِ جبریل کے نعتیہ اشعار

لوح بھی تو ،قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب

گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

عالم آب وخاک میں تیرے ظہور سے فروغ

ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب

شوکتِ سنجر وسلیم، تیرے جلال کی نمود

فقرِ جنید وبایزید، تیرا جمالِ بےنقاب

پڑھتے تھے تو سماں بندھ جاتا تھا۔ایک فارسی نعتیہ شعر

آفاقہا گردیدہ ام، مہر بتاں ورزیدہ ام

بسیار خوباں دیدہ ام،لیکن تو چیزِ دیگری

ترجمہ: دنیا جہان میں پھرا، بتوں کی محبت کو آزمایا، بہت حسینوں کو دیکھا، لیکن تو تو کوئی اور ہی چیز ہے۔

بس یوں محسوس ہوتا

اک ہوک اُٹھے میرے سینے سے

آئے پیغام مدینے سے سرکار کرم کی بھیک ملے

میں سائل ہوں تو داتا ہے

(انما انا القاسم واللہ یعطی)

مجلس میں جب کبھی نعت خوانی ہوتی تو پوری مجلس پر ایک بے خودی اور وارفتگی طاری ہوجاتی کہ یادِ مدینہ اور حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد میں ہوش وحواس گم ہوتے محسوس ہوتے اور چشتیہ حضرات کا وجد وہو حق قابل دید ہوتا تھا۔ ایک ہی مجلس تعلق مع اللہ اور محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے کافی ہوتی تھی۔ موت وآخرت کو اس ذوق وشوق سے بیان فرماتے تھے کہ بے ساختہ محسوس ہوتا تھا

مزہ جو مرنے کا عاشق کبھو بیاں کرتے

مسیح وخضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

اکثر موت کے سلسلہ میں اپنے شیخ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دعاجوؒ کے حوالے سے یہ شعر پڑھتے۔

بلا سے نزع میں تکلیف کیا ہے؟ سکونِ خاطر بھی کم نہیں ہے

کسی سے ملنے کی ہیں امیدیں، کسی سے چھٹنے کا غم نہیں ہے

فرماتے تھے کہ قبر میں جو پہلے سوال وجواب کے وقت جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار ہوگا ،اتنی بڑی دولت ہے کہ اس پر جان قربان ہوجانا سستا سودا ہے۔ کبھی ایک آہ کے ساتھ یہ شعر پڑھتے

خرم آں روز کہ از منزلِ ویراں بروم

راحتِ جاں طلبم و سوئے جاناں بروم

ترجمہ: وہ کیا خوشی کا دن ہوگا جب ویران منزل (دنیا) سے جائیں گے۔ جان کی راحت پائیں گے اور جاناں کی طرف چلے جائیں گے۔

مجالس کو دیکھ کر بے ساختہ زبان پر آتا تھا

نہیں فقر وسلطنت میں کوئی امتیاز ایسا

یہ سپاہ کی تیغ بازی، وہ نگہ کی تیغ بازی

آپ کے علوم قدیم وجدید کا سنگم تھے۔ سلف صالحین اور خیر القرون سے سرِ مو تجاوز نہیں فرماتے

تھے۔لیکن جدید سائنسی علوم سے اپنے آپ کو پورا باخبر رکھا ہوا تھا اور جدید عمرانی علوم(social scien ces-) پر بھی دسترس حاصل تھی۔ چنانچہ آپ کا بیان اور تحریر ان ساری باتوں کو بطریق احسن اپنے اندر سموئے ہوئے ہوتے تھے۔جدید وقدیم تاریخ سے پورے باخبر تھے اور گذشتہ پچاس سال کے عالمی سیاسی اتار چڑھاؤ آپ کی نگاہ کے گویا سامنے تھے۔جنگ عظیم دوم کے واقعات تو تاریخ وار از بر تھے۔یہ تجربات جب آپ کی تحریر وتقریر میں آتے تھے تو اس میں حضرت مولانا حسین احمدؒ مدنی کی صلابتِ رائے اور مولانا محمد علی جوہرؒ کا جوش وخروش جھلکتا محسوس ہوتا تھا۔

تبلیغی سلسلے میں آپ کے بیانات رائے ونڈ کے اجتماع ،مختلف اجتماعات اور پشاور کے شب جمعہ میں ہوتے تھے۔تھوڑی دیر میں آدمی محسوس کرنے لگتا تھا کہ آپ پورے مجمع کو ہوا میں اڑا رہے ہیں اور عالم ملکوت کی سیر کروا رہے ہیں ۔ایک دفعہ خوازہ خیلہ علاقہ سوات میں اجتماع ہو رہا تھا۔حضرت کے بارے میں پشتو میں بیان کرنے کا طے ہوا۔باوجود مومند پٹھان ہونے کے، ہندوستان میں قیام کی وجہ سے پشتو اچھی طرح نہیں بول سکتے تھے۔خود فرماتے تھے''جن بزرگوں کے پاس بیٹھا اٹھا ہوں ان کا فیض اردو میں تھا وہ اردو میں ہی وارد ہوتا ہے''۔اس بناء پر آپ پشتو میں بتکلف بیان فرما رہے تھے۔بندہ اجتماع میں شامل تھا۔بندہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا گویا ایک ٹھنڈی اور نرم لہر ہے جو نرم سفید بادل کی طرح اُن کی طرف سے آرہی ہے اور بندہ پر گر رہی ہے۔دل میں خیال ہوا کہ چونکہ ہمارا ان سے تعلق ہے اس لیے یہ محسوس ہو رہا ہے۔بندہ بیان کے خاتمے پر باہر نکلا تو دو آدمی بڑی عمر کے پشتو میں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ان میں سے ایک صاحب حاجی حاجت خان شنواری دوسرے آدمی سے پشتو میں کہہ رہا تھا کہ اس آدمی کے بیان میں تو عجیب بات تھی اس سے کوئی چیز اٹھ اٹھ کر ہم پر گر رہی تھی۔پھر وہ کہنے لگا درا صل یہ ذاکر آدمی ہے یہ کثرت ذکر کے اثرات تھے جو اس کے بیان میں تھے۔

ایک دفعہ آپ کے ایک مرید مولوی عبدالغفور صاحب صدہ (کرم ایجنسی) والوں سے ملاقات ہوئی فرمانے لگے''میں پشاور میں دینی مدرسے کا طالبعلم تھا۔اتفاقاً شبِ جمعہ پر مسجد خواجہ معروف چلا گیا۔جو تبلیغی جماعت کا مرکز تھا۔حضرت مولانا کا بیان سنا۔ایسی کشش ہوئی کہ ہمیشہ شبِ جمعہ میں آکر بیان سننے کا معمول بنا لیا جس کی وجہ سے دورۂ حدیث کرنے کے بعد تبلیغی جماعت کے ساتھ علماء کا نصاب پورا کر کے ہمیشہ کے لیے اس مبارک کام کے ساتھ وابستگی پیدا ہوگئی''۔شبِ جمعہ کے بیانات کی وجہ سے کئی لوگوں کی زندگیاں

بدلیں اور ہمیشہ کے لیے تبلیغی تحریک کے ساتھ وابستہ ہوگئے۔

تبلیغی بیانات کے علاوہ مختلف موقعوں اور مجمعوں میں آپ کے بیانات ہوتے رہے۔ان بیانات پر کٹر تبلیغی حضرات اعتراض بھی کرتے رہتے تھے اور کہتے تھے کہ تبلیغی آدمی کا ایسے مواقع پر جاکر بولنا اپنی قوت کو ضائع کرنا ہے۔لیکن ان بیانات نے بھی انمٹ اثرات چھوڑے۔پروفیسر سحر گل صاحب جو محکمہ تعلیم میں فارسی کے پروفیسر ہیں نے بتایا کہ اکاؤنٹنٹ جنرل آفس والوں نے اپنے ادارے میں سیرت کا جلسہ منعقد کیا جس میں مولانا عبدالقدّوس صاحب فاضل دیوبند وصدر شعبۂ اسلامیات پشاور یونیورسٹی، مولانا سعید الدین شیر کوٹی فاضل دیوبند و مقرر ریڈیو پاکستان پشاور اور حضرت مولانا مدعو تھے۔تیسرے نمبر پر حضرت مولانا نے تقریر فرمائی جو بالکل منفرد تھی اور جذبہ عمل ابھار رہی تھی۔پروفیسر صاحب نے پوچھا کہ ان کی تقریر پھر کہاں سننا میسر ہوگی ۔پتہ چلا کہ تبلیغی مرکز مسجد خواجہ معروف میں شبِ جمعہ کے اجتماع مین ان کی تقریر ہوتی ہے۔پروفیسر صاحب نے مولانا صاحب کی تقریر سننے کے لیے آمدورفت شروع کردی جس کے نتیجے میں زندگی مکمل بدل گئی اور ہمیشہ کے لیے تبلیغ کے مبارک کام سے وابستگی ہوگئی۔

حکیم سعید صاحب کا ادارہ ہمدرد وقف ماہوار دینی تقاریر کا بندوبست کرتا تھا یہ تقاریر فائیو سٹار ہوٹلوں میں ہوتی تھیں جن میں بڑے اونچے طبقے کے لوگ مدعو ہوتے تھے۔اس طبقے کو عام دینی مواقع جو مساجد یا دینی اجتماعات میں مل سکتے ہیں میسر نہیں ہوتے تھے۔ان تقاریر کے ذریعے اس طبقے تک دین کی بات پہنچی۔اس طبقے کے لوگ حضرت سے بیعت ہوئے اور ان کی زندگیاں بدلیں۔

پاکستان رورل اکیڈمی پشاور میں سارے ملک کے پی۔سی۔ایس افسران کی ٹریننگ ہوتی ہے۔ اکیڈمی نے ان حضرات کے سامنے مختلف دینی موضوعات پر حضرت کے تفصیلی بیانات کروائے۔جن سے اس طبقے کی دینی ذہن سازی میں نمایاں کردار ادا ہوا۔

حکومت صوبہ سرحد ایک سیرت کا پروگرام منعقد کرتی تھی جس میں گورنر، وزیر اعلیٰ اور وزیر مذہبی امور ہوتے تھے۔ان میں کئی مواقع پر حضرت ہی کی تقاریر ہوئیں۔

ایک دفعہ آزاد کشمیر کی حکومت کی دعوت پر مظفر آباد میں ایک نمائندہ سرکاری مجمعے میں مولانا عبد القدوس صاحب اور حضرت مولانا کے بیانات ہوئے۔مجمعے میں سے ایک وکیل نے بہت کرخت اور دل آزار سوال کر ڈالا کہ اسلام میں وحشیانہ اور بہیمانہ سزائیں کیوں رکھی گئی ہیں؟ مولانا عبدالقدس صاحب اگرچہ

فیڈرل شریعت کورٹ کے جج بھی رہے لیکن انھوں نے جواب دینے کے لیے حضرت مولانا ہی کو کہا۔ حضرت نے اس موضوع پر فی البدیہہ تقریر فرمائی۔ تقریر کے خاتمے پر مولانا عبدالقدوس صاحب نے فرمایا ''مولانا آپ کا جواب صرف علمی نہیں تھا بلکہ الہامی تھا۔'' ندوۃ العلماء لکھنو میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کو یہ تقریر بہت پسند آئی۔ انھوں نے اس کا عربی ترجمہ کروا کے پوری دنیائے اسلام میں پھلایا۔ چنانچہ باہر ممالک سے حضرت کو مبارکباد کے خطوط آتے رہے۔

ایک مرتبہ اہلِ تشیع نے پشاور یونیورسٹی کے کانوکیشن ہال میں یومِ شہیدِ کربلا منانے کی اجازت حاصل کر لی ان کو یہ اجازت اس صورت میں ملی کہ اس میں ایک تقریر حضرت مولانا کی ہو۔ ان کے ذاکرنے بہت قافیہ بندی کی اور اشعار، لے اور سُر کا سہارا لے کر جذبات کو ابھارنے اور اچھالنے کی بہت کوشش کی لیکن جب حضرت مولانا نے سادہ اور پرخلوص انداز میں حقائق کو بیان کیا اور شعر

غریب وسادہ ورنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حُسین ابتداء ہے اسماعیل

پڑھا تو شیعہ مجمع جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔

حضرت کی مجالس اور بیانات پروفیسر سراج صاحب، پروفیسر شیر حسن صاحب اور پروفیسر میر حاتم صاحب نے لکھی ہیں۔ اصحابِ تحریر نے اخلاص کے ساتھ پوری کوشش فرمائی ہے لیکن اردو کے اہلِ زبان نہ ہونے کی وجہ سے مذکر مؤنث کی پابندی نہیں ہوسکی فارسی واردو کے کئی اشعار رہ گئے ہیں نیز یہ تومانی ہوئی بات ہے کہ مقرر کے جذبات قلب بند تو ہوسکتے ہیں لیکن قلم بند نہیں ہوسکتے۔ اس سب کے باوجود پروفیسر شیر حسن صاحب یا پروفیسر میر حاتم صاحب جمعہ کی مجلس میں یہ بیانات پڑھ کر سناتے ہیں تو ایک سماں بندھ جاتا ہے۔ اور بے ساختہ زبان پر آتا ہے

خدا جانے مجھے ساقی نے کیا دے کر پلایا ہے
وہ کب کا جاچکا لیکن نظر آتا ہے محفل میں

یا یہ شعر صفحہ خیال پر گذرتا ہے

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

واضح رہے کہ اس شعر میں گویا کا معنی بولتا ہوا لیے جائیں۔ ان بیانات کو صاف کر کے شائع کرنے کا کام شروع

ہو چکا ہے۔ایک دو مجموعے شائع بھی ہو گئے ہیں۔

ابتلائیں اور آزمائشیں:۔

سے ۱۹۶۲ء سے سخت آزمائشوں کا دور شروع ہوا۔حدیث شریف میں ہے:

انّ اشدّ النّاس بلاء الانبیاء فاالامثل و الامثل

یعنی سب سے زیادہ آزمائشیں اور بلائیں انبیاء علیھم السّلام پر آتی ہیں۔پھر جوان سے قریب ہے پھر جواُن سے قریب ہے چنانچہ یہ بلائیں شروع ہوئیں۔جن میں خود اپنے ساتھیوں کی مخالفت،ظاہر بین نام نہاد علماء اور نام نہاد گدی نشین حاسدین کی مخالفتیں ، بدنی بیماریاں، جنّات کی مقابلہ آرائیاں،اور مخالفین کے سحر وغیرہ طرح طرح کے نامساعد حالات آتے رہے۔ان کو یکے بعد دیگرے بندہ بیان کرتا ہے۔

بیماریاں:

ایک جان لیوا بیماری (Progressive Muscular Distrophy) جو فالج کی طرح کی بیماری ہے اس بیماری میں ٹانگوں یا بازوؤں کے پٹھے نیز بدن کے دوسرے حصوں کے پٹھے کمزور ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ بیماری تقریباً ۱۹۵۴ء میں شروع ہوگئی تھی۔اس کی وجہ ایک شدید بخار بنا۔اس بخار کے دوران معمولات اور وضو وغیرہ میں ٹھنڈے پانی کا استعمال کرتے ہوئے بجائے رخصت کے عزیمت کی راہ اختیار کی۔اس بیماری کی وجہ سے آہستہ آہستہ ٹانگوں میں کمزوری بڑھتی گئی۔کچھ عرصہ بعد لاٹھی اور ایک آدمی کے سہارے چل سکتے تھے۔اس دور میں موٹروں کا رواج نہیں تھا۔اس معذوری کی حالت میں سائیکل کے کیریئر پر بیٹھ کر مختلف ہاسٹلوں میں بیان کے لیے جاتے۔کبھی یوں بھی ہوا کہ سائیکل والے سے سائیکل گری نیچے حضرت صاحب اوپر سائیکل اور اس کے اوپر سائیکل چلانے والا۔لیکن پھر اٹھ کر کپڑے درست کر کے سنبھل کر چل پڑتے اور بیان کا ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ایسے موقعوں پر کبھی کبھی فرماتے تھے۔

زخم پہ زخم کھا کے جی، اپنے لہو کے گھونٹ پی
آہ نہ کر لبوں کو سی، عشق ہے دل لگی نہیں

مجال ہے عزم و استقامت میں کچھ فرق آئے۔

زیارت گاہ اہل عزم و ہمت ہے لحد میری   کہ خاکِ راہ کو میں نے سکھایا رازِ الوندی

اپنے تبلیغ والے ساتھیوں نے تبلیغ کے ساتھ تصوّف کی سرگرمیوں کے بارے میں اس قدر مخالفتیں کیں کہ فرماتے تھے کہ ناگواریاں برداشت کرکر کے معدے میں زخم ہوا اور خون کی قے ہوئیں۔ ایک موقع پر تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ شاید روح پرواز کر جائے گی۔ یہ معدے کی تکلیف ساری عمر ساتھ رہی اور اس کے لیے مستقل دوا ساری عمر استعمال فرماتے رہے بلکہ اس معدے کی تکلیف کی وجہ سے غذا بھی گویا بطورِ دوا کے استعمال فرماتے رہے جس کی مقدار بہت ہی قلیل ہوتی تھی۔ اس غذا اور آپ کے چہرے کی سرخی سفیدی، شادابی اور رونق کو دیکھ کر نیز دینی سرگرمیوں میں جوش وخروش اور عزم و ہمت کو دیکھ کر واضح طور پر محسوس ہوتا تھا کہ یہ کرامت ہے۔ بغیر کرامت کے اس قدر قلیل غذا کے ساتھ آدمی نہیں چل سکتا۔ اسی دور سے بلڈ پریشر بھی زیادہ ہونا شروع ہوا اور دل بھی متاثر (Angina) ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد ذیابیطس (Sugar) بھی شروع گئی۔ دمہ (Asthem) کی تکلیف ساری عمر ساتھ رہی۔ کانوں کی تکلیف ہوئی۔ جس کے نتیجے میں کان کے اندر تین ہڈیاں جن پر سماعت کا دارومدار ہے جام ہو گئیں۔ اس کے بعد سماعتی مشین (hearing aid) کے ذریعے سنتے تھے۔ ان چھ جان لیوا بیماریوں کے ساتھ جو وفات تک ساتھ رہیں اور جن کے لیے ساری عمر مسلسل علاج، معائنے، ہسپتالوں کے داخلے اور ڈاکٹر حضرات کی آمدورفت، لیباٹریوں کے ٹیسٹ جاری رہے۔ اور یہ چیز کئی ڈاکٹروں، کمپاؤنڈروں، اور ٹیکنیشنوں کے لیے فیض کا ذریعہ ہوئی۔ لیکن یہ بیماریاں اور معذوریاں اس مردِ مجاہد اور اللہ کے شیر کے عزم و ہمت کو شکست نہ دے سکیں۔ گرمیوں میں رات بارہ بجے تک بیدار رہ کر بھی دو بجے تہجد کے لیے اُٹھنے میں فرق نہیں آتا تھا۔

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چُھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

بیماریاں بڑھتی گئیں لیکن عزم و ہمت میں بھی نئی جوانی آتی گئی۔ اس لیے پہلے ایک خادم پھر دو خادم پھر تین ان معمولات میں آپ کے ساتھ چل سکتے تھے۔ اور وہ بھی اگر کچھ دن آرام کے لیے چھٹی نہ کرتے تو بیمار پڑ جاتے تھے۔ اس معذوری میں کئی تبلیغی سفر اور تقریباً نو سفر حج کے ہوئے اور ایک عمرہ کا۔ ان میں سے فقط پہلے سفرِ حج میں آپ خود چل سکتے تھے، باقی معذوری کی حالت میں ہوئے۔ ۱۹۷۱ء کے بعد پاؤں بالکل معذور ہو گئے۔ اب وہیل چیئر (پہیہ والی کرسی) پر یا پیٹھ پر اٹھا کر ہی نقل و حرکت ہو سکتی تھی۔ لیکن یہ سب رکاوٹیں کسی بھی معمول کو کم نہ کر سکیں۔

مخالفتیں:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز

چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

دستور ہے کہ حق کی مخالفت باطل کرتا رہا ہے۔ چنانچہ آپ کی وجہ سے جو دینی، تبلیغی نیز بیعت و تلقین کی فضا چل پڑی اس پر باطل بہت بپھرا۔ اور طرح طرح کے نامساعد حالات پیش آئے۔

جس طرح انسانوں کی آبادیاں ہیں اور ان مین نیک و بد ہر قسم کے لوگ ہیں اسی طرح جنّات کی بھی آبادیاں ہیں اور اُن میں بھی نیک و بد ہر طرح کے لوگ ہیں۔ جس طرح نیکی کے پھیلنے سے نیک لوگوں کو آخرت کے فوائد حاصل ہوتے ہیں اسی طرح دنیا کے لحاظ سے بھی ظاہری غلبہ اور معاشی و معاشرتی فوائد نیک لوگوں کے حصے میں آتے ہیں اور اس سے شر والے لوگوں کو سیاسی، معاشی و معاشرتی لحاظ سے نقصان ہوتا ہے۔ اسی طرح برائی پھیلنے سے شر والے لوگوں کی آخرت تو تباہ ہو جاتی ہے لیکن سیاسی، معاشی و معاشرتی لحاظ سے فوائد ان کے حصہ میں آتے ہیں۔ آخرت کی تو اُن لوگوں کو کوئی پرواہ نہیں ہوتی لیکن دنیا کے نقصانات پر اُن کو بہت تکلیف ہوتی ہے، جس کی وجہ سے وہ اہلِ حق کے درپئے آزار ہو جاتے ہیں۔ یہ حقیقت جنّات کے بارے میں بھی صادق ہے جس کا جنّات کے عاملین کو واضح تجربہ ہے۔ چنانچہ اہلِ باطل اور شرّی جنات بھی اہل حق کو تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک دفعہ فرمانے لگے کہ ''اسلامیہ کالج کے مکان نمبر ۱۰'' میں رہائش کے دوران ایک جن نے آ کر خوب پریشان کرنا شروع کیا۔ اس سے پوچھا کہ تو کیوں پریشان کرتا ہے؟ تو اس نے جواب میں کہا ''تم سے پہلے ایک معین الدّین ہندوستان آیا تھا۔ اس نے بہت کام خراب کیا تھا۔ اب اسی طرح تم بھی کام خراب کر رہے ہو۔'' یہ جن حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے زمانے کا تھا اور اس نے واضح طور سے کہا کہ تبلیغ و تصوّف کا کام بند کرو۔

فرمایا ایک دفعہ آدھی رات کو دیکھا کہ کپڑے لٹکانے والی تار کے ساتھ کوئی چیز لٹک رہی ہے اور اس سے کچھ پڑھنے کی آواز آ رہی ہے۔ قریب ہوا تو یہ لٹکنے والی مخلوق رام شام، رام شام کا ورد کر رہی تھی۔ خیال ہوا کہ وہی جن ہے چنانچہ آیت الکرسی پڑھ کر اسے پکڑ لیا۔ وہ بہت چلاّیا کہ مجھے آزاد کر دو میں ایجنٹا کے غاروں

سے آیا ہوں، وہاں سے تمہارے لیے ہیرے اور جواہرات لاؤں گا۔ فرماتے تھے میں نے اس بات کو نہیں مانا ۔میں نے اس سے کہا کہ یہ وعدہ کرو کہ پھر نہیں آؤ گے تب چھوڑوں گا۔ اس پر اس نے وعدہ کیا۔

ظاہر بین علماء، دنیا دار مشائخ بھی جگہ جگہ آپ کی مخالفت کرتے رہے۔ لیکن آپ نے کبھی کسی کے ساتھ محاذ آرائی والی ترتیب اختیار نہیں کی ۔ بلکہ ہمیشہ چشم پوشی نیز عفوودرگزر کا معاملہ فرمایا۔

ملازمت کا شروع کا دور تکلیف کا رہا۔ جب معذوری بہت زیادہ ہوگئی تو انہی ایام میں پرنسپل اسلامیہ کالج کا تبادلہ ہوا اور جغرافیہ کے پروفیسر اشرف درّانی صاحب پرنسپل بنے۔ مخالفین ان کے بھی کان بھرنے لگے۔ لیکن انھوں نے حالات کی تحقیق کرائی اور آپ کی معذوری اور بیماری کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا کہ آپ کی کلاس آپ کے گھر پر ہی ہوگی اور طلباء گھر پر ہی کلاس کے لیے آئیں گے۔ اسلامیہ کالج میں آپ شعبہ عربی کے صدر رہے۔ اپنی پروموشن (ترقی) کے بارے میں فرماتے تھے کہ ان دنوں پشاور یونیورسٹی کے رجسٹرار ایک قادیانی احمد حسن نامی، ہزارہ کے ہوتے تھے۔ جب آپ کا سینئر لیکچرر سے ریڈر (ایسوسی ایٹ پروفیسر) کی پروموشن کا وقت آیا تو اس نے آپ کے کاغذات ایک ایسے ریفری کو بھیج دیے جو وفات پا چکا تھا۔ جب اس سے معلومات کریں تو وہ یہی جواب دے کہ ریفری سے کاغذات واپس نہیں ہوئے۔ خیر جب اپنے طور پر معلومات کروائی گئیں تو پتہ چلا کہ ریفری صاحب وفات پا چکے ہیں لہٰذا وہ قبر سے اٹھ کر کیا جواب دیتے۔ چنانچہ قادیانی کی یہ سازش معلوم ہوئی اور اس طرح کاغذات صحیح آدمی کو بھیجے گئے جس پر ریڈر کی پوسٹ پر ترقی ہوئی۔

اس کے بعد آپ کی تعلیمی سرگرمیوں اور تحقیقی مقالات کی بنا پر آپ کو پروفیسر کی 20 گریڈ کی پوسٹ ملی۔ اور اسلامیہ کالج سے پشاور یونیورسٹی میں بطور صدر شعبۂ عربی آپ کا تبادلہ ہوا۔ اور تاحیات صدرِ شعبہ رہ کر وہیں سے ریٹائرمنٹ ہوئی۔ اس اثنا میں ڈین فیکلٹی آف عربک اینڈ اسلامک سٹڈیز کا موقع بھی آپ کو ملا۔ لیکن یہ اضافی چارج اپنی صحت کے پیش نظر آپ نے نہیں لیا اور اپنے دوست اور صدر شعبۂ اسلامیات قاضی مجیب صاحب کے لیے چھوڑ دیا۔

اس زمانے میں علاوہ ایم۔ اے عربی کے پی۔ ایچ۔ ڈی کی کلاس بھی شروع ہوئی۔ آپ کے دور میں قاضی مبارک صاحب، مولانا یوسف برجوی صاحب اور حسنات صاحب نے آپ کی نگرانی میں کام کر کے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ قاضی مبارک صاحب کے خارجی ممتحن مشہور عربی عالم و محقق عبدالفتاح

ابوغدہ تھے۔ جنہوں نے قاضی صاحب کے مقالہ کو معیاری قرار دیتے ہوئے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کا مستحق گردانا۔

ایک دفعہ بندہ سے فرمایا ڈاکٹر صاحب کیا حال ہے؟ راقم نے عرض کیا کہ مولانا صاحب آج کل پوسٹ گریجویٹ کلاس پڑھاتا ہوں۔ اتنا کام کرنا پڑتا ہے اور ایسی مشکل ہوتی ہے کہ سر چکراتا ہے۔ اس پر فرمانے لگے کہ انڈر گریجوایٹ یا پوسٹ گریجوایٹ کلاس پڑھاتے وقت کبھی تیاری کی نوبت نہیں آئی۔ شعبۂ عربی کے نصاب سے آپ نے مستشرقین (orientalist) کی وہ کتابیں جو لادینی مواد کی حامل تھیں نکالیں اوران کی جگہ صلحاء کی معیاری تحریروں کو جگہ دی۔ چنانچہ حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت مولانا یوسف بنوریؒ کا ایک ایک عربی قصیدہ داخلِ نصاب کیا گیا۔ مذکورہ بالا اشخاص کے علاوہ عربی، اسلامیات، اردو، تاریخ ،نفسیات اور فلسفہ کے کئی طلباء نے آپ سے تحقیقی کاموں میں مدد لی۔ نیز آپ کے کتب خانے کو استعمال کیا آپ کے طلباء شاندار کامیابیاں حاصل کرنے والے ہوئے اور پشاور یونیورسٹی نیز پورے صوبہ سرحد کے کالجوں بلکہ ملکی اور غیر ملکی سطح پر اہم پوسٹوں پر آئے اور کام کیے۔

پروفیسر ڈاکٹر قاضی مبارک صاحب پروفیسر شعبہ عربی، صدر شعبہ عربی اور پھر ڈین فیکلٹی آف عربیک اینڈ اسلامک سٹڈیز رہے۔

پروفیسر ڈاکٹر سعید اللہ قاضی صاحب پروفیسر اسلامیات، ڈائریکٹر اسلامک سنٹر، صدر شعبہ اسلامیات اور ڈین فیکلٹی آف اسلامک سٹڈیز اینڈ عربک رہے۔

پروفیسر محمّد حنیف صدر شعبہ اسلامیات و مدرسہ تھیالوجی اسلامیہ کالج رہے۔ اس کے علاوہ کئی حضرات جو گریجویشن لیول تک آپ کے عربی کے شاگرد رہے سی۔ ایس۔ ایس اور پی۔ سی۔ ایس کر کے ملک میں اہم پوسٹوں پر آئے۔ جو ایک دفعہ آپ کی کیمیاء اثر نگاہ کے سامنے سے گذرا اُس نے کچھ نہ کچھ دینی اثر ضرور قبول کیا۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

آپ کا کتب خانہ:

کتابوں کا آپ کو بہت شوق تھا۔ ازراہِ مذاق فرماتے تھے ''کسی کو کبوتر بازی کا شوق ہوتا ہے کسی کو بٹیر بازی کا شوق ہوتا ہے ہمیں کتاب بازی کا شوق ہے''۔ لاکھوں روپوں کی مالیت کا آپ کا کتب خانہ ہے۔ جس میں اکثر کتابیں آپ نے خود خریدی ہیں۔ بعد میں جب اللہ تعالیٰ نے بہت شہرت اور مقبولیت عطا فرمائی تو کئی کتب ہدیہ میں ملتی رہیں۔ خصوصاً مصنفین خود اپنی کتابیں بطور تعارف بھیجتے رہے۔ چنانچہ کتب خانہ ہر قسم کی اردو عربی تفاسیر، شروحِ حدیث، فقہ، تصوّف، سوانح اور ادب کی قدیم اور جدید کتب سے معمور ہے۔

پاکستان اور ہندوستان کے اکثر دینی جرائد آپ کو اعزازی طور پر بھیجے جاتے تھے۔ چنانچہ ہندوستان سے الفرقان، تعمیر حیات، الدّعوۃ، دیوبند کا رسالہ دار العلوم اور الدّاعی جبکہ پاکستان سے بینات، البلاغ، الحق، الفاروق اور دیگر کئی رسالے آپ کے کتب خانہ میں باقاعدہ آتے تھے۔

آپ کی خدمات کے پیشِ نظر آپ کو دوبار ملازمت میں توسیع دی گئی۔ چنانچہ آپ باسٹھ سال کی عمر تک کام کرتے رہے۔ اور باسٹھ سال کی عمر میں ریٹائر ہوئے۔ اس کے ڈیڑھ سال بعد تک آپ کو سرکاری مکان میں رہائش کی اجازت رہی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آپ کی خدمات کے پیشِ نظر آپ کو گورنر سرحد امیر گلستان جنجوعہ نے اپنے نمائندے کے طور پر پشاور یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ کا ممبر نامزد کیا اور عرصہ تین سال آپ پشاور یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ کے ممبر رہے۔ اس عرصہ کو پورا کرنے کے بعد آپ کو انجینئرنگ یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ کا ممبر نامزد کیا گیا۔ ہر دو ذمہ داریوں کو آپ نے بطریق احسن سنبھالا اور پورا کیا۔

تصانیف وتالیفات:

آپ کے حالات ساری عمر ایسے رہے کہ ان حالات میں تصنیف وتالیف مشکل تھی۔ ذکر واذکار کا گہرا انہماک، تبلیغ ودعوت کی والہانہ لگن اور مشغولیت، بیعت کے سلسلہ والوں کی آمد ورفت، ملازمت، چھ جان لیوا بیماریاں، لیکن باوجود ان سب باتوں کے تصنیفی سلسلہ جاری رہا۔

سب سے پہلی تصنیف Indo Arab Relations عرب اور ہندوستان کے تعلقات انگریزی میں بطور مقالہ (Desertation) برائے ایم۔ اے عربی دوران طالب علمی تصنیف کی سیّد سلیمان ندویؒ کے طریقۂ تربیت کے بارے میں ایک چھوٹی کتاب سلوک سلیمانی لکھی۔ بعد میں اسی مضمون کو

تفصیل سے لکھا تو شاہراہِ معرفت کے نام سے تین جلدوں میں ایک ایسی جامع کتاب وجود میں آ گئی جس میں سیّد صاحب کے حالات، نظریات، تربیتی نظام، زندگی اور سلوک کے بارے میں ان کا طرز فکر اور تربیتی خطوط شامل ہیں۔ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے جسے پاکستان میں آپ کی اپنی سلیمان اکیڈمی نے شائع کیا اور ہندوستان میں دارالمصنفین اعظم گڑھ نے شائع کیا۔ تربیتی اور دینی معلومات کے علاوہ کتاب ایک بلند پایہ ادبی کارنامہ ہے۔ جس کی تحریر ادبی لحاظ سے دارالمصنفین اور ندوۃ العلماء جیسے اداروں کے شایان شان ہے اور بندہ کی نظر میں سید سلیمان ندویؒ اور سید الوالحسن ندویؒ کی تحریروں کی صف میں نظر آتی ہے۔

اس کتاب کی رونمائی اسلامیہ کالج پشاور یونیورسٹی کے خیبر یونین ہال میں ہوئی جہاں مختلف مقررین نے تقریریں کیں۔ تقریب شروع ہونے سے پہلے مجمعے میں موجود دوست تذکرہ کر رہے تھے کہ کتاب کے بارے میں بشارت ہوئی ہے کہ مقبول ہوگئی ہے۔ دوران تقاریر ایک مقرر نے بتایا کہ صلحاء میں سے کسی کو بشارت ہوئی ہے کہ حضرت مولانا کی کتاب قبول ہوگئی ہے اور فلاں صفحہ کی وجہ سے قبول ہوئی ہے۔ کتاب کے بارے میں یہ بشارت بہت بڑی سعادت تھی۔ بندہ نے گھر آ کر اس صفحے کو نکالا تو اُس میں اتباعِ سنت کا مضمون لکھا ہوا تھا۔

پیام رسان امّت: یہ کتابچہ امّت محمّدیہ کے فریضہ دعوت و تبلیغ کے بارے میں ہے۔

تبلیغی نصاب کا فارسی ترجمہ: رائے ونڈ کی شوریٰ نے حاجی بشیر صاحب امیر جماعت کی سرکردگی میں حضرت مولانا کو تبلیغی نصاب کے فارسی ترجمہ کے لیے منتخب کیا۔ آپ نے فارسی ترجمہ لکھا۔ یہ ترجمہ بندہ کے سامنے ہوا۔ اس کا کوئی حصہ آپ نے بغیر وضو کے نہیں لکھا۔ فجر تا اشراق آپ مولانا یوسف برجوی صاحب سے لکھواتے تھے۔ بعد میں کچھ حضرات نے ایک دوسرا ترجمہ افغانی دری فارسی میں کروایا اور مدرسہ فیضی کی طرف سے شائع کیا۔ لیکن اہل نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ جو شگفتگی اور روحانیت آپ کے ترجمہ میں ہے وہ دوسرے ترجمہ سے زیادہ ہے۔ اس کے شائع کرنے میں پہلے ایڈیشن میں ۹۰ ہزار روپے کا خسارہ برداشت کیا۔ جو اُس دور کے مطابق ایک خطیر رقم تھی۔ بعد کے ایڈیشنوں میں بمشکل یہ خسارہ پورا ہو سکا۔

رسائل کے لیے مضامین: آپ کا ایک تصنیفی سلسلہ مختلف رسائل کے ایڈیٹروں کے اصرار سے وجود میں آیا۔

رسالہ الحق نے ایک سوالنامہ میری مطالعاتی زندگی کے نام سے بھیجا اس پر لکھا۔ جو بعد میں ایک علیحدہ رسالہ کی شکل میں دارالعلوم حقانیہ والوں نے ''میری مطالعاتی زندگی'' کے نام سے شائع کیا۔

حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کاندھلوی کی وفات پر ایک مضمون لکھا۔ جسے الفرقان نے شائع کیا اور سب مضامین میں اونچے مقام کا مضمون متصور ہوا۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحبؒ کی وفات پر مضمون: یہ مضمون الفرقان رسالہ لکھنو کے لیے لکھا۔ سب مضامین میں سے منفرد مضمون متصور ہوا۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نمبر کے لیے لکھا۔ جو اپنے پورے نمبر میں اکثر مضامین سے زیادہ وزن رکھتا ہے۔

سوانح حضرت مولانا فقیر محمد صاحبؒ خلیفہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ: یہ کتاب بنام فیضِ حسن و اشرف لکھی جو دلچسپی کے لحاظ سے قابل دید ہے اور پڑھنے والے کے باطنی حال کے بدلنے کا ذریعہ بنتی ہے۔

سوانح حضرت مولانا یوسف بنوری صاحبؒ جو کہ غیر مطبوعہ ہے۔ اس کتاب کے بارے میں راقم سطور نے عجیب خواب دیکھا۔ کراچی تبلیغی جماعت کے ساتھ جانا ہوا۔ وہاں مولانا یوسف بنوریؒ صاحب کی خواب میں زیارت ہوئی، انہوں نے فرمایا کہ میں نے اشرف صاحب کو ایک قلم دیا تھا۔ خواب میں بندہ نے دیکھا کہ ایک بہت خوبصورت سبز رنگ کا پارکر قلم ہے۔ پشاور واپسی پر یہ خواب حضرت مولاناؒ کو سنایا تو حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ اسی طرح کا خواب میں نے بھی دیکھا ہے اور اس کی تعبیر یہ ہے کہ میں حضرت بنوریؒ کی سوانح لکھوں۔ خیر وفات کے بعد حضرت مولاناؒ کے خلیفہ حسن صاحب سے معلوم ہوا کہ وہ سوانح حضرت صاحب نے لکھ لی تھی اور مسودہ پڑا ہوا ہے۔ خیال ہوا کہ اس کو نکال کر شائع کیا جائے۔ تو پھر خواب میں مولانا یوسف بنوری صاحبؒ اور حضرت مولانا صاحبؒ دونوں کی زیارت ہوئی بندہ نے عرض کی کہ مولانا صاحب بنوری صاحبؒ چلے گئے آپ جلدی فرماویں اس پر فرمایا کہ ہمیں ناشتہ کرنے دیں وہ ہمارے بغیر نہیں جائیں گے۔ ہر دو رؤیا سے سوانح کے شائع ہونے کے بارے میں نیک شگون محسوس ہوا۔ لیکن باوجود تلاش کے مسوّدہ نہ مل سکا۔

ایک کتابچہ چہل احادیث شائع کروایا۔ اس کے علاوہ کئی مضامین الحق، البلاغ، بینات وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔

رسالہ البیان: ایک رسالہ البیان شروع کیا۔ چند ہی اشاعتوں کے بعد اس نے علمی و ادبی میدان میں نام پیدا کر لیا۔ اس کے اخراجات بہت زیادہ تھے۔ حضرت مولانا کی طبیعت انتہائی خوددار تھی۔ اپنے حالات کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ متعلقین نے اس کی اشاعت میں دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ اعزازی اور مفت تقسیم ہوتا رہا۔ تھوڑے حضرات باقاعدہ چندہ دیتے رہے۔ نتیجۃً کافی نقصان اٹھایا اور نہایت مفید رسالہ بند ہو گیا۔

مدارس:

دین کے پھیلاؤ اور بقا میں جو کردار مدارس اور دار العلوموں کا ہے وہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ اگر علم باقی ہے تو امت باقی ہے۔ خدا نخواستہ علم اور علماء نہ رہے تو دین کی بقا اور امت کی بقا ممکن نہیں۔ حضرت مولانا اس شعبہ کے بہت قدردان تھے۔ چنانچہ دارالعلوم کے اساتذہ اور طلباء سے خاص محبت فرماتے تھے۔ جب بھی علماء کی آمد ہوتی تو خاص اکرام فرماتے۔ اور طلباء زیارت کو آتے تو علاوہ کھلانے پلانے کے انہیں کچھ نقد بھی عطا فرماتے۔ جہاں بھی مدرسہ بنانے کی کوشش ہوتی بہت تائید فرماتے اور مالی اور جانی قربانی دے کر مدد فرماتے۔ آپ کی زندہ کرامتوں میں سے ایک کرامت مدرسہ امداد العلوم پشاور صدر ہے۔ اس کی داستان کچھ یوں ہے کہ اس جگہ پر یہودیوں کی رسوائے زمانہ تحریک فری میسن کا ٹمپل اور لاج (عبادت خانہ وقیام گاہ) تھا۔ یہ تحریک مقامی لوگوں کو ممبر بناتی تھی اور ایک کلب کی شکل میں کام کر رہی تھی جہاں ممبروں کے لیے کھیلوں اور دیگر تفریحی کاموں، نیز کھانے پینے کی پارٹیوں کا بندوبست کیا جاتا تھا۔ اس دوران ہی ان کے دانشور آہستہ آہستہ مجالس کے دوران اپنے زہریلے نظریات ان ممبروں کے ذہنوں میں ڈالتے تھے۔ اس تحریک کو حکومت پاکستان نے خلاف قانون قرار دے دیا اور فری میسن لاج بند ہوگئی۔ اس تحریک سے وابستہ ایک شخص حاجی غلام نبی صاحب (مالک سرور موٹرز) حضرت مولانا صاحبؒ سے بیعت ہوگئے۔ حاجی صاحب نے باقی ممبروں سے مل کر یہ اعلان کر دیا کہ فری میسن لاج جو ہم ممبروں کی ملکیت ہے اسے ہم مسجد کے لیے وقف کرتے ہیں اور خبر کو اخبار میں شائع کروا دیا۔ اس کی اطلاع حضرت مولانا صاحبؒ کو کر دی گئی۔ حضرت مولانا سے طویل مشاورت ہوئی۔ قانونی مالکان کی نیت بھی تھی اور خواہش بھی۔ اس لیے حضرت مولاناؒ نے متعلقین کو حکم دیا کہ متذکرہ جگہ پر فوری قبضہ کر کے نماز شروع کر دینی چاہیے اور بچوں کا ایک مدرسہ، ایک استاد کی نگرانی میں شروع کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ متعلقین نے اس عمارت کے بڑے ہال کو صاف ستھرا کر کے شراب کے نشان وغیرہ دھو کر پاک کر دیا اور نماز شروع کر دی۔ ساتھ ہی ایک مدرسہ حافظ فضل حق حسن گڑھی والے کی نگرانی میں شروع کر دیا۔ یہ جگہ اتنی قیمتی اور اہم تھی کہ اس کا سخت ردعمل ہوا اور وہ لوگ جو اس جگہ کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے سخت پریشان ہوئے۔ نیز وہ لوگ جنہیں بوجوہ مدرسوں سے پُرخاش ہے ان کو بھی سخت تکلیف شروع ہوگئی۔ بے خبر قسم کے جدید تعلیم یافتہ مخالفین اعتراض کرتے کہ اس جگہ شراب پی گئی ہے اور عجیب وغریب قسم کے اعمال ہوئے ہیں یہاں نماز نہیں ہوسکتی۔ ان کی مخالفت کو فرو کرنے کے لیے ایک استفتاء لکھا گیا۔ اور اس پر

علماء کا فتوی لیا گیا۔ کہ اگر ایک جگہ جہاں شراب پی گئی ہو اسے دھو کر پاک کر کے نماز شروع کی جائے۔ تو اس کا کیا حکم ہے۔ مفتی حضرات نے حکم دیا کہ جائز ہے۔ انہی دنوں پیپلز پارٹی کی حکومت آ گئی۔ یار لوگوں نے مل ملا کر ذوالفقار علی بھٹو (اس وقت کے وزیر اعظم) سے اس جگہ کو کلچرل سینٹر کے لیے مختص کروا دیا اور فیض احمد فیض کو جو مشہور کیمونسٹ شاعر تھے اور پنڈی سازش کیس میں کیمونسٹ انقلاب کی کوشش میں ماخوذ بھی ہوئے، کو اس کا انچارج مقرر کر دیا۔ غالباً ایک کروڑ روپے فنڈ بھی مختص کر دیا گیا۔ حالات بہت خراب ہو گئے۔ یہ حضرت مولانا کی دعا اور کرامت کا نتیجہ تھا کہ عملی اقدامات میں تاخیر ہوتی گئی اور اس طرح ہمیں قدم جمانے کا موقع ملتا گیا۔ یہ جگہ 32۔ دی مال ایسی جگہ ہے کہ اس کے ایک طرف 45 کنال زمین میں عیسائیوں کا ایک گرجا تھا اور دوسری طرف 32 کنال میں دوسرا گرجا۔ اور بالکل چوک پر یہ 22 کنال جگہ یہودیوں کا کنیسہ تھا۔ قیمت کے لحاظ سے کروڑوں کی جائیداد تھی اور کنٹونمنٹ کا ایریا ہونے کی وجہ سے صرف لیز پر مل سکتی تھی۔ یہ ایسا عجیب علاقہ ہے کہ پورے مال روڈ پر کہیں بھی مسجد نہیں تھی۔ کچھ دنوں بعد طے ہوا کہ نماز جمعہ بھی شروع کی جائے۔ چنانچہ نماز جمعہ بھی شروع کی گئی۔ وسائل نہ ہونے کی وجہ سے بشیر قریشی صاحب الیکٹریکل انجنیئر جو پشاور کے تبلیغی مرکز کی شوریٰ کے رکن تھے اور بہت ذہین، فہیم محتاط اور متقی مبلغ تھے کو تقریر کے لیے مقرر کیا گیا۔ خطبہ مقامی امام صاحب پڑھتے تھے وہی نماز بھی پڑھاتے تھے۔ کچھ عرصہ راقم الحروف جمعہ پڑھاتا رہا۔ کچھ وقت باوجود معذوری کے حضرت مولاناؒ تکلیف اٹھا کر تشریف لے جاتے اور تقریر فرماتے۔ کچھ عرصہ اسلامیہ کالج کے اسلامیات کے ریٹائرڈ پروفیسر مولانا عبدالشکور صاحب فاضل دیو بند جمعہ پڑھاتے رہے۔ کچھ دن بعد طے ہوا کہ یہاں وقفے وقفے سے جلسے منعقد کروائے جائیں اور پر جوش مقررین جن کی تقریروں کا شہرہ ہے انہیں بلایا جائے اور دیہات کا مجمع زیادہ بلایا جائے تاکہ انتظامیہ پر واضح ہو کہ جن لوگوں کے پاس ملکیت کے اختیارات تھے جس مقصد کے لیے انہوں نے وقف کیا اس کے علاوہ اس جگہ کو دیگر مقاصد کے لیے استعمال کرنے میں مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔ اور صوبائی سطح پر امن و امان کا مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اس اثناء میں مختلف گورنر بدلتے رہے۔ کچھ عرصہ اسلم خٹک صاحب بھی گورنر رہے۔ ان سے ملاقات کی گئی۔ انھوں نے جواباً کہا کہ اتنی قیمتی جگہ کو مسجد بنا کر خراب کر رہے ہو۔ یہ ملاقات تلخ رہی۔ جب واپسی ہوئی تو حضرت مولانا کے مریدوں میں سے ایک فقیر نے کہا کہ اسلم خٹک کی گورنری فوراً ختم ہو جائے گی کیونکہ اس سے صوبے کے روحانی گورنر کی بے قدری ہو گئی ہے۔ چنانچہ حاجی شاہ جہان گواہ ہے، جس نے اس منظر کو دیکھا تھا کہ ایسا ہی

ہوا۔

پھر نصیر اللہ بابر صاحب گورنر ہوئے ان تک رسائی کے لیے حضرت دعا اور کوشش میں مصروف ہو گئے۔ اتفاقاً اسے اپنے کسی مریض کو دم کرانے کے لیے حضرت مولانا سے رابطہ کرنا پڑا، اسی نسبت سے اس کے ساتھ ملاقات کے لیے وقت لیا گیا، پروفیسر ڈاکٹر شیر حسن صاحب بھی ساتھ تھے۔ حضرت کی بات سننے کے بعد وہ گویا ہوئے ”جو مساجد پہلے سے بنی ہوئی ہیں ان کا کیا حال ہے؟ ذرا ان کو دیکھیں وہاں کا انتظام کیسا ہے، وہاں کتنے نمازی ہیں؟ پاس ہی سنہری مسجد ہے، وہاں کتنے نمازی ہیں؟ پیسہ ایک نہیں ہے اور چندوں پر چندہ کرتے رہتے ہو، مسجد ایک بھی نہیں بنا سکتے۔ ہم اس کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتے کہ اتنی اچھی جگہ مسجد کے لیے استعمال ہو۔ ہم یہاں مارکیٹ بنائیں گے اور کلچرل سنٹر بنائیں گے البتہ اگر تم لوگ چاہتے ہو تو ایک کونے میں آپ لوگوں کے لیے ایک چھوٹی سی مسجد بھی بنا دیں گے۔“

گورنریاں بہرحال آنی جانی و فانی چیزیں ہیں ان کی گورنری تو نہ رہی لیکن فری میسن لاج بالآخر حضرت مولانا کی چاہت اور خواہش کے مطابق مسجد اور مدرسہ بنی تھی لہٰذا بن کر رہی۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مؤمن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

تو چناں خواہی خدا خواہد چنین
می دہد مولا مرادِ متقین

ترجمہ: جیسے تو چاہے ویسے اللہ چاہے گا، وہ متقی لوگوں کی مراد عطا فرماتا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو تک رسائی کے وسائل نہیں تھے۔ اس اثنا میں بھٹو نے ایک جلسہ پشاور میں کیا۔ اس جلسے میں مجاہد لکھنوی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک بڑا بینر مسجد کا اٹھائے ہوئے پہنچ گئے اور مظاہرہ (Demo-nstration) کیا۔ لیکن اس بات کو بھٹو نے اپنے لیے ناگوار سمجھا اور بات پر کان نہ دھرا۔ بلکہ انتظامیہ اور بھی مخالف ہو گئی۔ ایک دن حضرت مولانا جمعہ کی نماز پڑھنے اس 32 مال والی عارضی مسجد میں جا رہے تھے کہ راستے میں ایف۔ ایس۔ ایف (فیڈرل سکیورٹی فورس۔ یہ ایک فورس تھی جو ذوالفقار علی بھٹو نے قائم کی تھی اور اس کی وجہ سے وہ پولیس، ملیشیا اور فوج سے کافی حد تک بے نیاز ہو گیا تھا۔ اس کا اختیار براہِ راست اس کے ہاتھ میں تھا) کی گاڑی نے آپ کی گاڑی کو ٹکر مار دی۔ اللہ نے حفاظت فرمائی کچھ چوٹیں آئیں لیکن خیر رہی۔

نماز جمعہ میں رکاوٹ آئی اور آپ کو پریشان و ہراساں کیا گیا۔ جمعہ کو بعد عصر حضرت کے ہاں ختم قرآن ہوتا تھا ۔اس میں بہت جلے دل سے آپ سے ذمہ دار افراد کے لیے بددعا ہوگئی۔ بقول ڈاکٹر برہان ڈینٹل سرجن دوسرے دن ایک فقیر جن کے بارے میں کبھی حضرت مولانا نے فرمایا تھا کہ یہ سلسلۂ تکوین والے ہیں آئے اور دروازے میں کھڑے ہوکر دونوں طرف کی چوکھٹ کو ہاتھوں میں پکڑا اور اندر منہ کرکے حضرت سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ پھر تم نے اس کی پھانسی دستخط کروادی۔اس کے ٹھیک ڈیڑھ سال کے بعد پھانسی ہوگئی۔انہیں دِنوں کا واقعہ ہے کہ ایک رات بعد عشاء بندہ دیر سے حضرت مولاناؒ کے پاس حاضر ہوا کیونکہ اس وقت بندہ آپ کو انجکشن لگایا کرتا تھا۔آپ بالکل تنہا کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پوچھنے پر فرمایا کہ انتظامیہ نے دھمکی دی ہے کہ اس مسجد سے باز نہ آئے تو گرفتار کروادیں گے۔ ہمارے پاس ایسے آدمیوں کے لیے D.P.R رولز ہیں۔ اس لیے آج سارے ساتھی چلے گئے ہیں کیونکہ اس وقت پولیس کے آنے کا خطرہ ہے۔ بندہ کو دل میں کوفت ہوئی اور عرض کیا کہ انشاء اللہ آپ کو کوئی گرفتار نہیں کرسکتا۔اللہ نے خیر کی اور یہ فیصلہ التواء میں چلا گیا۔ایک دفعہ صبح جاکر دیکھا تو رات کو انتظامیہ نے مسجد کے نام کے جو دو بورڈ لگے ہوئے تھے ان کے لکڑی کے سٹینڈ کٹوا کر بورڈ اتار دیے۔اس کی تصویریں اتروا کر حضرت نے اخبارات میں شائع کروادیں اور اس پر سرخی لگائی ’’اسلامی مملکت میں مساجد کے ساتھ حکومت کا سلوک‘‘۔

انہیں دنوں شاہ فیصل مرحوم کی شہادت ہوگئی۔ان کی یاد میں مسجد کا نام مسجد الفیصل رکھ دیا گیا اور یہ خبر اخبارات میں شائع کی گئی۔اس نام کی وجہ سے انتظامیہ کے رویے میں سختی کم ہوئی۔ سنا تھا کہ سعودی حکومت نے اس مسجد کے لیے تیس لاکھ روپے بھی بھیجے تھے لیکن وہ پیپلز پارٹی کی حکومت کے دوران مسجد تک نہ پہنچ سکے ۔اس اثنا میں ۷۷ء میں فوجی انقلاب آیا اور جنرل ضیاء الحق نے اقتدار سنبھال لیا۔ان کے بارے میں مشہور تھا کہ دیندار آدمی ہیں۔ چنانچہ حضرت نے انھیں اپنے پیڈ پر لکھا اور حالات بیان کیے۔ جواب میں انھوں نے اپنے خاص اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے لکھا کہ یہ جگہ ایک مسجد کی تعمیر کے لیے حضرت مولانا اشرف خان صاحب کے حوالے کی جاتی ہے۔اس وقت کے صوبہ سرحد کے گورنر، جنرل سوار خان بھی حضرت سے عقیدت مندانہ تعلق رکھتے تھے۔اس لئے انھوں نے مسئلے میں مثبت رویہ اختیار کیا۔

اس جگہ فری میسن تحریک کے بارے میں معلومات دلچسپی سے خالی نہیں ہوں گی۔ حاجی غلام نبی صاحب ممبر فری میسن جب حضرت کی بیعت میں داخل ہوئے اور اللہ تعالی نے جلد ہی انہیں باشرع زندگی

نصیب فرمائی تو ایک دن بندہ نے ان سے پوچھا کہ حاجی صاحب یہ فری میسن تحریک کیا تھی؟ تو انہوں نے بتانا شروع کیا کہ اس کے 32 درجے (Stages) ہوتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے 7 درجے پار کیے تھے اور اب میں سمجھتا ہوں کہ جو آدمی اس کے دس درجے طے کر لیتا تھا۔ اس کی اتنی ذہنی تطہیر Brain Washing- ہو چکی ہوتی تھی کہ وہ مسلمان نہیں رہتا تھا۔ بس اس کا نام مسلمانوں جیسے ہوتا تھا لیکن اس کی سوچ، جذبات اور احساسات یہودیوں کے رنگ میں رنگ چکے ہوتے تھے۔ اتنی بات بول کر حاجی صاحب اچانک چپ ہو گئے۔ کیونکہ فری میسن تحریک والوں کو بتایا ہوا ہوتا تھا کہ اگر تم نے یہ راز کسی کو بتائے تو چند دنوں میں قتل کر دیئے جاؤ گے اور تمہارے قاتل کا بھی پتہ نہیں چلے گا۔ چنانچہ حاجی صاحب مزید انکشافات سے فوراً رک گئے۔

ضیاء الحق کے خط کے باوجود انتظامیہ جگہ حوالے نہیں کر رہی تھی۔ کیونکہ زمین جائیداد کے بارے میں جب تک کنٹونمنٹ بورڈ کے متعلقہ اہل کاروں سے کیس نہ گذرے اس وقت تک انتقال وغیرہ کا مسئلہ ادھورا ہوتا ہے۔ اس لیے پٹواریوں اور تحصیلداروں نے بہت رکاوٹیں ڈالیں۔ ضیاء انتظامیہ نے خاص تعاون کرتے ہوئے سگنل دیا کہ جگہ کا قبضہ آپ لوگوں کو دے دیتے ہیں باقی باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔

چنانچہ ایک دن حضرت نے بندہ سے فرمایا بیٹا کل سارے طلباء اور اساتذہ کے ساتھ جگہ Site پر پہنچ جانا کہ جگہ کا قبضہ لیں گے۔ بندہ پچیس تیس طلباء اور اساتذہ کے ساتھ موقع پر پہنچ گیا مارشل لاء انتظامیہ کی طرف سے بریگیڈیر فہیم قبضہ دلوانے آئے ہوئے تھے۔ کنٹونمنٹ والے بھی پہنچ گئے تھے کہ اپنا مؤقف بیان کریں کہ ابھی انتقال نہیں ہوا۔ تحصیلدار آگے بڑھا اور اس نے کہا آپ کیسے قبضہ لے سکتے ہیں۔ اس پر مارشل لاء والوں کا آدمی آگے بڑھا اور اس نے ایک موٹا سریا عمارت کے تالے میں ڈالا اور کھینچا تالہ ٹوٹا اور اس نے کہا ایسے ہم قبضہ لے سکتے ہیں۔ عمارت کے اندر سب داخل ہوئے۔ فری میسن تحریک کا ریکارڈ نکالا گیا۔ کئی نامی گرامی افراد کے نام ممبروں میں لکھے ہوئے تھے۔ کچھ تلواریں، کچھ انسانی کھوپڑیاں وغیرہ ان سب کو ایک الماری میں جمع کیا گیا۔ بعد میں سنا کہ انسانی کھوپڑیاں یہودی جادوٹونے وغیرہ میں استعمال کرتے تھے۔ اس کے بعد حفظ کے مدرسہ میں بنوں کے قریشی برادران بطور اساتذہ آئے۔ ان کی خوش الحانی نے مدرسہ کو کافی کشش دی۔ طلباء کی تعداد بڑھی۔ علاقے کے لوگوں اور فوجی افسران کو اندازہ ہوا کہ اس جگہ مسجد کتنی اہم اور ضروری تھی۔ علاقے کے سارے جنازے مسجد کے احاطے کے پاس کھلے میدان میں ہونے لگے۔ جن کے

لیے پہلے کوئی جگہ نہیں تھی۔اس اثناء میں لیفٹیننٹ جنرل فضل حق گورنر مقرر ہوئے۔ یہ دینی لوگوں کے قدر دان تھے۔ان سے حضرت مولاناؒ کی ملاقات ہوئی۔ بہت ادب سے ملے۔حالات سننے پر کہا کہ ضرور مسجد بنانی چاہئے اور ہم آپ کی پوری تائید کریں گے۔

مسجد اور مدرسہ کے انتظامی امور کے لیے حضرت مولانا نے حضرت مولانا فقیر محمد صاحبؒ کے صاحبزادے حاجی عبدالرّحمان صاحب کو اپنی طرف سے نائب مہتمم مقرر فرمایا۔انہوں نے انتظامی امور میں دلچسپی لینا شروع کی اور کام آگے بڑھا۔

حضرت مولانا فقیر محمد صاحب حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ کے خلیفہ تھے۔مجاہدات، اذکار،اشغال، بے نفسی،تواضع میں یادگارِسلف تھے۔کسی موقع پران کی حضرت مولانا صاحبؒ سے ملاقات ہوئی اور باہمی ہردوحضرات کو بہت کشش محسوس ہوئی۔شاہ عبدالعزیز صاحب کی خلافت کے بعد حضرت مولانا فقیر محمد صاحب نے بھی حضرت مولاناؒ کو خلافت عطا فرمائی اور فرمایا کہ یہ مولانا اشرف صاحب سنگ پارس ہیں ۔سنگ پارس ایک پتھر کو کہتے ہیں جس کے بارے میں مشہور ہے کہ جس سے لگ جائے اس کو سونا بنا دیتا ہے۔

حضرت مولانا فقیر محمد صاحبؒ کی توجہ بھی مدرسے اور مسجد کی طرف ہوئی اور اس کی تعمیر و ترقی کے لیے دعا فرمانے لگے۔اللہ تعالیٰ نے غیب سے سامان کیا اور حضرت مولانا فقیر محمد صاحبؒ کے مرید و خلیفہ حضرت نواب قیصر خان صاحب کے ذریعے قطر کے ایک مخیّر شخص شیخ درویش فخرو نے مسجد کی تعمیر کے لیے ایک خطیر رقم مختص کی۔گورنر فضل حق صاحب کو بلایا گیا اوران کے ہاتھوں سنگ بنیاد رکھوایا گیا۔گورنر فضل حق صاحب کے لیے بھی حضرت نے دعا فرمائی۔ چنانچہ گورنر موصوف کو اللہ نے دینی زندگی نصیب فرمائی۔آخری ایّام میں پابند صوم وصلوٰۃ ہوئے اور ذکر کے عادی ہوئے اور شہادت کی موت نصیب ہوئی۔

پروفیسر مسرت حسین شاہ صاحب اور حاجی عبدالرّحمان صاحب نے مل کر حضرت مولانا کی نگرانی میں کام شروع کیا۔حضرت ان دنوں تبلیغی جماعت کے بھی امیر تھے۔ان کی خواہش تھی کہ یہ جگہ تبلیغی مرکز بنا دی جائے۔کیونکہ پرانا تبلیغی مرکز مسجد خواجہ معروف ضرورت پوری نہیں کررہا تھا۔لیکن تبلیغ والے حضرات نے دلچسپی نہ لی اور کہہ دیا کہ ہم متنازعہ جگہ مرکز نہیں بنائیں گے۔بعد میں مدرسہ میں توسیع کی گئی۔علاوہ تجوید و حفظ کے دینی کتابیں شروع کی گئیں اور دورہ حدیث شروع کیا گیا۔مشہور شیخ الحدیث حضرت مولانا امان اللہ صاحب تدریس کے لیے مقرر ہوئے۔تھوڑے عرصے بعد ہی عالمی شہرت یافتہ عالم حضرت مولانا حسن جان

صاحب بھی تدریسی عملہ میں بطور شیخ الحدیث شامل ہو گئے اس طرح یہ مدرسہ پاکستان کا ایک نمائندہ مدرسہ بن گیا۔ چونکہ سعودی حکومت سے مسجد و مدرسہ کے سلسلہ میں کوئی دلچسپی کا مظاہرہ نہ ہوا اور اس کے کل اخراجات شیخ درویش فخرو صاحب نے دیے اور وہ ایک پابند شرع اور نیک شخصیت تھے۔ اس لیے مسجد کا نام ان کے نام پر ہی مسجد درویش رکھا گیا۔ دارلعلوم کا نام شیخ العرب والعجم، مجاہد جنگ آزادی ۱۸۵۷ء حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے نام پر رکھا گیا۔ آج مدرسہ میں سینکڑوں طلباء درجہ حفظ میں سینکڑوں درجہ کتب میں اور سینکڑوں دورہ حدیث میں ہوتے ہیں۔ اتنی تعداد پاکستان کے چند گنے چنے مدارس میں ہوگی۔ مدرسہ کا مسلک معتدل، فرقہ واریت سے پاک، جذباتی اور یک رخہ طرز سے علیحدہ ایک جامع مسلک ہے۔ جو سب طبقات کو جوڑ کر ملک میں اتفاق واتحاد کی فضا پیدا کرنے کا علمبردار ہے۔ مدرسہ کے اخراجات کے لیے خطیر رقم کی ضرورت درپیش ہوتی رہی۔ لاکھوں روپے کا قرضہ جمع ہو جاتا تھا۔ یہ حضرت کی کرامت تھی کہ غیب سے بندوبست ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ مدرسہ ۴ لاکھ روپے کا مقروض ہو گیا اور آٹا کی دکانوں اور روٹی کے تندوروں تک نے پیغام بھیج دیا کہ اپنا بندوبست کرو۔ پچھلا قرضہ ادا کرو تا کہ ہم مزید ترسیل (سپلائی) کریں۔ حاجی عبدالرّحمان صاحب نے مدرسہ والوں سے کہا کہ اسی طرح حضرت مولانا کی خدمت میں جا کر عرض کرو۔ چنانچہ حضرت کو فکرمند کیا گیا، جلسہ مقرر ہوا۔ ایک ہی جلسہ میں سارا قرضہ ادا ہونے اور اگلے سال کے لیے پیش کش ہونے کے حالات پیدا ہو گئے۔ یہ چالو مدرسہ مولانا صاحب کی زندہ کرامات میں سے ایک کرامت ہے۔ واقعی اصل کرامت کسی بزرگ کی یہ ہوتی ہے کہ اس سے کتنا دینی فیض عام ہوا۔

یونیورسٹی کے مدارسِ حفظ قرآن:

۱۹۵۵ء سے پاکستان میں حفظِ قرآن اور تجوید کا سلسلہ شروع ہوا راہوالی (گوجرانوالہ) کی ایک مخیرّ شخصیت اور شوگر مل کے مالک نے اپنی جائیداد کو ٹرسٹ بنا دیا اور اسکی آمدنی سے حفظِ قرآن کے مدارس چلانے شروع کیے۔ انہی کے تعاون سے حضرت مولانا نے پشاور یونیورسٹی میں حفظ قرآن کے مدارس کا آغاز کیا۔ فوراً شعبۂ الٰہیات نے مخالفت شروع کر دی اور یونیورسٹی سے ہر اِمام کے لیے تدریسی الاؤنس مقرر کر کے ان مدارس کے راستے میں رکاوٹ ڈال دی اور بغیر تجوید کے ہی مقامی مولوی صاحبان نے ناظرہ پڑھانا شروع کر دیا۔ مجبوراً وہ مدارس حضرت مولانا کو اپنے گھر منتقل کرنا پڑے جو کچھ عرصہ چل کر بند ہو گئے۔ مقامی ائمہ نے بھی زیادہ دلچسپی نہ لی اور اس طرح ایک بڑی آبادی حفظ اور تجوید کی برکت سے محروم ہو گئی۔ ۱۹۸۰ء

میں دوبارہ حضرت نے بندہ کے ذریعے دو مدارس کی ابتداء کروائی۔ اب کے تبلیغی جماعت کی کارکردگی اور حضرت کی سرگرمیوں سے پشاور یونیورسٹی کی فضا میں ایک دینی انقلاب برپا ہو چکا تھا اور شعبۂ الٰہیات کی گرفت کمزور ہو چکی تھی۔ نئے وائس چانسلر پروفیسر رشید احمد طاہر خیلی نے بھی تائید کی۔ چنانچہ مدرسوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور کئی طلباء داخل ہوئے جس سے پشاور یونیورسٹی میں حفظ و تجوید کا دور شروع ہوا۔ ان مدارس کی دیکھا دیکھی دوسری مساجد میں بھی لوگوں نے نئے مدارس قائم کر لیے۔ اب تک ان مدارس کی وجہ سے کئی طلباء کو حفظ و تجوید کی دولت مل چکی ہے۔

دینی تحریکات نیز پشاور یونیورسٹی کے سیاسی حالات:

پاکستان میں ۱۹۶۹ء تا ۱۹۷۰ء ایسے حالات گذرے کہ اس دور میں اشتراکیت واشتمالیت (کمیونزم اور سوشلزم) کے بادل پورے ملک پر منڈلاتے رہے۔ اس دور میں دہریہ لٹریچر تھوک کے حساب سے ملک میں آیا۔ دشمن کی کوششوں کا مرکز کالج و یونیورسٹیاں تھیں۔ طلبہ تنظیمیں اور اساتذہ کی تنظیمیں بنائی گئیں جو نظریاتی کام بھی کرتی تھیں اور مختلف ایسوسی ایشنوں کے الیکشنز میں حصہ بھی لیتی تھیں اور اس طریقہ سے اپنے عزائم پورے کرتی تھیں۔ مولانا صاحب نے یونیورسٹی و اسلامیہ کالج کے ہاسٹلوں میں جا جا کر طویل اور تفصیلی تقریریں فرمائیں اور اس طرح ان کا سدباب کیا۔ اپنے مرید طلباء و اساتذہ سے مختلف اداروں کے الیکشن لڑوائے۔ چنانچہ حاجی بشیر طارق کئی مرتبہ سکولوں کی اساتذہ کی تنظیموں کے صدر رہے۔ پروفیسر ڈاکٹر میر حاتم صاحب، پروفیسر مسرت صاحب، پروفیسر ڈاکٹر عالم خان صاحب اور دیگر حضرات یونیورسٹی اساتذہ کی تنظیموں کے منتخب نمائندے (office bearers) رہے۔ بندہ ڈاکٹر فدا محمد باوجود ہمت نہ ہونے کے بار بار ڈاکٹروں کی مقامی و صوبائی تنظیموں کا بلا مقابلہ صدر و نائب صدر منتخب ہوا۔ اور حضرت کی دعا تھی کہ کتنے ناموافق حالات کیوں نہ ہوں کبھی الیکشن نہیں ہارا۔

طلباء میں سے پیر عبدالقیوم شاہ مرحوم، جاوید پراچہ، شمشاد، قاضی فضل اللہ، قاضی فضل واحد، مظہر سجاد، ڈاکٹر نادر شیر، وارث خان پیش پیش رہے۔ جن میں سے بعض مختلف تنظیموں کے صدر و سیکرٹری بھی رہے۔ پیر عبدالقیوم شاہ ایجوکیشن کالج کے صدر منتخب ہوئے۔ جاوید پراچہ اور شمشاد پشاور یونیورسٹی سٹوڈنٹ یونین کے بتدریج جنرل سیکرٹری و لٹریری سیکرٹری منتخب ہوئے۔ یہی طلباء یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد حکومت کے مختلف شعبوں میں افسر بنے یا ملکی سطح پر اہم کردار ادا کیا۔ قاضی فضلِ واحد ورلڈ ڈیویلپمنٹ اکیڈمی

میں ڈپٹی ڈائریکٹر ہوئے۔ مظہر سجاد انتظامیہ میں مجسٹریٹ ہوئے۔ جبکہ شمشاد محکمہ جنگلات میں افسر بنے۔ قاضی فضل اللہ نے اسی یونیورسٹی کی تربیت کے نتیجے میں ملکی سطح پر جمیعۃ العلمائے اسلام کے ٹکٹ پر جبکہ جاوید پراچہ نے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے الیکشن لڑے اور ممبر منتخب ہوئے۔ اس طرح باطل کے سامنے مضبوط لوگوں کو کھڑا کیا گیا اور اہل باطل کو اندازہ ہوا کہ ان کے مقابلے میں مضبوط قوت موجود ہے۔

تحریکوں میں سے تین تحریکات کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں۔

۱۹۷۳ء میں ختم نبوت کی ملک گیر تحریک چلی۔ یہ وقت ملک کے لیے بڑا مشکل تھا۔ فضائی اور بحری افواج دونوں کے سربراہ قادیانی تھے۔ صرف بری فوج کا سربراہ ٹکا خان قادیانی نہیں تھا۔ تاہم کوئی خاص اسلامی جذبات والا بھی نہیں تھا۔ اس اثناء میں علماء کو پورے ملک کے ڈوب جانے کا خطرہ درپیش ہوا۔ بغیر کسی پروگرام اور منصوبے کے تحریک چل پڑی۔ اس کی تفصیل جو بندہ کی معلومات میں ہے یوں ہے کہ بندہ کے ایک دوست ڈاکٹر اسلم صاحب پروفیسر جغرافیہ ہوتے تھے۔ وہ اکثر اسلام آباد آتے جاتے رہتے تھے اور ان کا گھر بھی وہیں تھا۔ اچھے ریسرچ ورکر ہونے کی وجہ سے مختلف سائنسی ادارے انہیں بلاتے تھے۔ ایک دفعہ وہ آئے۔ وہ مجھے اکثر پیر صاحب کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ پیر صاحب آج کل قادیانی بھٹو کو تنگ کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ہم نے ۱۹۷۱ء کے الیکشن میں تمہارا ساتھ دیا ہے لہٰذا ہمیں مراعات دو۔ ان کو مراعات دینا اس کے سیاسی مستقبل کے خلاف ہے لہٰذا ان کے بارے میں کچھ کرے گا۔ چنانچہ قادیانیوں نے اس سے شکایتیں کیں کہ لوگ ہمیں تنگ کرتے ہیں، آوازیں کستے ہیں۔ خصوصاً ربوہ (موجودہ چناب نگر) پر آوازے کسے جاتے ہیں۔ اس نے زبانی طور پر ان سے کہا کہ کوئی آوازے کسے تو انہیں ٹھیک کر دو۔ انہی دنوں ربوہ (موجودہ چناب نگر) سٹیشن سے نشتر میڈیکل کالج ملتان کے طلباء کا جو مطالعاتی سفر (Tour) پر تھے گذر ہوا۔ انہوں نے آوازے کسے، قادیانیوں نے ان کی پٹائی کی۔ یہ خبر سنسر کی گئی اور اخباروں میں نہیں آئی۔ لیکن افواہ کے طور پر یہ خبر پورے ملک میں پھیل گئی کہ طلباء کی زبانیں قادیانیوں نے کاٹ لی ہیں اور ان کو اس بری طرح پیٹا گیا ہے کہ معذور کر کے رکھ دیا ہے۔ اس پر سخت ردعمل ہوا اور پورے ملک میں تحریک چل پڑی۔ یونیورسٹی میں بھی جلسے جلوس شروع ہوئے۔ تحریک کی پہلی رات اسلامی جمیعت طلباء نے جلوس نکالے جنھیں پذیرائی نہ ہوئی۔ اتفاق کی بات کہ ان دنوں تحریک ختم نبوت کے عالمی امیر مولانا یوسف بنوری صاحب بیماری کی وجہ سے بحرین (سوات) میں قیام پذیر تھے۔ ساتھ ہی حضرت مولانا صاحب بھی وہاں تھے۔ بندہ اسی

سال بطور استاد میڈیکل کالج میں آیا تھا اور سب سے جونیئر تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ آیا تحریک میں حصہ لیا جائے یا نہ لیا جائے۔ رات کو بندہ نے خواب میں حضرت مولانا اور حضرت مولانا عبداللہ درخواستی صاحب کو دیکھا۔ تعبیر پر غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ اس تحریک میں ہمارے ساتھیوں کو بھی حصہ لینا ہوگا۔ دوسرے سیاسی لوگوں کی غیر مقبولیت، اور ان کا جذباتی طریقہ کار تحریک کے لیے نقصان دہ تھا۔ جگہ جگہ بلا تحقیق املاک کے جلانے اور آدمیوں پر تشدّد کے واقعات بھی سامنے آئے۔ اس پر یہی دل میں آیا کہ ہمارے ساتھیوں کو شامل ہو کر تحریک کو پر امن ڈگر پر چلانے کی کوشش کرنا چاہئے۔ کیونکہ بندہ پر یہ بات واضح تھی کہ شریعت کی رو سے احتجاج (Protest) اور ناگواری (Resentment) کے اظہار کے لیے پر امن تحریک ضروری ہے۔ لیکن بلا تحقیق کسی کے جان و مال کو نقصان پہنچانا شریعت کی رو سے جائز نہیں۔ چنانچہ اسی طرح کیا۔

ہمارے ساتھیوں کی وجہ سے تحریک میں قوت پیدا ہوگئی اس کے ساتھ ہی تحریک میں اعتدال آ گیا۔ دوسرے ہی دن حضرت مولانا بحرین سے واپس تشریف لائے اور بندہ کو یاد فرمایا۔ پوچھا کہ حالات و واقعات کیا ہیں۔ بندہ نے مختصراً عرض کر دیا۔ تسلی اور خوشی کا اظہار فرمایا۔ لوگوں کو آپ کی آمد کا پتہ چلا تو مرد اور عورتیں آ کر اپنی حفاظت کی درخواست کرنے لگے اور قادیانیت سے اپنی برائت کا اظہار کرنے لگے۔ حضرت نے سب کو تسلی دی کہ کسی کو خلافِ شریعت کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ چنانچہ جن لوگوں کو زیادہ خطرہ تھا۔ ان کے گھروں کے آگے آدمی بھی کھڑے کروائے تاکہ حفاظت رہے۔ یہ آپ کی برکت تھی کہ پشاور یونیورسٹی جیسے ماحول میں جہاں نوجوان طلباء ہوتے ہیں کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ ہم سے پہلے جو مالی نقصان ہوا۔ وہ دین سے ناواقف لوگوں کی وجہ سے ہوا تھا۔ ہمارے ساتھیوں کے سامنے آنے سے مکمل امن و امان ہو گیا۔

طلباء نے بندہ کو بتایا کہ وہ پورے صوبے کو پشاور میں جمع کرنا چاہتے ہیں اور ختمِ نبوّت کا ایک مثالی جلسہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان بے حیثیت طلباء کے جذبات بندہ کو مجنون کی بڑ ہی نظر آئے بہر حال تین تین طلباء کی ٹولیاں ہزارہ، سوات اور ڈیرہ اسماعیل خان بھیجی گئیں حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ان طلباء نے تقریباً ایک لاکھ انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر جناح پارک پشاور میں جمع کر دیا۔ بندہ کو واضح محسوس ہوا کہ اس تحریک کو نہ تو کوئی فنڈ چلا رہا ہے اور نہ تحریک ختمِ نبوّت اس کو چلا رہی ہے بلکہ ہر طالبعلم اپنا خرچہ خود کر رہا تھا۔ تحریک کی ایسی غیبی تائید اور مقبولیت اس بات کی واضح نشاندہی کر رہی تھی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس سو سالہ پرانے فتنے کے

خاتمے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

ایک لاکھ کا انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اور سنبھالنے والا سوائے طلباء کے کوئی نہیں۔ مختلف تنظیموں کے طلباء سٹیج پر آئے اور سٹیج سنبھالنا چاہا لیکن پیپلز سٹوڈنٹ فیڈ ریشن اور پختون سٹوڈنٹ فیڈ ریشن نے اسلامی جمیعت طلبہ کو سٹیج دینے کے خلاف احتجاج کر دیا۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر حضرت کے ایک مرید میاں عبدلحلیم کا کاخیل کا تعارف کرایا۔ حضرت کی برکت سے سب لوگ اس کی صدارت پر متفق ہو گئے اور تقاریر شروع ہو گئیں۔ لیکن اس جلسے کو قابو کرنا طلباء کے بس کی بات نہیں تھی۔ اللہ نے غیبی مدد فرمائی اور جمیعت علمائے اسلام کے مولانا محمد امیر بجلی گھر صاحب کسی طرح پہنچ گئے ان کی خداداد قوّت تقریر کام آئی اور جلسہ ایسا کامیاب ہوا کہ حکومت کو کان ہو گئے۔

طلباء کے جلوس انتہائی منظم اور پُر امن تھے لیکن حکومت نے لاٹھی چارج وغیرہ کر کے کئی طلباء کو زخمی کر دیا اور کئی ایک کو جیلوں میں ڈال دیا۔ ان زخمی ہونے والے اور جیل میں جانے والے طلباء کے بارے میں خاص اہل اللہ کو بشارتیں ہوئیں، ایک مجذوب کوئی اشارہ غیبی پا کر ایک طالبعلم کی زیارت وملاقات کے لیے آئے۔ ان سارے طلباء کے بارے میں ایسی دعائیں قبول ہوئیں کہ سارے کے سارے اہم پوسٹوں پر ہیں اور آسودہ حال ہیں۔ اور انکی دینی حالت قابل رشک ہے۔

دوسری تحریک: جس وقت سیٹھی اسماعیل صاحب وائس چانسلر ہوئے، انہوں نے یورپ کے دورے میں ایک فلم The Message (دی میسج) کہیں دیکھی اور اس کا ویڈیو کیسٹ ساتھ لے آئے اور یہ فلم یونیورسٹی کے اساتذہ کو جمع کر کے دکھا دی۔ اس فلم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کی زندگی کو فلمایا گیا تھا۔ ان دنوں حضرت مولاناؒ حج پر تھے۔ بندہ کو بہت ناگواری ہوئی۔ ایک دینی سیاسی جماعت سیٹھی صاحب کو ہٹانا چاہتی تھی۔ انہوں نے اس واقعے کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یونیورسٹی میں تحریک گرم ہوگئی۔ ساتھیوں کے پوچھنے پر بندہ نے عرض کیا کہ اچھا ہے کہ کوئی اس پر ناگواری کا اظہار کرے۔ جب حالات بگڑنے لگے تو سیٹھی صاحب نے بندہ کو بلایا اور اس سلسلہ میں کچھ مدد کرنے کے لیے کہا۔ بندہ نے سیٹھی صاحب سے عرض کیا کہ یہ کام تو آپ نے اچھا نہیں کیا۔ اس پر اللہ کے حضور توبہ کریں اور ایک تحریری توبہ نامہ مجھے لکھ کر دیں تو میں طلباء کو منالوں گا۔ وہ حق پرست آدمی تھے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ ان کی تحریر لے کر بندہ آیا اور طلباء کی تنظیموں کو بلایا۔ جمیعۃ طلباء اسلام اور اسلامی جمیعت طلباء سے بندہ نے کہا کہ آپ یہ تحریک ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر اور اللہ کی

رضا کی خاطر چلا رہے ہیں؟ سب نے ہاں کہا۔ اس پر بندہ نے سب کو بتایا کہ اس آدمی سے غلطی ہوگئی تھی۔ غلطی کا علاج اعتراف اور توبہ ہے وہ اس نے کر لی ہے اور یہ تحریر بندہ کو لکھ کر دی ہے تو اب ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم اس کے خلاف تحریک چلائیں۔ اس بات کو جمیعۃ طلباء اسلام نے مان لیا لیکن اسلامی جمیعت طلباء والے وائس چانسلر کو ہٹانے پر تلے ہوئے تھے وہ نہ مانے۔ خیر بندہ نے وائس چانسلر کے پاس جا کر کہا کہ جمیعت طلباء اسلام تو شامل نہیں ہوگی صرف اسلامی جمیعت طلباء کا چھوٹا سا جلوس ہو جائے گا۔ بندہ کی اپنی رائے یہ تھی کہ احتجاجی جلوس ہو اور بس خیر ہو جائے۔ صبح سویرے جاوید ابراہیم پراچہ بندہ کے پاس آیا اور اس نے یہ کہا کہ رات بارہ بجے پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن اور پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن والے جمع تھے اور کہہ رہے تھے کہ انہیں یونیورسٹی انتظامیہ نے کہا ہے کہ کل صرف جماعتیے ہوں گے ان کی خوب پٹائی کی جائے۔ بندہ کو یہ بات بہت ناگوار گذری کہ ایک دینی مسئلے پر جلوس نکالا جائے اور جلوس نکالنے والوں کی پٹائی کر کے انھیں ذلیل کر دیا جائے لہٰذا بندہ اور جاوید ابراہیم پراچہ نے یہ طے کیا کہ صبح وائس چانسلر کو اطلاع دی جائے کہ ہم نے جو آپ سے رات وعدہ کیا تھا ہم اب لوگوں کو کنٹرول نہیں کر سکتے۔ چنانچہ دوسرے دن جو جلوس نکلا تو پختون اور پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن نے حملہ کر دیا۔ جوں ہی حملہ ہوا تو اتنا سخت ردعمل ہوا کہ ہر دو طبقات کو سڑکوں پر بھاگنا پڑا۔ پختون والوں نے فائرنگ بھی کی۔ پختون اور پیپلز والے حیران تھے کہ اتنا سخت ردعمل ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔ بعد میں ان کو پتہ چلا کہ مقابلے میں صرف اسلامی جمیعت طلباء نہیں تھی بلکہ حضرت مولانا کے مریدین اور جمیعت طلباء اسلام والے بھی تھے تو اس سے حالات بہت خراب ہوگئے۔ پیپلز پختون ہر دو طبقے بندہ کے پاس آ کر اپنی صفائی پیش کرنے لگے کہ جی ہمیں غلط فہمی ہوئی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ کوئی سیاسی سٹنٹ ہے جسے اسلامی جمیعت طلباء چلا رہی ہے۔ اگر یہ واقعی دینی مسئلہ تھا تو ہمیں افسوس ہے۔ اگر آپ بروقت دینی مسائل ہمیں بھی سمجھا دیا کریں تو ہم بھی آپ کا ساتھ دینے میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے۔

حالات اتنے خراب ہوگئے کہ بات فضل حق گورنر تک پہنچ گئی۔ اس اثناء میں حضرت مولانا حج سے واپس آ گئے۔ سیٹھی اسماعیل صاحب حاضر ہوئے اور امداد کے لیے عرض کی۔ گورنر سے مذاکرات کے لیے خاص طور پر پروفیسر مسرت حسین صاحب کو بھیجا۔ مسرت صاحب انتھک کوشش کرتے رہے اور طلباء تنظیموں میں صلح صفائی کروائی۔ گورنر صاحب سے بھی مذاکرات کیے، یوں یہ کیس رفع دفع ہوا اور سیٹھی صاحب کے لیے حالات درست ہوئے۔

ایک تحریک عیسائیوں کے گرجا کے سلسلہ کی ہے۔عیسائیوں نے پشاور یونیورسٹی کے اندر سرکاری زمین پر گرجا کی تعمیر شروع کردی۔حضرت مولانا کا مؤقف یہ تھا کہ اسلامی مملکت میں اسلامی سرکاری زمین پر کوئی غیر مسلم اپنی عبادت گاہ تعمیر نہیں کرسکتا (یہ مسئلہ ایسے ہی فقہ کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے)۔لیکن انتظامیہ اپنی دینی ناواقفیّت کی وجہ سے اس کی اجازت دے بیٹھی۔حضرت مولاناؒ کو بہت افسوس تھا کہ اگر یہ گرجا بن گیا تو ہر باطل فرقہ یہاں اپنی عبادت گاہ بنانے کا مطالبہ کرے گا۔اس طرح یہ حسّاس جگہ فرقہ واریت کا مرکز بن کر مستقبل کے لیے بڑے بڑے مسائل کی آماجگاہ بن جائے گی۔اس کے لیے آپ خاص طور پر دست بہ دعا ہوئے۔پشاور یونیورسٹی کے طلباء کو جب حضرت کے حلقے کی ناگواری کا علم ہوا تو ایک جلوس کی شکل میں جاکر گرجے کو زمین بوس کرآئے۔انتظامیہ اور پولیس کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔اسکے بعد کوئی باطل طبقہ پشاور یونیورسٹی کیمپس میں عبادت گاہ بنانے کی جرأت نہ کرسکا۔

ایک بار پھر عیسائیوں نے کوشش کی اور اُن کا مرکزی وزیر پیٹر جان سہوترا پشاور یونیورسٹی آیا اور اس نے یونیورسٹی کی انتظامیہ اور سینڈیکیٹ وغیرہ سے گرجے کی منظوری کروالی۔تعمیر سے پہلے وائس چانسلر ڈاکٹر پروفیسر محمد انور خان کا خیال ہوا کہ اس پر مشاورتی کمیٹی برائے امور مذہبی کو بھی متفق کردیا جائے۔میٹنگ سے پہلے حضرت مولاناؒ نے ایک خط وائس چانسلر کو بدست پروفیسر، ڈاکٹر، مولوی نعمان صاحب بھیجا۔بندہ مشاورتی کمیٹی کا ممبر ہونے کی وجہ سے میٹنگ میں حاضر ہوا۔وائس چانسلر کو بندہ نے واضح طور پر بتایا کہ یہ آخرت کا مسئلہ ہے۔ہم آپ کو ایسی کوئی رائے نہیں دیں گے جس میں ہماری اور آپکی آخرت خراب ہو۔اس پر وائس چانسلر چونکے اور انھوں نے کہا کہ آخرت کو ہم نے بھی جانا ہے۔میں ایسا کوئی اقدام نہیں کروں گا جس میں میری آخرت خراب ہو۔چنانچہ اس نے وعدہ کیا کہ اگرچہ اس کو سینڈیکیٹ کی منظوری حاصل ہوچکی ہے لیکن میں اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرکے کارروائی (Minutes) سے اس کو نکال دوں گا۔چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔

ایک بار انجینیرنگ کالج میں فواد نامی ایک قادیانی لڑکا الیکشن کے لیے کھڑا ہوگیا۔اس نے مسلمان طلباء کے ایک مضبوط اور فعال گروہ کو اپنا ہمنوا بنالیا۔سمجھدار طلباء نے مخالفت کی، اس پر اس کے حواری حضرت مولانا کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مولانا صاحب الیکشن کے بہانے ایک قادیانی ہاتھ آرہا ہے، کیوں نہ اسے صدر بنالیا جائے۔مولانا صاحبؒ نے فرمایا کہ کہ برخوردار انکے ہتھکنڈوں کا آپ کو پتہ نہیں۔آپ

اتنے فعال لوگ ہیں کیا آپ میں سے کسی میں اتنی ہمت اور جرأت نہیں کہ آپ آگے بڑھ کر یہ الیکشن لڑیں اور قطعاً اس کی اجازت نہ دی۔ چنانچہ اس کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

پشاور یونیورسٹی کا سنیما: پشاور یونیورسٹی میں اسماعیلیہ فرقہ کے آغا خان نے ایک آڈیٹوریم آغا خان آڈیٹوریم کے نام سے بنایا۔ جسے بطور سنیما استعمال کیا جاتا تھا۔ سارے دیندار لوگوں کی طبیعت پر یہ چیز بوجھ تھی اور اس کو بند کرنا چاہتے تھے۔ بندہ نے حضرت مولانا کو متوجہ کیا، دعائیں ہوتی رہیں بندہ نے ایک عرضداشت لکھی اور اس پر لوگوں سے دستخط لینا شروع کیے۔ بعض دینی حلقوں نے مذاق اڑایا کہ دیکھیں گے کہ دستخطوں سے کیسے سنیما بند کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے غیب سے سامان پیدا فرمایا پروفیسر عبدالعلی خان صاحب جب دوسری بار وائس چانسلر بن کر پشاور یونیورسٹی آئے تو انھوں نے اپنی کچھ انتظامی مصلحتوں کے تحت سنیما کو بند کر دیا۔ وہ تھوڑا عرصہ وائس چانسلر رہ کر چلے گئے اس اثناء میں طلباء کی یونین کے الیکشن ہوئے پیپلز سٹوڈنٹ فیڈریشن نے انتخابی وعدوں میں سنیما کھولنے کا بھی وعدہ کیا ہوا تھا۔ اس الیکشن میں حضرت کی ایماء پر بندہ نے جمیعۃ طلباء اسلام سے الیکشن لڑوایا تھا اور قاضی فضل واحد و مظہر سجاد بالترتیب صدر اور جنرل سیکرٹری کے امیدوار تھے۔ پیپلز سٹوڈنٹ فیڈریشن والوں نے حسب وعدہ اس وقت کے وائس چانسلر پروفیسر رشید احمد طاہر خیلی سے رابطہ کیا اور سنیما کھولنے کا مطالبہ کیا۔ بندہ کو اس کی اطلاع ہوئی بندہ نے جمیعۃ طلباء اسلام والوں کو بلایا اور ان کو سمجھایا کہ یونیورسٹی کے بازاروں، چوکوں، کالجوں اور ڈیپارٹمنٹس میں کھڑے ہو کر خوب دانت پیستے ہوئے اور ڈاڑھیوں کو دانتوں میں چباتے ہوئے خوب جذباتی انداز میں بولو کہ یہ سنیما تب کھلے گا جب ہماری لاشیں گر جائیں گی۔ خاص طور سے جہاں پولیس اور سی آئی ڈی والے ہوں وہاں خوب آنکھیں سرخ کر کے بولو تاکہ یہ بات رپورٹ ہو جائے۔ طلباء اپنی نوعمری کی وجہ سے پوچھتے تھے کہ اگر ہم گرفتار ہوئے اور ہم پر کیس چلے تو ہمارا کیا ہوگا؟ بندہ نے ان کو بتایا کہ مجھے اگر اپنی جان فروخت کرنا پڑی تو کروں گا لیکن تم کو اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ مظہر سجاد کو بندہ نے وائس چانسلر رشید احمد طاہر خیلی صاحب کے پاس بھیجا اور سمجھایا کہ بغیر کسی کی اجازت لیے جھٹکے سے دروازہ کھول کر سیدھا طاہر خیلی صاحب کے سامنے کھڑے ہو جانا اور خوب جذباتی انداز میں کہنا ''وائس چانسلر صاحب مجھے اس الیکشن میں دو سو آدمیوں نے ووٹ دیئے ہیں آپ اس وقت تک سنیما نہیں کھول سکتے جب تک یہ دو سو لاشیں گر نہ جائیں''۔ طاہر خیلی صاحب مردم شناس اور موقع شناس آدمی تھے وہ مسئلے کی نزاکت کو بھانپ گئے اور انھوں نے سنیما کھولنے سے صاف انکار کر دیا۔

عالم اسلام کے مسائل:

عالم اسلام کے عالمی مسائل و دینی ترجیحات کا آپ کو بہت گہرا اور عملی فہم ہوتا تھا۔ بعض اوقات آپ کی نگاہ وہاں تک کام کر رہی ہوتی تھی جہاں تک عام سیاسی پارٹیوں اور زعماء بلکہ دینی سیاسی پارٹیوں کی بھی دسترس نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ حضرت درخواستی صاحب اور مفتی محمود صاحب کی وفات کے بعد یہ بات واضح طور پر محسوس ہوئی۔ جس وقت ساری قوم عراق کے صدر صدام کے حق میں سڑکوں پر نکل کر چیخ و پکار کر رہی تھی اور آپ کے خلفاء میں سے بندہ خود، حسن خان صاحب اور نعمان صاحب ان کے ہمنوا بنے ہوئے تھے حضرت مولانا نے اپنی خداداد بصیرت کے ذریعے اس کو دنیائے اسلام کے لیے مفید نہ سمجھا۔ ہم تینوں افراد پر حضرت نے کچھ گرفت بھی نہیں فرمائی کیونکہ حضرت بہت کھلے دل والی شخصیت تھے اور اپنے خلفاء کے وہ اختلافات جو عقائد و اعمال میں تو نہ ہوں لیکن انتظامی و سیاسی امور میں ہوں ان پر ناراضگی اور ناگواری نہیں فرماتے تھے۔ بعد کے حالات نے بتا دیا کہ صدام حسین کی ترتیب دنیائے اسلام کے لیے مہلک ثابت ہوئی۔ ۱۹۶۵ء کی پاک و ہند جنگ میں آپ نے اپنی دعاؤں اور مواعظ کے ذریعے اہل پاکستان و افواج پاکستان کے حوصلے بلند کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ ۱۹۷۱ء کی پاک و ہند جنگ میں حکومت پاکستان میڈیکل کالج سے فارغ ہونے والے ڈاکٹروں کو لازمی طور سے فوج میں بھرتی کر رہی تھی، جس سے ڈاکٹر ناگواری محسوس کر رہے تھے لیکن آپ نے اپنے مرید ڈاکٹر صاحبان کو جہاد کی نیت کر کے بھرتی ہونے کی تلقین کی۔ سقوطِ مشرقی پاکستان پر آپ کو اتنا غم و اندوہ محسوس ہوا کہ سات دن تک روتے رہے۔ مسئلہ فلسطین پر ساری عمر آپ تڑپتے رہے۔ پشاور یونیورسٹی میں پڑھنے والے فلسطینی طلباء سے آپ نے خاص روابط رکھے اور ان کی دینی تربیت پر خاص توجہ فرمائی۔ ۱۹۷۹ء میں افغانستان کا جہاد شروع ہوا تو ہر لحاظ سے اس کے لیے فکر مند ہوئے اور اپنی بساط کے مطابق مالی و جانی تعاون کیا۔ جب تک روسی فوج رہی آپ کے مدرسے میں مجاہدین کا ایک تربیتی مرکز بھی رہا۔

سلسلۂ بیعت:

حضرت مولاناؒ کی زیادہ توانائی جان، مال اور وقت تبلیغی جماعت کی سرگرمیوں میں ہی استعمال ہوا۔ اس کے ساتھ بیعت کا سلسلہ بھی چلایا اگرچہ وہ محدود پیمانے پر رہا۔ لیکن اللہ نے ان کے اخلاص، مجاہدات اور

آنے والوں کے ساتھ محبت کی وجہ سے کافی برکت عطا فرمائی۔ اندرون ملک اور بیرون ملک ہزاروں افراد بیعت ہوئے۔ان میں سے کئی تو آپ کے اتباع میں تبلیغی جماعت میں کام کرتے رہے اور تھوڑا تھوڑا وقت نکال کر تربیت اور ذکرواذکار میں بھی لگے۔ان کی زندگیاں بدل گئیں اور اندرون و بیرون ملک کئی تبلیغی مراکز میں ذمہ دار حیثیت سے ان کے روح رواں ہیں۔ان کا فہم اور تجربہ،خلوص اور جامعیت ان حضرات سے واضح طور پر زیادہ نظر آتا ہے جو سلاسل کے تربیتی نظام سے گذرے بغیر چل رہے ہیں۔

سلسلہ کے رخ کے کام میں عصر تا عشاء مجلس ہوتی تھی،جس کے بیانات اور تاثیر کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ جب صحت کمزور ہوگئی تو مجلس عصر تا مغرب کردی گئی۔جس میں خوب جوش وخروش، رقت، سوز وگداز ،علمی استدلال کے ساتھ بات ہوتی تھی اور لطائف وظرائف سے بھی مزین ہوتی تھی۔ابھی مجمع جوش وخروش سے نعرے لگانے کے قریب ہورہا ہے تو تھوڑی دیر بعد گریہ وزاری کی طرف مائل ہیاور اچانک شگفتہ مسکراہٹ اور ہلکی ہنسی کا لطف اٹھا رہا ہے۔آخری ایام میں جب ضعف بہت بڑھ گیا۔تو بزرگوں کے ملفوظات جس میں زیادہ تر حضرت تھانویؒ کی کتب ہوتی تھیں پڑھی جاتی تھیں اور حضرت کسی کسی جگہ کچھ فرما دیتے تھے۔اس طرز پر حضرت تھانویؒ کی تربیت السالک (تین جلد)،انفاسِ عیسی،اورالافاضات الیومیہ پڑھی گئیں۔ہم لوگوں کے عرض کرنے پر خود ان کی اپنی کتاب شاہراہِ معرفت بھی ایک مرتبہ پڑھی گئی۔جن دنوں بوجہ بیماری کے بہت ضعف ہوتا تھا۔صرف نماز کے اوقات میں مجمع میں شمولیت فرماتے تھے اور مجمع صرف زیارت سے مستفید ہو جاتا تھا۔واضح طور پر نظر آتا تھا کہ فیض کے لیے کلام کا سننا ہی ضروری نہیں، وہ تو آمنے سامنے ہونے سے ایک بجلی ہوتی ہے جو اندر کوند جاتی ہے۔

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق　　　وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی　　　سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

مرض الموت میں استغراق بہت زیادہ رہتا تھا۔ بیدار کر کے نماز پڑھائی جاتی تھی۔اس موقع پر اسلام آباد PIMS میں علاج کروانے کا مشورہ ہوا۔اس سفر میں لانے لے جانے کی خدمت آپ کی بھانجی کے صاحبزادے عامر نے اپنے ذمہ لی۔ روح پرواز کرنے سے پہلے اسے نظر بھر کر دیکھا اور ٹوپی وغیرہ کچھ تبرکات دیے۔ برخوردار موصوف واپس ہوئے تو دل کا حال بدلا ہوا تھا۔فوراً جا کر تبلیغی جماعت والوں کے ساتھ چار ماہ لگا لیے۔اور زندگی بدل گئی۔ واقعی

ع یک نگاہِ نازِ جاناں قیمت ایمان ماست

ترجمہ: محبوب کی ناز والی ایک نگاہ ہمارے ایمان کی قیمت ہے۔

چنانچہ تصوف کے رخ پر بھی آپ کا کام کم نہیں۔اس چالیس سالہ تربیتی دور میں تقریباً آپ سے چھبیس حضرات کو خلافت ملی۔ان میں سے ایک ساتھی کرنل ریٹائرڈ سلطان صاحب کو سلسلہ کے ساتھ مناسبت نہ رہی ان سے خلافت واپس ہوگئی۔وہ پھر کسی دوسرے سلسلے میں چلے گئے۔پچیس حضرات ان کی حیات تک سلسلہ پر قائم رہے۔اللہ تا حیات قائم رکھے اور کام لے۔پشاور یونیورسٹی میں آپ کے چالیس سالہ قیام کے دوران اس فضاء میں کوئی باطل نظریہ،عقیدہ،کوئی جعلی پیر وغیرہ پنپ نہ سکے۔

آپ کے خلفاء:

۱۔حاجی غضنفر صاحب سہروردی: موصوف لاہور کے رہنے والے ہیں۔انجنیئر نگ کی تعلیم کے لیے پشاور یونیورسٹی میں داخلہ ہوا۔حضرت سے تعارف ہوا اور بیعت ہوئے۔انجنیئر نگ کی تعلیم کے دوران چار سال حضرت کا ساتھ رہا۔خود فرمایا کہ میں بریلوی خاندان کا فرد تھا اور ہمیں یہ بتایا گیا تھا کہ دیوبندی حضرات گستاخِ رسول ہوتے ہیں۔لیکن جب حضرت کے عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور سوز وگداز کو دیکھا تو وہ نظریہ بدل گیا۔اللہ نے ذکر کا رنگ چڑھا دیا اور جلد ہی صاحب خلافت ہوئے۔سعودی عرب ملازمت کرتے رہے۔آج کل پاکستان میں ملازمت کر رہے ہیں۔حضرت مولاناؒ کی بہت زیادہ خدمت کی ہے۔رقتِ قلب اور تواضع کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔حضرت مولاناؒ سے خاص محبت ہے۔نام سن کر او رلے کر بے قرار ہو جاتے ہیں۔ملنے اور پاس بیٹھنے والا آدمی بہت محظوظ ہوتا ہے اور گرویدہ ہو جاتا ہے۔آج کل سلسلے کے سربراہ ہیں۔

۲۔پروفیسر ڈاکٹر میر حاتم صاحب: کنیڈا سے زراعت مین ایم فِل ہیں۔بعد میں پی۔ایچ۔ڈی بھی کر لی ہے۔زرعی یونیورسٹی کے پروفیسر،ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ اور فیکلٹی کے ڈین کے طور پر مختلف کام کرتے رہے ہیں۔دورانِ طالب علمی بیعت ہوئے۔بہت صاحب فہم وفراست ہیں۔پشاور میں حضرت کی خانقاہ کے امیر ہیں۔جب سے حضرت معذور ہوئے۔حج کے دوران اور مقامی دوروں میں حضرت مولاناؒ کو پیٹھ پر اٹھا کر پھراتے رہے ہیں۔موصوف کو اپنی سائنسی تحقیقات وخدمات پر حکومت پاکستان کا صدارتی ایوارڈ بھی ملا ہے۔

۳۔ پروفیسر ڈاکٹر شیر حسن صاحب : امریکہ سے پی۔ایچ۔ڈی ہیں زرعی یونیورسٹی میں پرفیسر،ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ،ڈین وغیرہ مختلف حیثیتوں سے کام کرتے رہے ہیں۔اچھے معیار کی ریسرچ کا کام کیے ہوئے ہیں

۔دوران طالب علمی بیعت ہوئے۔ بہت ذاکر شاغل ہیں۔ ہمدردی، خیر خواہی اور تواضع ان کا خاص شیوہ ہے ۔تھانوی لٹریچر خاص طور پر پڑھے ہوئے ہیں۔حضرت مولانا کی مجالس اور بیانات خاص طور سے لکھتے رہے ہیں اور کافی ذخیرہ ان کے پاس موجود ہے۔

۴۔مولوی محمد یوسف برجوی صاحب: عربی میں پی۔ایچ۔ڈی ہیں۔شعبۂ عربی پشاور یونیورسٹی میں استاد رہے۔پشاور کے علمی وروحانی خاندان کے چشم وچراغ ہیں۔انکے والد حضرت مولانا محمد یونس صاحب ان نقشبندی مشائخ میں سے ہیں جنھوں نے مضافاتِ پشاور میں دینی فضا قائم کی۔یوسف صاحب کی بے نفسی کا یہ عالم ہے کہ شعبہ عربی سے ٦٠ سال کی عمر میں ریٹائر ہونے کے بعد مدرسہ امدادالعلوم میں داخلہ لے کر دورۂ حدیث مکمل کیا۔کئی جنات کے بیماروں کو آپ کے ہاتھ پر شفا ہوئی ہے۔

۵۔ پروفیسر ڈاکٹر سراج صاحب : پی۔ایچ۔ڈی ہیں۔زرعی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔گھریلو دینی ماحول میں دینی کتب پڑھے ہوئے ہیں اور عربی کی اچھی استعداد اور ذوق رکھنے والے ہیں۔سوات کے رہنے والے ہیں۔

٦۔ پروفیسر ڈاکٹر بشیر احمد کاکاخیل: ادارۂ تعلیم وتحقیق پشاور یونیورسٹی کے ڈائیریکٹر رہے۔پی۔ایچ۔ڈی ہیں ۔پشتو کے قادرالکلام شاعر ہیں۔آج کل مولانا الیاسؒ کی تبلیغی تحریک کے مرکز رائے ونڈ میں زندگی وقف کی ہوئی ہے۔

۷۔پروفیسر خلیل صاحب: لکی مروت کے رہنے والے ہیں۔علمی خاندان کے چشم وچراغ ہیں۔والد صاحب فاضل دیوبند تھے۔گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان میں زراعت کی فیکلٹی کے ڈین ہیں۔جب سے حضرت مولاناؒ معذور ہوئے تو پیٹھ پر اٹھا کر پھرانے کی بہت خدمت کی ہے۔

۸۔ شاہ عبدالرّحیم صاحب: محکمہ زراعت کے افسر ہیں۔تبلیغی جماعت کے ساتھ بہت یکسوئی سے جم کر کام کرنے والے ہیں۔چار ماہ لگائے ہوئے ہیں۔ پیٹھ پر اٹھا کر پھرانے کی بہت خدمت کی ہے۔ بیرون ملک سفر کیا ہے۔دو بیٹوں کو فارغ التحصیل عالم بنایا ہے۔

۹۔مولوی مبارک صاحب: لکی مروت کے علاقے میں تجوڑی کے مدرسے میں مدرس ہیں۔

۱۰۔ مولوی حسین الرّحمان صاحب: محکمہ تعلیم میں کسی کالج میں عربی کے پروفیسر ہیں اور تبلیغی جماعت کے ساتھ وابستہ ہیں۔

۱۱۔ڈاکٹر پروفیسر نعمان صاحب: عربی میں پی۔ایچ۔ڈی ہیں۔ادارۂ تعلیم و تحقیق میں لیکچرر ہیں۔حضرت مولانا کا تعویذات کا فیض خاص طور پر ان کو ملا ہے۔حضرت کو پیٹھ پر اٹھا کر پھرایا ہے اور گھر میں دن رات انتھک خدمت کی ہے۔

۱۲۔حسن خان صاحب: سید خاندان سے ہیں۔پولیس میں انسپکٹر ہیں اور سینٹرل کریمینل لیبارٹری میں ڈیوٹی ہے۔خاموش طبع، ذاکر شاغل آدمی ہیں، تعلیماتِ تھانویؒ کا اچھا فہم ہے۔

۱۳۔ مولانا احمد جان صاحب: غزنی خیل لکی مروت کے مشہور اور بہت اعلی استعداد والے عالم ہیں۔کافی وقت تبلیغی جماعت کے ساتھ اندرون و بیرون ملک اسفار میں گذرا ہے۔جادو بیان مقرر ہیں۔لکی مروت میں دارلعلوم بھی چلا رہے ہیں۔جمیعۃ العلماء کے ٹکٹ پر دوبار قومی اسمبلی کا الیکشن بھی لڑا ہے۔

۱۴۔پیر حقانی مرحوم : نریاب ضلع ہنگو کے رہنے والے تھے۔باوجود ٹانگ کی معذوری کے بیساکھی کے سہارے چل کر ساری عمر تبلیغی جماعت کے ساتھ کام کیا۔حضرت مولانا کی زندگی میں ہی وفات ہوئی۔

۱۵۔مولوی محمد یوسف صاحب ہزاروی: مانسہرہ کے رہنے والے ہیں۔اسلامیات کے پروفیسر ہیں۔حضرت مولانا کے شروع دور کے تبلیغ کے رفقاء میں سے ہیں۔

۱۶۔ ڈاکٹر محمد اجمل صاحب: میڈیکل ڈاکٹر ہیں۔سعودی عرب میں ملازمت کرتے رہے ہیں۔آج کل پشاور میں مقیم ہیں۔

۱۷۔حاجی عبد القدّوس داوڑ صاحب: بجلی کے محکمہ میں ایکسین ہیں۔تبلیغی جماعت کے ساتھ جم کر کام کر رہے ہیں۔کئی حج نصیب ہوئے۔

۱۸۔حاجی عبد الرّحمان صاحب: حضرت مولانا فقیر محمد صاحب کے صاحبزادے ہیں۔حضرت مولانا کی بڑی خدمت کی ہے۔اُن کی حیات میں مدرسہ امداد العلوم کے نائب مہتمم رہے۔حضرت مولانا اشرف صاحب کی وفات کے بعد انتظامی کمیٹی نے متفقہ طور پر انھیں مہتمم مقرر کیا۔پاکستان کی سینٹ میں قبائلی علاقے کی سیٹ پر ممبر رہے ہیں۔بہت باہمت اور سخی آدمی ہیں۔

۱۹۔ حاجی عبد الودود صاحب: حضرت مولانا فقیر محمد صاحب کے صاحبزادے ہیں۔خانقاہ امدادیہ کے نائب منتظم ہیں۔تبلیغی جماعت کے ساتھ وابستہ ہیں۔

۲۰۔پروفیسر محمد حکیم صاحب: اسلامیات کے پروفیسر ہیں۔حلم و تواضع کا مجموعہ ہیں۔پاس بیٹھنے والوں کو

آخرت کی فکر نصیب ہوتی ہے۔

۲۱۔ پروفیسر مسرت حسین شاہ صاحب :اسلامیہ کالج کے پرنسپل اور انگریزی کے پروفیسر ہیں۔ انگلینڈ میں بھی تعلیم پائی ہے۔ سیّد خاندان سے ہیں۔ دنیاوی حیثیت سے بھی صاحبِ وجاہت خاندان ہے۔ والد صاحب صوبہ سرحد کے ممتاز قانون دان پیر معصوم شاہ صاحب ایک دور میں صوبہ سرحد کے وزیر اطلاعات بھی رہے۔ مسرت صاحب سلسلہ کی اچھی فہم رکھنے والے صاحب استعداد آدمی ہیں۔ تبلیغی جماعت کے ساتھ چار ماہ لگا کر اندرون و بیرون ملک اسفار کیے ہوئے ہیں۔ جدید طبقہ کے سامنے دینی بات پیش کرنے کا خاص ملکہ رکھتے ہیں۔ آج کل خانقاہی ترتیب پر کام کر رہے ہیں۔ مالدار اور جدید طبقہ ان سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ اس طبقے میں ان کا بیعت کا سلسلہ چلا ہے اور کئی لوگوں کی زندگی بدلنے کا ذریعہ بنے ہیں۔

۲۲۔ اختیار الملک صاحب : محکمہ زراعت میں افسر ہیں۔ یونیورسٹی میں طالب علمی کے زمانے میں بیعت ہوئے۔ بہت یکسوئی کے ساتھ ذکر اذکار کیے ہوئے ہیں اور طویل سلسلۂ مکاتبت کے ذریعے حضرت سے تربیت لیے ہوئے ہیں۔ کل وقتی خانقاہی ترتیب پر کام کرتے ہیں۔ دو خانقاہیں مانسہرہ اور کوزہ بانڈہ علاقہ میں ہیں۔ جان توڑ کر کام کرنے والے ہیں۔ سلسلے کے پھیلاؤ کا بہت شوق رکھتے ہیں۔ دینی مشاغل کی کثرت کی وجہ سے صحت بھی متاثر ہوگئی ہے۔ مریدوں کی تعداد کافی ہے اور کئی خلفاء بھی ہیں۔

۲۳۔ غازی مرجان صاحب: بنیادی طور پر انجنیئر ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں بیعت ہوئے۔ تبلیغی جماعت کے ساتھ چار ماہ لگا کر اس کے بعد زندگی وقف کر دی ہے۔ مدینہ منورہ میں قیام ہے۔ شب و روز تبلیغی جماعت کے کام میں مصروف ہیں۔

۲۴۔ حاجی عبدالمنّان صاحب : بنیادی طور پر انجنیئر ہیں۔ مکہ مکرمہ میں قیام ہے اور بیتُ اللہ شریف و مسجد حرام کے نگہداشت والے انجنیئر (Maintenance Engineer) ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں بیعت ہوئے۔ بابِ رحمت کے سامنے ترکی برآمدہ میں فجر تا اشراق اور عصر تا عشاء مجلس ہوتی ہے۔ پوری دنیا کے علماء و فضلاء کے ساتھ ان کا رابطہ رہتا ہے۔ آنے والے حاجیوں کی خوب خدمت کرتے ہیں۔ عالمی سطح پر لوگ بیعت ہوئے ہیں اور اصلاح پائی ہے۔ افغانستان کی طالبان حکومت میں آپ کے ایک مرید عالم وزیر رہے۔ جمیعۃ العلماء اسلام پاکستان کے ساتھ خاص رابطہ ہے۔

۲۵۔ راقم الحروف ڈاکٹر فدا محمد: کو اجازت عطاء فرمائی۔ اللہ تعالیٰ اس نسبت کو مغفرت اور نجات آخرت کا

ذریعہ بنائے۔

خلفاء کے بارے میں حضرت کی چاہت تھی کہ وہ حضرات جو باقاعدہ درسِ نظامی کے فارغ التحصیل عالم نہیں تعلیم الاسلام اور بہشتی زیور کو بار بار پڑھ کر مسائل خوب ذہن نشین کریں۔ مفتی شفیع صاحب کی تفسیر معارف القرآن زیر مطالعہ رکھ کر اس کے مضامین کے ساتھ خوب مناسبت پیدا کریں۔ مولانا منظور نعمانی صاحب کی معارف الحدیث کو دیکھتے رہا کریں۔ اس کے ساتھ حضرت تھانویؒ کے مواعظ وملفوظات کو اوڑھنا بچھونا بنائیں۔ جو حضرات فارغ التحصیل علماء ہیں وہ درسِ قرآن اور درسِ حدیث کا اشتغال رکھتے ہوئے حضرت تھانویؒ کے مواعظ وملفوظات میں خوب انہماک کریں۔ دراصل فارغ التحصیل ہونے کی مثال ایسی ہے جیسے کسی آدمی نے پیاز، ٹماٹر، گوشت، سبزیاں، گھی اور مصالحہ جات جمع کر لیے۔ لیکن یہ قابلِ استعمال تب ہوتے ہیں جب ترتیب کے ساتھ پک کر سالن بن جائیں۔ اسی طرح مشائخ کی تربیت سے گذرنے کے بعد اور مشائخ کی وہ کتب جو انھوں نے بعد مجاہدات، ظاہری وباطنی حقائق حاصل کر کے لکھی ہیں کو پڑھنے کے بعد علم کی جمع شدہ اجناس سالن بنتی ہیں اور خوش ذائقہ، قابلِ ہضم اور قابلِ استعمال ہو جاتی ہیں۔ اس ضمن میں حضرت تھانویؒ کی تصانیف مواعظ وملفوظات کے علاوہ سید احمد شہیدؒ کی تعلیمات پر مبنی کتاب صراط مستقیم، مکتوباتِ شیخ احمدؒ سرہندی (مجدد الف ثانیؒ)، مکتوباتِ صدی (احمد یحییٰ منیریؒ)، اور احیاء العلوم (امام غزالیؒ) قابل ذکر ہیں۔

چند مشاہیر جن کا آپ کے ساتھ بیعت یا صحبت کا تعلق رہا:

اس عنوان کے تحت چند ایسے حضرات کا تذکرہ ہے جن کا آپ کے ساتھ بیعت یا صحبت کا تعلق رہا۔

ا۔ حاجی ارشد صاحب مرحوم:

حاجی صاحب ٹیلی فون کے ماہر انجینئر تھے اور ان حضرات میں سے تھے جو شروع دور میں تبلیغی جماعت کے کارکن بنے۔ ان کی وجہ سے جاپان اور امریکہ میں تبلیغ کا بہت کام ہوا اور کئی غیر مسلم مسلمان ہوئے۔ آپ حضرت جی مولانا محمد یوسفؒ کے خاص ساتھیوں میں سے تھے اور ان ہی سے بیعت تھے۔ ایک دفعہ بندہ کی موجودگی میں حضرت مولانا نے فرمایا کہ حاجی ارشد صاحب نے حضرت جی مولانا یوسف صاحب کی وفات کے بعد ذکر و اذکار اور اصلاح کا تعلق مجھ سے قائم کیا۔ حاجی صاحب آخری عمر میں کنسلٹنٹ انجینئر کے طور پر سعودی عرب چلے گئے، جہاں انھوں نے سعودی حکومت کے ڈیجیٹل نظام کے قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا

۔احرام باندھے ہوئے عمرہ کے لیے آرہے تھے کہ حادثے میں شہادت نصیب ہوئی۔

حضرت مولانا نے ان کے بارے میں فرمایا کہ ٹی بی کے علاج کے سلسلے میں ان کا ڈاڈر سنیٹوریم میں پھیپھڑے کا آپریشن (thoracoplasty) ہونا تھا جسے آپ نے بغیر نشہ کے کرایا۔ آپ نے قرآن مجید کی تلاوت شروع کی جس میں ایسی محویت ہوئی کہ درد محسوس نہیں ہوا۔

ان کے بارے میں دوسرا واقعہ مشہور ہے کہ ان کی جماعت تبلیغ کے سلسلے میں جاپان گئی تو جماعت کی ملاقات کے لیے وہاں کا ایک مہنت (مذہبی پیشوا) آیا۔ مہنت نے کہا کہ میں کئی دنوں سے خواب دیکھ رہا ہوں کہ ہمالیہ کے مہنت آنے والے ہیں، اب تمہیں میرے ساتھ مقابلہ کرنا ہوگا۔ یہ مہنت بیس فٹ کے فاصلے پر آدمی کو کھڑا کرتا تھا اور ہاتھ کا اشارہ کرتا تھا جس سے آدمی گر جاتا تھا۔ جماعت والوں نے حاجی ارشد صاحب کو کھڑا کر دیا۔ مہنت نے بہت زور لگایا لیکن حاجی صاحب کو گرا نہ سکا۔ بعد میں ساتھیوں نے حاجی صاحب سے پوچھا کہ جس وقت مہنت توجہ کر رہا تھا، آپ کیا کر رہے تھے؟ حاجی صاب نے جواب دیا کہ میں اس وقت آیۃ الکرسی خوب دھیان سے پڑھ رہا تھا۔

۲۔ سردار عبدالرشید خان صاحب:

سردار صاحب موصوف صوبہ مغربی پاکستان کے آئی جی رہے۔ بعد میں دو مرتبہ صوبہ مغربی پاکستان کی حکومت کے وزیر داخلہ رہے۔ موصوف حضرت مولانا سے بیعت ہوئے۔ بندہ کا ایک دفعہ حضرت مولانا کے ہمراہ سردار صاحب کے گھر جانا ہوا۔ بندہ کی موجودگی میں سردار صاحب کا حضرت مولانا کے گھر ان کی مجلس میں شامل ہونے کے لیے آنا ہوا۔ سردار صاحب کو حضرت کی برکت سے گوشہ نشین ہو کر دینی زندگی گذارنے کی توفیق ہوئی۔

۳۔ پیر سید معصوم شاہ صاحب:

حضرت مولانا کے خلیفہ مسرت حسین شاہ صاحب کے والد پیر معصوم شاہ صاحب صوبہ سرحد کے ماہر قانون دان تھے۔ ایک دور میں صوبہ سرحد کی حکومت کے وزیر اطلاعات رہے۔ شروع دور میں ایک نقشبندی بزرگ ڈاکٹر محمد امیر صاحب سے بیعت تھے۔ زندگی کے آخری ایام میں حضرت مولانا کی مجلس میں تشریف آوری فرمانے لگے۔ چند دنوں میں ہی زندگی کا رخ بدل گیا اور آخرت کی طرف یکسو ہو گئے۔ مرحوم کو ایک حادثہ میں شہادت کی موت نصیب ہوئی۔

۴۔ڈاکٹر غلام مرتضیٰ ملک صاحب:

ڈاکٹر صاحب اسلامیات میں پی۔ایچ۔ڈی کیے ہوئے تھے۔بہت قابل سکالر تھے۔سعودی عرب کی یونیورسٹیوں میں بطور پروفیسر تدریسی خدمات انجام دیے ہوئے تھے۔اس کے بعد حکومت پاکستان نے مختلف دینی موضوعات پر تقاریر کے لیے ان کی خدمات حاصل کیں۔ٹیلی وژن کی تقاریر کو پاکستان کے ہر مذہبی فرقہ اور ہر مکتبہ فکر کے لوگوں نے پسند کیا۔یہ تقاریر پاکستان اور دنیائے اردو میں صحیح علم وعمل کے فروغ اور فرقہ واریت ومنفی مذہبی جذبات کے خاتمے کے لیے اہم کردار ادا کرتی رہیں۔موصوف پہلے سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت تھے۔ایک مرتبہ رمضان میں پشاور یونیورسٹی تشریف لائے اور عصر کی نماز بندہ کی مسجد میں پڑھی۔ موصوف کو شاید یہ خیال ہوا کہ ان کے ٹیلی وژن کے پروگراموں کی وجہ سے بندہ ان کا واقف وشناسا ہوگا، جبکہ بندہ دیہاتی ودقیانوس ہونے کی وجہ سے ٹیلی وژن سے بالکل نابلد تھا،اس لیے پہچان نہ سکا اور وہ ملے بغیر چلے گئے۔بعد میں کسی ساتھی نے بتایا کہ مرتضیٰ صاحب مجھ سے ملنا چاہتے تھے لیکن ملے بغیر ہی چلے گئے۔غالباً ان کا مدعا یہ تھا کہ بندہ کے ذریعے حضرت مولانا صاحب کی مجلس تک پہنچیں۔خیر وہ خود ہی تشریف لے گئے، حضرت مولانا سے بیعت ہوئے، رمضان کے کچھ ایّام گذارے اور تشریف لے گئے۔ڈاکٹر صاحب کو کچھ سفاک اور پاکستان دشمن عناصر کے ہاتھوں شہادت نصیب ہوئی۔

۵۔ڈاکٹر جسٹس فدا محمد خان صاحب:

ڈاکٹر صاحب نے پشاور یونیورسٹی سے ایم۔اے کیا ہے۔اسلامیات میں پی۔ایچ۔ڈی بھی ہیں۔اسلامیہ کالج کے لیکچرر رہے۔بعد میں ایئر فورس کے موٹیویشن ڈیپارٹمنٹ کے ڈائریکٹر رہے۔وہاں سے آپ کی خدمات بطور جسٹس فیڈرل شریعت کورٹ کے لیے لے لی گئیں۔ڈاکٹر صاحب نے خود بندہ سے فرمایا کہ وہ حضرت مولانا کے شروع دور کے تبلیغ کے ساتھیوں میں سے ہیں۔بتا رہے تھے کہ حضرت مولانا کے ساتھ اسلامیہ کالج پشاور کی مسجد میں کام شروع کیا جہاں سے انتظامیہ نے نکالا۔پھر یونیورسٹی کے پاس اگریکلچر ٹریننگ انسٹیٹیوٹ کی مسجد میں کام شروع کیا، وہاں کی سرکاری انتظامیہ نے بھی نکالا۔پھر یونیورسٹی کے قریب سپین جماعت (سفید مسجد) میں کام شروع کیا۔ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ مشہور تبلیغی رہنما حاجی احمد گل کو شروع میں انھوں نے ہی دعوت دی اور حضرت مولانا اور تبلیغی جماعت سے روشناس کرایا۔ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ جس دن میری عمر پورے چالیس برس کی ہوئی اسی دن حضرت مولانا سے بیعت ہوا۔

٦۔ پروفیسر محمد حسین خان صاحب:

پرفیسر صاحب زرعی کالج کے پرنسپل اور بعد میں زرعی یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔انھیں حضرت مولانا کی مجالس میں آنے کی توفیق ہوئی۔حضرت کے ساتھ دومرتبہ حج نصیب ہوا۔بعد میں حضرت ہی کے مشورہ سے ایک نقشبندیہ بزرگ سے بیعت ہوئے اور صاحبِ خلافت ہوئے۔

۷۔میاں محمد شاہ صاحب:

میاں صاحب امریکہ سے پڑھے ہوئے تھے اور ممتاز ماہر تعلیم تھے۔پشاور یونیورسٹی کے ادارہ تعلیم و تحقیق کے ڈائریکٹر رہے۔آپ کی مجالس میں آمدورفت شروع ہوئی۔بہت خوش الحانی اور سوز وگداز سے حاجی محمد امین صاحب کی نعتیں پڑھتے تھے۔کسی طرح حاجی محمد امین صاحب کے براہ راست شاگرد بھی ہیں۔مجالس میں آنے کی وجہ سے زندگی بدلی۔مشہور شیخ الحدیث ونقشبندیہ بزرگ مفتی محمد فرید صاحب سے بیعت ہوئے اور صاحب خلافت ہوئے۔

۸۔پروفیسر ڈاکٹر شیر بہادر صاحب:

خیبر میڈیکل کالج کے پتھالوجی کے پروفیسر تھے۔امریکہ سے پڑھے ہوئے تھے۔حضرت مولانا کی مجلس میں تشریف لانے لگے۔تھوڑے ہی عرصے میں زندگی بدلی۔حضرت کے فرمانے پر تبلیغی جماعت کے ساتھ اندرون وبیرون ملک کئی سفر کیے۔

۹۔پروفیسر عبدالرؤف نوشہروی صاحب:

کیمسٹری کے پروفیسر تھے اور اپنے مضمون پر اچھا عبور رکھتے تھے۔اردو اور پشتو میں کئی کتابیں بھی لکھیں۔حضرت کی مجلس میں آنے سے زندگی بدلی۔

۱۰۔پروفیسر منور خان صاحب:

پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے پروفیسر اور صدر شعبہ تھے۔حضرت کی مجلس میں آمدورفت سے اللہ تعالیٰ نے دینی زندگی نصیب فرمائی۔

۱۱۔ڈاکٹر محمد انور صاحب:

ڈاکٹر صاحب خیبر میڈیکل کالج کے پروفیسر اور صدر شعبۂ ادویہ (farmachology department) اور بعد میں گومل میڈیکل کالج ڈیرہ اسماعیل خان کے پرنسپل رہے۔ان کے چھوٹے

بھائی حضرت سے بیعت ہوئے جو ڈاکٹر انور صاحب اور ان کے بڑے بھائی کے دین کی طرف متوجہ ہونے کا ذریعہ بنے۔ ڈاکٹر صاحب نے حضرت مولانا کی تقلید میں جم کر تبلیغی جماعت والوں کے ساتھ کام کیا اور اندرون ملک و بیرون ملک کئی لمبے سفر کیے۔

شادی:

حضرت مولاناؒ تقریباً اڑتالیس سال مجرد رہے۔ ذکر واذکار کا گہرا انہماک، سوز و گداز کا غلبہ، تبلیغی جماعت کے کام کی شب و روز مصروفیت اور اسفار، سلسلۂ بیعت کی سرگرمی اس تجرد کا سبب بنیں۔ اس عرصہ میں آپ کی والدہ مرحومہ اور آپ کی بڑی بہن جو بیوہ ہوگئی تھیں وہی گھر کا کام ایک دو زنانہ نوکرانیوں اور ایک مرد ملازم کے ساتھ سنبھالتی رہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی اپنے کاموں کو بہتر جاننے والے ہیں۔ والدہ صاحبہ اور بہن ضعیف ہونے لگیں تو غیب سے شادی کا سامان ہوا۔ آپ کی شادی مہ زارہ، علاقہ شب قدر کے سید خاندان میں ہوئی۔ یہ شادی آپ کے دیرینہ دوست میاں فقیر اللہ شاہ صاحب کے ہاں ہوئی۔ میاں فقیر اللہ شاہ صاحب مہ زارہ کی مشہور و معروف شخصیت حضرت میاں عبداللہ شاہ صاحب کے فرزند تھے۔ میاں عبداللہ شاہ صاحب جیّد عالم، شعلہ نوا مقرر، اور مجاہد شخصیت تھے۔ مشہور مجاہد فاتح کشمیر عاشق رسول حاجی محمد امینؒ صاحب کے ساتھ مل کر پشاور کا قحبہ خانہ ختم کرانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کا حوالہ حاجی صاحب کی سوانح عمری میں موجود ہے۔ تحریک پاکستان کے لیے کئی سال تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ میاں فقیر اللہ شاہ صاحب بھی فارغ التحصیل عالم اور رورل ڈیویلپمنٹ اکیڈمی میں علماء پراجیکٹ کے سپروائزر تھے۔ وسیع دستر خوان والی شخصیت تھے۔ ان کے ہاں ۱۹۷۵ء میں شادی ہوئی۔ رخصتی والے دن مشہور روحانی شخصیت مولانا عبدالحق صاحب (بانی دارالعلوم اکوڑہ خٹک) تشریف فرما تھے انھوں نے ہی نکاح پڑھانا تھا۔ وہ منظر گویا بندہ کی آنکھوں کے سامنے ہے جب حضرت مولانا عبدالحق صاحب نے دعا کے دوران فرمایا ”ایک چیونٹی کو حرم پاک جانے کا شوق ہوا وہ حرم کے کبوتر کے پیر سے چمٹ گئی یہاں تک کہ حرم کے کبوتر نے اسے حرم پہنچا ہی دیا۔ یا اللہ آج حضرت مولانا اشرف صاحب کی مثال حرم کے کبوتر کی سی ہے جبکہ ہماری مثال اس ناتواں چیونٹی کی سی ہے۔ یا اللہ تو ان کی برکت سے ہم پر فضل فرما“۔ پھر مولانا عبدالحق صاحب نے سامنے بیٹھے ہوئے یونیورسٹی کے پروفیسر حضرات پر نگاہ ڈالی بندہ کو اب تک حضرت مولانا عبدالحق صاحب کی روحانی کیفیت والی وہ نگاہ یاد ہے۔ پھر حضرت موصوفؒ نے فرمایا ” میں اس مجمع پر نور دیکھ رہا ہوں“۔

سب حضرات جب پشاور سے حضرت کے سسرالی گاؤں مہ زارہ کی طرف روانہ ہوئے تو پورے راستے میں بادلوں کا سایہ رہا جو واپسی کے دوران بھی رہا جس کی وجہ سے موسم گرما کی گرمی سے بچے رہے۔ بندہ نے ازراہ مزاح پروفیسر مغنی صاحب (صدر شعبہ نفسیات) سے عرض کیا ''مغنی صاحب آج تو پوری فضا بحمد اللہ تعالیٰ ایئر کنڈیشنڈ رہی'' مغنی صاحب کو واقعی حیرت ہوئی۔

اکیس سال اہلیہ ساتھ رہیں۔ اللہ کی قدرت کہ شادی کے تھوڑے عرصہ بعد ہی والدہ اور بہن دونوں کا انتقال ہو گیا۔ گھر کے سنبھالنے کا کام اللہ تعالیٰ نے غیب سے اہلیہ کی شکل میں کیا۔ اہلیہ آپ کی والدہ صاحبہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے خوب مہمانوں کی خدمت گذاری میں مصروف رہیں۔ وفات کے بعد بھی حضرتؒ کے دستر خوان کو اسی فراخی کے ساتھ چلایا جیسے حضرت کی زندگی میں تھا۔ متقی اور عبادت گذار خاتون ہیں حضرت کی وفات کے بعد ہفتہ وار عورتوں کے لیے ایک مجلس درس و وعظ کا بندوبست فرماتی ہیں۔

حضرت کی معاشرتی زندگی:۔

معاشرتی زندگی کے سلسلہ میں حضرت کے اپنی والدہ صاحبہ، بہنوں، بھائیوں اور ان کی اولادوں، ملازمین، مریدین، ہم عصر علماء اور مشائخ، ملازمت کے رفقائے کار، دوست احباب وغیرہ کے ساتھ تعلقات رہے۔ جو بندہ کے سامنے گذرے۔ باوجود معذور ہونے کے ساری عمر برادری کی غمی اور شادی میں نہایت پابندی سے شامل ہوئے۔ عید کے دن نماز پڑھ کر سب سے پہلے اپنی محرم عورتوں، بہنوں، بھانجیوں وغیرہ سے ملاقات کر کے پھر بھائیوں کے گھروں سے ہو کر واپس تشریف لاتے۔ اگر کوئی بیمار پڑ جاتا تو اس کے لیے دعا، ختم خواجگان، عیادت کے لیے حاضری، علاج کی فکر ڈاکٹر صاحبان کے پاس پہنچ کر یا پیغام بھیج کر سفارش کر کے اور ہر تدبیر کر کے پورا پورا حق ادا فرماتے۔ والدہ صاحبہ کے سامنے ساری عمر اس طرح رہے گویا چھوٹے بچے ہوں۔ والدہ صاحبہ اور بڑی بہن جو آپ کے ساتھ آپکے ہاں مقیم تھیں ان کے تعلقات اور اہلیہ کے تعلقات کو ایسے نبھایا کہ نہ تو والدہ کی دل آزاری ہوئی، نہ بہن کو کوئی تکلیف ہوئی اور نہ اہلیہ کو تلخ زندگی گذارنے کی نوبت آئی۔ ساری تکلیف اپنی جان پر جھیل کر سب کو خوشی کے مواقع فراہم فرماتے تھے۔ اور ''قہر درویش بر جانِ درویش'' کا عملی نمونہ پیش کرتے تھے۔ سخت ناگواری میں بھی چہرے کی شادابی اور مسکراہٹ دور نہیں ہوتی تھی۔ خاص خدّام کو ذرا سا افسردگی کا تأثر چہرے پر دیکھ کر اندازہ ہو جاتا تھا کہ غیر معمولی پریشانی ہے۔ ایسے حالات میں کوئی اور ہوتا تو چیخ و پکار کرتا لیکن آپ کے چہرے سے عام آدمی کسی تکلیف کا اندازہ تک نہیں

کر سکتا تھا۔ معذوری بڑھ جانے کے بعد علاوہ خدام کے ایک تنخواہ دار ملازم بھی رکھنا پڑا۔ اس طرح کئی تنخواہ دار ملازم رہے۔ جس نے بھی خدمت کی علاوہ روحانی فیوض اور دعاؤں کے اسے ظاہری طور پر بھی اللہ تعالیٰ نے بہت نوازا۔ خدمت سے فارغ ہونے پر اکثر کو ملازمتیں دلوائیں۔ چنانچہ ایک خادم کو انجنیئر نگ یونیورسٹی، ایک کو خیبر ٹیچنگ ہسپتال میں بعضوں کو ان کے مقامی اضلاع میں ملازم کروایا۔ بعض ملازمین نے اپنے بھائیوں اور رشتہ داروں تک کی ملازمتیں آپ کے ذریعے حاصل کیں۔ ایک خادم کی شادی خود کروائی۔ بعض اوقات خادم چھٹی لے کر جاتے تھے بالکل نہیں روکتے تھے فوراً رخصت فرما دیتے تھے۔ مکمل معذور ہونے کی وجہ سے اٹھنا بیٹھنا بھی مشکل تھا۔ بندہ کو فکر ہوتی تھی کہ اب خدمت کا کیا ہوگا۔ لیکن فرماتے تھے کہ جس اللہ نے معذور کیا ہے وہی بندوبست کرنے والا ہے۔ چنانچہ پہلا آدمی ابھی یونیورسٹی گیٹ سے باہر بھی نکلا نہیں ہوتا تھا کہ دوسرا آدمی آرہا ہوتا تھا۔

ہم عصر علماء، ہم عصریت کے حجاب کی وجہ سے ہم عصریت کا ہی رویہ رکھتے رہے۔ لیکن آپ نے اکرام، محبت اور تواضع کا رویہ رکھا۔ کبھی اپنی حیثیت نہیں جتائی۔ ہم عصر حقانی مشائخ کی بہت قدر فرماتے۔ اور اکثر کوشش فرماتے کہ بجائے اپنے، دیگر ہم عصر کاملین کی طرف لوگوں کا رجوع ہو۔ کبھی کسی جگہ مرید گھیرنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ ایک شانِ بے نیازی ہوتی تھی۔ فرماتے تھے کوئی آئے نہ آئے ہمیں کوئی فکر نہیں ہوتی۔ ایک دفعہ حاجی فضل حسین (تاجر میوہ جات اور رکن شوریٰ تبلیغی مرکز پشاور) کے ہاں دعوت تھی۔ ان کا تعلق حاجی مہربان شاہ صاحب اور ان کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا گل بادشاہ صاحب اکوڑہ خٹک سے تھا۔ حاجی صاحب مالدار اور مخیر شخص تھے۔ تبلیغ کی وجہ سے ان کا رجوع حضرت مولانا صاحبؒ کی طرف ہونے لگا تھا۔ کھانے کی ضیافت میں مولانا گل بادشاہ صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ وہ فاضل دیوبند اور مہتمم مدرسہ تھے۔ اہل نظر جانتے تھے کہ روحانی لحاظ سے ہمارے حضرت مولانا صاحبؒ مولانا گل بادشاہ صاحبؒ سے کہیں آگے تھے۔ لیکن پورے مجمع میں حاضرین کے سامنے مولانا گل بادشاہ صاحب کا ہاتھ چُوما۔ اس میں میزبانوں کے لیے اشارہ تھا کہ وہ مولانا گل بادشاہ صاحب ہی کی طرف رجوع رکھیں۔ حالانکہ مالدار خاندانوں سے مرید آنے کا مشائخ کو اگر اپنے ذاتی مفاد کے لیے شوق نہ ہو تو کم از کم سلسلہ کے دینی اخراجات کی امداد کا خیال رہتا ہے۔ اسی مجلس میں گل بادشاہ صاحب نے حاجی فضل حسین صاحب سے فرمایا کہ ہماری کتاب مکمل ہوگئی ہے اس کی اشاعت کا آپ نے بندوبست کرنا ہے۔

ملازمت میں اللہ نے صدر شعبہ بنایا۔ رفقائے کار آپ کی مشیخیت کے قائل نہیں تھے۔ اس لیے انکار ویہ عام رفقائے کار کی طرح ہوتا تھا۔ لیکن کبھی آپ نے ان سے کوئی توقع نہیں رکھی اور ہر ایک کے اکرام اور قدر و عزت کو اپنا شعار بنایا۔ ذاتی دوست و احباب کے ساتھ ایک عام عاجز آدمی کی طرح تعلقات رکھتے۔ اور اپنی مشیخیت کی بو تک ان تعلقات میں نہیں آنے دیتے تھے۔ مریدین کے ساتھ بہت شفقت اور نرمی کا برتاؤ فرماتے۔ ان کی نرمی، شفقت اور چشم پوشی کا رویہ آدمی کو پانی پانی کر دیتا تھا اور سامنے ہوتے ہی اسقدر عظیم آدمی کا اتنی نرمی شفقت تواضع اور چشم پوشی کا رویہ مرید کے عیوب کو مرید کے سامنے کر دیتا تھا۔ گویا آئینہ دیکھ لیا اور ندامت اور توبہ کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اکثر مرید غرباء اور درمیانہ طبقہ سے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت کو اپنی روزی خود کمانے کی توفیق دی تھی۔ اس لیے کسی سے ہدیہ شکرانہ کی طلب ہی نہیں تھی۔ کسی کی بہت عاجزانہ درخواست پر اس کی دلداری کے لیے اور اللہ کی رضا کے لیے اور اس بات کے پیش نظر کہ عتاب الٰہی نہ ہو، قبول فرماتے تھے۔

مجلس میں جہاں بڑے بڑے افسران (Bureaucrats) ہائی کورٹ سپریم کورٹ کے جج صاحبان، بعض اوقات وزراء، بڑے بڑے مالدار اشخاص، ڈاکٹر اور انجینئر ہوتے تھے۔ وہیں کسمپرس دہاڑی کی مزدوری کرنے والے بھی ہوتے تھے۔ کبھی غرباء نے محسوس نہیں کیا کہ بڑے لوگوں کی وجہ سے وہ نظر انداز ہو رہے ہیں۔ ہر کوئی یوں محسوس کرتا تھا گویا وہ اس کے انتظار میں بیٹھے ہیں اور اسی کے ہیں۔

شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کے رفیق

اللہ کا نام سیکھنے والوں کا سب سے زیادہ لحاظ فرماتے خواہ وہ مالدار ہو یا غریب اور اس کے علاوہ مجلس میں ہر کسی کا اس کی دینی و دنیاوی حیثیت کے لحاظ سے خیال فرماتے۔ مجلس میں آنے والا آدمی گرویدہ ہو جاتا اور اسکا بار بار آنے کو جی چاہتا تھا۔

وہ مریدین جنہوں نے آپ کی خدمت کی اور معذوری کے دوران اٹھانا بٹھانا اور پیٹھ پر اٹھا کر لانا لیجانا اور پہیوں والی کرسی (Wheel Chair) میں پھرانے کا کام کیا۔ اکثروں کو خلافتیں حاصل ہوئیں۔ بعض کو کئی کئی حج اپنے خرچے پر بوجہ خدمت کے کرائے۔ اور دنیا کے لحاظ سے بھی ان حضرات نے بہت ترقی کی۔

نعمان صاحب بالکل دیہاتی علاقے سے آ کر ایم۔ اے عربی میں داخل ہوئے۔ پہلے دن سے ہی

حضرت کی خدمت کے لیے کمر باندھ لی۔ اور دن رات خدمت کی۔ پڑھنے کا کم موقع ملتا تھا لیکن اس کے باوجود نمایاں کامیابی حاصل کی۔ روزگار کے بالکل حالات نہیں تھے کیونکہ چاروں طرف سخت مقابلہ تھا۔ ان کی خدمت کے پیش نظر آپ کہیں جانے نہیں دیتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے غیب سے یونیورسٹی پبلک سکول میں ملازمت کا بندوبست فرمایا۔ اس سے اچھی ملازمت کہیں اور دیکھنا چاہتے تھے کہ حضرت نے واضح فرمادیا کہ تمہاری لیکچررشپ اللہ سے منظور کروالی ہے۔ چنانچہ غیب سے بی۔ ایڈ کے بعد ایم۔ ایڈ کے حالات مہیا ہوئے۔ غیب سے ادارہ تعلیم و تحقیق میں لیکچررشپ ہوئی۔ اس کے بعد پی۔ ایچ۔ ڈی کا جذبہ حضرت کی برکت سے ہوا۔ جس دن ان کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے امتحان (Defence) سے فارغ ہو کر ہم سب احباب آ رہے تھے۔ تو سب لوگ کہہ رہے تھے کہ یہ پی۔ ایچ۔ ڈی حضرت مولانا کی کرامت کا ظہور ہے۔

ایک ساتھی احمد خان صاحب اسلامیہ کالج میں ایف۔ ایس۔ سی پری میڈیکل میں داخل ہوئے۔ نمبر کم آنے کی بنا پر میڈیکل کالج میں داخلہ نہ ہو سکا، دلبرداشتہ ہو کر تعلیم ہی چھوڑ دی۔ پروفیسر مسرت حسین شاہ صاحب کے ذریعے سے حضرت مولانا کی خدمت میں پہنچ گئے۔ حضرت کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے خیبر میڈیکل کالج میں لیبارٹری اسسٹنٹ کی ملازمت کا بندوبست فرمادیا۔ حضرت کی صحبت نے علمی ذوق پیدا کر دیا۔ چنانچہ بی۔ اے اور ایم۔ اے کے امتحانات پرائیوٹ پاس کر لیے۔ مقابلے کے امتحان میں بیٹھے اور سیکرٹریٹ کی ملازمت کا امتحان پاس کر لیا۔ امتحان پاس کرنے کے بعد ایک دن مجلس میں حاضر ہوئے اور بہت اداس انداز میں عرض کی کہ باوجود امتحان پاس کرنے کے پوسٹ نہ مل سکی۔ حضرت نے خوب دعا فرمائی، چند دن بعد بہت خوش خوش حاضر ہوئے اور بتایا کہ محکمے والوں نے دو پوسٹیں چھپا رکھی تھیں ان سے کم نمبر والے آدمی کی مضبوط سفارش آ گئی تھی اس کا تقرر اس وقت تک نہیں ہو سکتا تھا جب تک اس سے زیادہ نمبروں والے یعنی احمد خان صاحب کا تقرر نہ کر دیا جائے۔ یوں اللہ نے غیب سے ملازمت کا بندوبست فرمایا۔

مولوی یوسف صاحب برجوی اور بشیر احمد طارق صاحب بیعت ہوئے دونوں حضرات اسلامیہ کالجیٹ سکول پشاور یونیورسٹی میں اساتذہ تھے۔ مولوی یوسف صاحب عربی میں پی۔ ایچ۔ ڈی ہوئے اور شعبۂ عربی پشاور یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر ہو کر ریٹائر ہوئے۔

بشیر احمد طارق صاحب ادارۂ تعلیم و تحقیق پشاور یونیورسٹی سے ۱۹ گریڈ میں ریٹائر ہوئے۔

کالجیٹ سکول کے تیسرے ٹیچر میاں بشیر احمد کاکاخیل صاحب بعد بیعت کے پی۔ ایچ۔ ڈی

ہوئے اور ادارہ تعلیم وتحقیق پشاور یونیوسٹی کے ڈائریکٹر ہو کر ریٹائر ہوئے۔

حضرت کے ایک مرید فضل ودود صاحب زرعی یونیورسٹی میں کلرک ہوتے تھے۔ حضرت اکثر اُن سے مزاحاً فرمایا کرتے تھے "بابو صاحب آپ کبھی دعوت نہیں کرتے، ساری عمر میں صرف ایک مرغا کھلایا ہے جو اب تک حلق میں اذانیں دیتا ہے"۔ انھوں نے جواباً کہا "مولانا صاحب دعوت تو کروں گا لیکن ۱۷ (seve-nteen) گریڈ مانگتا ہوں"۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایم۔ اے اسلامیات کرنے کے بعد اسلامیہ کالج میں لیکچرر ہونے کے حالات پیدا فرمائے۔ غرضیکہ کئی حضرات کو آپ کی بیعت سے علمی ذوق ملا اور علاوہ روحانی فوائد کے دنیاوی ترقیاں بھی نصیب ہوئیں۔

آپ کے ایک خادم عزیز جان کشمیری کے بغیر تذکرہ نامکمل رہے گا۔ خادم مذکور عرصۂ دراز تک آپ کا خاندانی ملازم رہا۔ چوکیدارہ، سودا سلف، پیغام رسانی، مہمانوں کی خدمت، آپ کو اٹھانا بٹھانا کئی کام اس کے ذمے ہوتے تھے۔ بوڑھا اور کمزور ہو جانے کے بعد بغیر کسی کام اور خدمت کے حضرت کے ہاں ہی رہتا تھا۔ بالکل ان پڑھ، لا ابالی، ہر کسی سے بے نیاز اور اپنی طبیعت کا مالک آدمی تھا۔ بھری مجلس میں حضرت کی اور آپ کے ساتھیوں کی ڈانٹ ڈپٹ کر لیتا تھا۔ مجلس میں کبھی کبھی بڑی لے سے نعت پڑھا کرتا تھا۔

مدینے والے سے لو لگا لے مدینے والا بُلا ہی لے گا

اللہ کی شان کہ حضرت کے بالکل آخری دور میں اللہ تعالیٰ نے اس کی زندگی تبدیل فرمائی۔ کسی مالدار آدمی کا حضرت کی دعا سے کوئی مشکل کام ہوا، اس نے بطور شکرانہ حضرت کو مع چھ اور آدمیوں کے حج کروایا جس میں عزیز جان کشمیری بھی شامل تھا۔

خدمت خلق:۔

خوش اخلاقی اور خدمت خلق اولیاء اللہ کی خاص شان ہوتی ہے۔ حضرت مولانا سراپا خدمت خلق تھے۔ اللہ تعالیٰ اولیاء اللہ کو ایک برکت عطا فرماتا ہے کہ ان کے پاس آنے والوں کی مشکلات آسان کی جاتی ہیں۔ کچھ کلمات قرآن وحدیث کے پڑھ کر پھونک ماردیں تو بیماریوں سے شفا ہو جاتی ہے۔ تصرّف اور توجہ کی قوت دنیا میں مانی ہوئی چیز ہے۔ بیماریوں کا قبض کر لینا اور سلب کر لینا تصرّف اور توجہ کی قوت سے بھی ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں پر جناتی اثرات، سحر اور نظر بد وغیرہ کے اثرات سے بیماریاں ہوں اولیاء اللہ کی دعا اور قرآن و حدیث کے کلمات متبرکہ کے ذریعے سے ان کا دور ہونا دنیائے تصوّف اور دنیائے اسلام میں بلکہ اہل کفر کے

ہاں بھی مشہور و معروف ہے۔

عاملین اس چیز کو بطور فن سیکھتے ہیں۔ اور اس کے ذریعے سے مختلف کام کر کے بے اندازہ دولت کماتے ہیں۔ اور علاوہ دولت کے وجاہت وحیثیت کا لطف اٹھاتے ہیں۔

اولیاء اللہ نہ تو ان چیزوں کو مقصود بنا کر ان کے حصول کی کوشش کرتے ہیں اور نہ ان کو مال وجاہ کے حصول کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ہاں اس کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی خدمت اور لوگوں کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق جوڑنے کے ذریعہ کے طور پر استعمال فرماتے ہیں۔ چنانچہ حضرت مولاناؒ نے اپنے ظاہری اسباب مال وجان اور وقت استعمال کر کے لوگوں کے دکھ سکھ میں کام آ کر ان کی ضروریات پورا کر کے خدمت کرنے کے علاوہ مذکورہ روحانی راستے سے بھی بہت خدمت کی، اور اسے کبھی مال وجاہ کے حصول کا ذریعہ نہیں بنایا۔ جہاں بڑے افسروں اور مالداروں کے کاموں کے لیے اپنی روحانی قوت صرف کی وہاں کسمپرس، فقراء اور مساکین کے لیے بھی اس کو صرف کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ اس باب میں آپ کی کرامات کے واقعات اتنے زیادہ ہیں کہ جن جن لوگوں کے مسائل حل ہوئے ہیں اگر ان کی معلومات جمع کی جائیں تو ایک علیحدہ کتاب مرتب ہو جائے گی۔

ہم یونیورسٹی کے پروفیسر اور اساتذہ سائنسی علوم پڑھ پڑھ کر باوجود نماز روزہ اور دین داری کے اسباب ظاہری ہی کے بندے بنے رہتے ہیں اور مختلف مسائل کے حل میں ظاہری اسباب ہی ڈھونڈتے ہیں، روحانی اسباب کی طرف توجہ کم جاتی ہے۔ حالانکہ اصل چیز اللہ تعالیٰ کی معیت ہے، اور اس کا دارومدار اسباب روحانی پر ہے۔ جب معیت الٰہیہ شامل حال ہو تو اسباب ظاہری بھی موثر ہو جاتے ہیں۔ اور اگر اسباب موثر نہ ہوں تو کون ہے! جو ان سے نتائج حاصل کر سکے۔ بندہ کے سامنے آپ کے پاس لوگ دم، تعویذ اور دعا کے لیے آتے رہتے تھے۔ ہمارا سائنسی ذہن ہونے کی وجہ سے کبھی یہ خیال نہیں ہوتا تھا کہ اتنے سارے لوگ جو آتے ہیں اور ان کی تعداد زیادہ ہی ہوتی رہتی ہے تو ضرور ان کے مسائل کا کچھ حل ہو جاتا ہوگا، اس لیے آتے ہیں۔ ورنہ کون اپنا وقت ضائع کر کے کہیں جاتا ہے؟ اس بناء پر کبھی ہم نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا۔

بندہ کو پہلا تجربہ یوں ہوا کہ میڈیکل کالج میں ملازمت کے سلسلہ میں آنے کے بعد ۱۹۷۲ء کا واقعہ ہے کہ بندہ کو ایک بدنی تکلیف لاحق ہوگئی۔ دو بجے ڈیوٹی سے واپسی پر کھانا کھانے کے بعد بدن سے دم نکل جاتا تھا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی، نیند نہیں آتی تھی اور عصر تک اتنی کمزوری محسوس ہونے لگتی تھی کہ عصر کی

نماز کے لیے اپنے آپ کو گھسیٹ کر لے جاتا تھا۔ عصر کے بعد ضعف و کمزوری کی وجہ سے وہیں مصلّے پر لیٹ جاتا تھا اور اٹھنا مشکل محسوس ہوتا تھا۔ جس دن تبلیغ والے حضرات کا عصر تا عشاء بیان وگشت کا پرگرام ہوتا تھا اس دن وہ بندہ کے مصلّے کے گرد جمع ہو جاتے تھے اور کچھ سورتیں پڑھ پڑھ کر بندہ پر پھونکیں مارتے تب کہیں بندہ کی جان میں جان آتی۔ بطور ڈاکٹر اور اپنے مختلف جسمانی ٹیسٹوں کی روشنی میں بندہ کو اندازہ ہوگیا تھا کہ جسمانی بیماری نہیں ہے۔ مزید یہ کہ ماہرین کی نظر میں نفسیاتی بیماری (Psychatric disease) بھی نہیں تھی۔ تعجب ہوتا تھا کہ نہ جسمانی بیماری نہ ذہنی بیماری، آخر کیا وجہ ہے؟ حضرت مولانا صاحبؒ سے عرض کیا اس زمانے میں حضرت مولاناؒ نے اپنے خلیفہ مولوی یوسف صاحب برجوی کو اجازت عطا فرمائی ہوئی تھی۔ ان سے آپ نے فرمایا کہ ڈاکٹر فدا کی تکلیف زائل کرنے کے لیے عمل کرو۔ چنانچہ ان کی تدبیر سے تین چار دن میں ہی شفا ہوگئی۔ اس دن سے روحانی قوت اور روحانی علاج کا اندازہ ہوا۔ بندہ کی شادی ہوئی تو پہلے مہینے ہی میں اہلیہ کو سخت دماغی عارضہ لاحق ہوگیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ کوئی چار پانچ سال سے اس بیماری کا شکار ہے اور بجلی کے جھٹکوں کے علاوہ کافی دواؤں کا علاج کروایا ہوا ہے۔ حضرت مولانا صاحبؒ کو اطلاع ہوئی تو ان کو افسوس ہوا۔ بیماری کے حملے کی وجہ سے بندہ کا سالا ڈاکٹر سلطان بغیر اجازت واطلاع کے ہی بہن کو اپنے گھر لے گیا۔ حضرت نے فرمایا اگر یہ نہ لے گیا ہوتا تو ہم دم کرتے اللہ شفا عطا فرماتا۔ خیر آپ یہ دم کیا ہوا پانی لے جائیں اور اکیس دن تک یہ استعمال کریں۔ بندہ پانی تو لے گیا لیکن ساتھ ہی دوائیں بھی لے گیا۔ والد صاحب سے عرض کیا کہ یہ پانی تو حضرت نے بھیجا ہے اور ساتھ یہ دوائیں بھی لایا ہوں جو اس بیماری کا علاج ہیں۔ والد صاحب پرانے طرز کے عالم تھے اور اس بات کو جانتے تھے کہ اولیاء اللہ جب کسی بات کی ٹھان لیتے ہیں تو وہ بات اللہ کے حکم سے ضرور وجود میں آتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے صرف پانی پلایا۔ اکیس دن میں اللہ نے ایسی شفا عطا فرمائی کہ پھر ساری عمر یہ بیماری قریب نہیں آئی اور شفاءِ دائمی ہوگئی۔ بعد میں بندہ کے بڑے بیٹے کو تکلیف ہوگئی۔ ڈاکٹر حضرات نے تفصیلی علاج اور معائنہ شروع کر دیا اور کہنے لگے کہ اب اسے ساری عمر دوائی استعمال کرنی پڑے گی اور اس کی پڑھائی بھی نہیں ہو سکے گی۔ خیر حضرت کے ہاں ایک مہینہ بچہ جاتا آتا رہا تو اللہ نے مکمل شفا کر دی، میٹرک کے امتحان میں نمایاں نمبروں سے کامیاب ہوا۔ سینکڑوں ہزاروں مریض اندرون ملک و بیرون ملک سے آئے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے روحانی علاج سے انہیں شفا عطا فرمائی۔ ایک مرتبہ پروفیسر میاں محمّد شاہ صاحب (ڈائریکٹر آئی۔ ای۔ آر) کے ڈرائیور اپنے بھائی

کو لے کر آئے۔ اور بتایا کہ یہ گھر میں درخت کے نیچے سے گذر رہا تھا کہ بے ہوش ہو کر گر پڑا اور ابھی تک ہوش میں نہیں آیا۔ اس وقت آپ کے پاس قاضی محی الدّین کوہاٹ والے پروفیسر آف سرجری خیبر میڈیکل کالج پشاور آئے ہوئے تھے۔ ان سے آپ نے فرمایا کہ قاضی صاحب دیکھو مریض کو کیا ہوا ہے اور کیا کرنا چاہئے؟ انہوں نے معائنہ کر کے بتایا کہ فالج ہے۔ شاید چھ مہینے میں ہوش آ جائے۔ ان کا خیال ہوا کہ شاید دماغ کی رگ پھٹ گئی ہے یا رگ میں خون جم گیا ہے۔ یا کوئی بڑا خون کا لوتھڑا رگ میں آ گیا ہے، جس سے دماغ سن ہو گیا ہے۔ آپ نے دم کیا ایک کان میں اذان دی اور دوسرے میں اقامت پڑھی۔ اس پر مریض اٹھ بیٹھا اور کہنے لگا کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اس پر جنات کا اثر ہو گیا تھا جو اللہ کے فضل سے زائل ہو گیا ہے۔

ایک دفعہ کچھ عرب طلباء انجنیئر نگ یونیورسٹی لاہور سے آ گئے۔ ان کے ساتھ ایک طالب علم تھے، جن کی دماغی حالت گڑ بڑ ہو گئی تھی۔ ہوش و حواس جگہ پر نہ تھے، کھانے پینے سے رہ گئے تھے اور تین دن سے پیشاب نہیں کیا تھا۔ اوّل تو حضرت مولانا نے ان کے ساتھیوں سے فرمایا کہ اس کا ڈاکٹری معائنہ کیا جائے۔ معائنہ کیا گیا، ٹیسٹ کروائے گئے۔ بعض ٹیسٹ حیرت انگیز طور پر مختلف بیماریوں کی نشاندہی کر رہے تھے لیکن ان ٹیسٹوں کا آپس میں جوڑ (Co-ordination) ہو کر کسی بیماری کی تشخیص نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے بعد آپ نے اس کا روحانی علاج شروع کیا اور جنات کو جلانے کا عمل کیا۔ جس وقت آپ تعویذ کو جلا رہے تھے تو کمرے سے گوشت کے جلنے کی بو آنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اسکا پیشاب کھل گیا اور اتنا پیشاب کیا کہ کمرے کا قالین بھر گیا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ کسی جنّیہ نے اس کے پیشاب کے آلے کو منہ میں پکڑا ہوا تھا۔

ایک دفعہ بندہ بیٹھا ہوا تھا کہ ماسٹر عبداللطیف آفریدی باڑہ کے رہنے والے اپنے بھتیجے کو لے کر آئے جو کابل سے ہو کر آیا تھا اور دماغی توازن کھو بیٹھا تھا۔ آپ نے اس پر دم پڑھنا شروع کیا اور لڑکے نے رونا شروع کر دیا اور اس کا بدن بل کھانے لگا، جس طرح ڈاکٹر دماغی مریض کو بجلی کے جھٹکے دیتے ہیں۔ جب آپ نے پڑھنا بند کیا تو اس کی کیفیت بدل گئی۔ بندہ نے عرض کیا کہ آپ نے تو اس مریض کو بجلی کے جھٹکے (E-C-T) دے دیے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے شفا بخشی۔

فلائیٹ لیفٹیننٹ بشیر پبی کے رہنے والے ہیں۔ ایئر فورس میں تھے کہ ایک قسم کے کینسر (hodgkin lymphoma) میں مبتلا ہوئے۔ ارنم (کینسر ہسپتال) میں علاج شروع کیا۔ ساتھ ہی

حضرت مولاناؒ سے دم کرواتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے شفا عطا فرمائی۔ آج ۱۸ سال سے مکمل صحت یاب ہیں۔ کاروبار کررہے ہیں اور اپنا سکول چلا رہے ہیں۔ سکول کا نام حضرت مولانا صاحب کے شیخ کے نام پر سید سلیمان ندویؒ پبلک سکول رکھا ہے۔

میڈیکل کالج کے ایک طالب علم جاوید کا دماغ کا کینسر تشخیص ہوگیا۔ حضرت مولانا صاحبؒ سے دم کرواتے رہے۔ جب آپریشن ہوا اور دماغ کھولا گیا تو کینسر کی تشخیص غلط ہوئی اور فنگس (fungus) نکلا، جو ایک کم مضر بیماری ہے۔ یوں اللہ تعالیٰ نے تشخیص کو غلط کر کے جاوید کو شفا عطا فرمائی۔

بندہ کے دونوں گردوں میں پتھری کی شکایت ہوگئی۔ اتنا شدید درد ہوتا تھا کہ جس کی حقیقت ان لوگوں کو ہی پتا ہے جنہوں نے یہ درد گذارا ہوا ہے، الفاظ اس کو بیان نہیں کر سکتے۔ حضرت مولانا صاحبؒ نے دم فرمایا۔ تین پتھر پیشاب میں نکلے اور اللہ تعالیٰ نے شفا عطا فرمائی۔

یہ چند واقعات بطور نمونہ لکھے، ورنہ لاتعداد واقعات ہیں اور ہزار ہا افراد ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے آپ کی وجہ سے شفا نصیب فرمائی۔

بندہ کا آپ سے تعلق:۔

بندہ ۱۹۶۴ء میں اسلامیہ کالج میں بطور طالب علم ایف۔ ایس۔ سی میں داخل ہوا۔ ایک طالب علم نے دعوت دی کہ یہاں تبلیغی بیان ہوگا آپ بھی شامل ہوں۔ بندہ نے شمولیت کی۔ ایک بزرگ لاٹھی ٹیکتے ہوئے اور ایک ہاتھ سے ایک ساتھی کا سہارا لیتے ہوئے آ گئے اور بیان فرمانا شروع کیا۔ بیان تو کچھ سمجھ میں آیا نہیں البتہ ان کے لطیفے پسند آئے۔ اس کے کچھ دن بعد مرید الحسن مرحوم اور عبدالباری مرحوم نے بندہ کو دس دن کے لیے رائے ونڈ جانے کے لیے تیار کیا۔ بندہ کو پانچ دوسرے طلباء کے ہمراہ یہ لوگ حضرت مولانا صاحبؒ کے گھر پر لے گئے۔ ہم فرسٹ ایئر (گیارھویں جماعت) کے نوعمر لڑکے تھے۔ حضرت نے فرمایا یہ ہمارے ساتھ ہی گاڑی میں جائیں گے۔ بندہ کو دل میں خیال آیا کہ رات ہم وہیں ٹھریں گے تو ہمارے کھانے کا کیا بندوبست ہوگا۔ اس پر حضرت مولانا صاحبؒ نے محبت سے فرمایا ”کھانے کی آپ لوگ فکر نہ کریں، کھانے کا بندوبست وہاں ہے“۔ بندہ کو حیرت ہوئی کہ بندہ کے دل کی بات کا آپ نے جواب دے دیا۔ خیر دس دن گذارنے کے بعد بندہ تبلیغی تحریک کے ساتھ وابستہ ہوگیا اور خوب دل لگا کر ان حضرات کے ساتھ کام کرنے لگا۔

انہی دنوں ایک پرانے ساتھی جو زرعی یونیورسٹی میں استاد (demonstrator) تھے۔ انہوں نے بندہ سے رابطہ کیا اور سمجھایا کہ تبلیغ کا کام بڑا اصولی کام ہے اور یہاں ایک آدمی ہے جو تبلیغ کی آڑ میں پیری مریدی کر رہا ہے اور کام میں لگے ہوئے لوگوں کو اپنے پاس بٹھا دیتا ہے اور اس طرح ہماری تحریک کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ بندہ کو بہت افسوس ہوا۔ یہ پرانا ساتھی آمد و رفت کرتا رہا اور ہمارا ذہن اس طرح بناتا رہا۔ اس اثناء میں بندہ کو اپنے ہاسٹل کا امیر بھی بنا دیا گیا۔ بندہ کی طبیعت زوردار اور تحریکی تھی۔ یہ حضرات مولانا صاحبؒ کی مخالفت میں صرف ''شف شف'' کہہ رہے تھے۔ بندہ نے خوب دھڑلے سے مخالفت کی اور بجائے ''شف شف'' کہنے کے ''شفتالو'' کہہ دیا۔ اس کی اطلاع حضرت مولانا صاحبؒ کو پہنچی کہ ایک طالب علم ہے جو آپ کی بہت مخالفت کرتا ہے۔ شاہ عبدالرّحیم صاحب نے حضرت مولانا صاحب سے عرض کیا کہ حضرت یہ طالبعلم فدا محمد تو ہمارے ساتھ رہا ہوا ہے، یہ تو ہمارا آدمی تھا، یہ منفی لوگوں کے ہاتھ کیسے چڑھ گیا۔ کسی نے مجلس میں یہ بھی کہا کہ حضرت یہ بیان بڑا زوردار کرتا ہے اس دن بیان میں کہہ رہا تھا کہ مسلمان دل کا راہب اور عمل کا مجاہد ہے۔ حضرت کو یہ بات بہت پسند آئی۔ ان کی طرف سے کوئی آدمی اس منفی پراپگنڈے کا جواب دینے کے لیے ہمارے پاس نہیں آیا اور نہ ان کے پاس لے جانے کے لیے ذہن بنانے کے لیے ہمارے پاس آیا۔ لیکن واللہُ اعلم حضرت مولانا صاحبؒ نے کیا دعا مانگی کہ یہاں ہاسٹل میں ہم طلباء کے دل میں خیال ہوا کہ سنا ہے کہ یہ حضرت مولانا صاحبؒ پیری مریدی بھی کرتے ہیں اور تبلیغ کا کام بھی کرتے ہیں، ان کو کسی وقت اپنے ہاں مدعو کر کے تقریر کروائی جائے، اگر پسند نہ آئے تو مخالفت کی جائے۔ چنانچہ سب نے مل کر بندہ سے کہا کہ مولانا صاحبؒ کو بیان کے لیے مدعو کرو اور ساتھ کھانے کی دعوت بھی دو۔ بندہ جا کر ملا، بیان اور کھانے کی دعوت دی۔ مولانا صاحبؒ نے دونوں دعوتیں بخوشی منظور فرمائیں اور آ کر بیان فرمایا۔ بیان کیا کیا کہ ہاسٹل کی کایا پلٹ گئی۔ بندہ کو ڈر لگا کہ اس شخصیت کی مخالفت قطعاً نہیں کرنی چاہئے۔ اس بیان کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ہاسٹل میں تبلیغ کے کام کی خوب فضاء بن گئی۔ دو ایک دفعہ ملاقات ہوئی تو کشش محسوس ہوئی اور دل میں بات آئی کہ ایسی بزرگ شخصیت کے پاس بیٹھنا چاہئے۔ چنانچہ عصر تا عشاء کی مجلس میں بندہ نے گاہے بگاہے حاضری شروع کی، جس کا بہت زیادہ اثر طبیعت پر ہوا اور تھوڑے دنوں میں سنت والی زندگی اختیار کرنے کی توفیق ہوگئی۔ بندہ کو بیعت وغیرہ کا کچھ پتہ نہیں تھا لیکن ان دنوں بار بار خواب آنے لگے کہ بندہ مولانا صاحب کا ہاتھ پکڑ رہا ہے۔ انہی دنوں اپنے پرانے زرعی کالج والے ساتھی آئے اور ہمیں سمجھایا کہ تبلیغ والے حضرات کو

کسی جگہ بیعت نہیں ہونا چاہئے ۔ اگر بیعت ہوں تو حضرت جی انعام الحسن صاحب سے بیعت ہونا چاہئے جو تبلیغی تحریک کے عالمی امیر ہیں۔ وہ کراچی تشریف لا رہے ہیں لہٰذا وہاں پہنچ کر بیعت ہونا چاہئے۔ بندہ مع گیارہ ساتھیوں کے کراچی پہنچ گیا اور حضرت جیؒ سے بیعت کی۔ عام طور پر تبلیغی حضرات حضرت جیؒ کی بیعت برکت کے طور پر کرتے تھے۔ چونکہ حضرت بہت دور دہلی ہندوستان میں ہوتے تھے، اس لیے صحبت کا موقع ہی نہیں مل سکتا تھا۔ مکاتبت کی صورت بھی مشکل تھی، اس لیے تربیت حاصل کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اس طرح بیعت ہونے والے ساتھی پرانے حضرات کی مکمل گرفت میں رہتے تھے، جو انھیں اپنے مخصوص لگے بندھے طرز پر چلانا چاہتے تھے۔ خیر ہم نے معلومات کیں کہ بیعت کس لیے ہوتی ہے۔ تو سمجھ دار لوگوں نے بتایا کہ تربیت حاصل کرنے کے لیے اور ذکر سیکھنے کے لیے۔ اس کا ذریعہ خط و کتابت بھی ہوسکتا ہے۔ کراچی سے واپسی ہوئی، شیر حسن صاحب نے حضرت مولانا صاحبؒ سے عرض کیا کہ فدا کراچی حضرت جیؒ سے بیعت ہو آیا۔ انہوں نے اس بات کو سراہا اور ساتھ یہ فرمایا کہ ملتا آدمی کو وہیں سے ہے جہاں اس کا حصہ ہوتا ہے۔ بندہ نے باقاعدہ حضرت جیؒ سے خط و کتابت شروع کی اور تربیت کے اصول اور ذکر و اذکار پوچھنا شروع کیے۔ حضرت کمال شفقت سے جواب دیتے رہے اور ان کی دعا و توجہ کی برکت سے ذکر و اذکار میں خوب دل لگ گیا اور تبلیغ کے کام کی فکر بھی بڑھ گئی۔ اتنے میں ۱۹۷۱ء کی جنگ چھڑ گئی اور خط و کتابت بند ہوگئی۔ ہمارے ایک ساتھی نے کسی طریقہ سے حضرت جیؒ سے پوچھا کہ ہمیں باتیں پوچھنے اور تربیت لینے میں بوجہ خط و کتابت بند ہونے کے مشکل پیش آ رہی ہے، اگر آپ اجازت فرمادیں تو ہم بوقت ضرورت یہاں حضرت مولانا اشرف صاحبؒ سے پوچھ لیا کریں۔ حضرت جی مولانا انعام الحسن صاحبؒ نے بخوشی اجازت عطا فرمائی۔

اس اجازت کے بعد بندہ حضرت مولانا اشرف صاحب کی صحبت میں باقاعدہ بیٹھنے لگا۔ اس صحبت کی برکت سے تبلیغی جماعت کی وجہ سے مزاج میں جو کچھ شدت پیدا ہوگئی تھی وہ اعتدال میں بدلنے لگی۔ دین کے دوسرے شعبوں کے ساتھ جو تقابل دل میں محسوس ہونے لگا تھا بلکہ دین کے دوسرے شعبوں کو ایسے ہی فالتو کام سمجھنے لگا تھا، یہ بات دل سے نکل گئی۔ تصنیف و تالیف، مدارس، بیعت و تلقین، قانون و آئین کی بالاتری کی کوشش قتال سب چیزوں کی اپنی اپنی جگہ اہمیت محسوس ہونے لگی اور یہ خیال دل میں راسخ ہوا کہ تبلیغ کا کام، کام کی فکر سے زیادہ جان کی فکر کے لیے ہے یعنی اپنی اصلاح کے لیے ہے۔ اور یہ بات سمجھ میں آئی کہ فقط یہی کام نہیں ہے بلکہ یہ بھی کام ہے اور دین کے دوسرے شعبے بھی اہم ہیں۔

آپ کے ساتھ باقاعدہ تعلق ہو جانے کے بعد زرعی یونیورسٹی والے پرانے ساتھی اور انکی طرز کے انکے گروہ کے دوسرے ساتھی بھی بندہ کے ساتھ باوجود تبلیغ کا کام پوری تندہی سے کرنے کے جداگانہ سا سلوک کرنے لگے۔ان حضرات کی بحث زیادہ تر یہ ہوتی تھی کہ تبلیغ کا کام انبیاعلیہم السّلام کا کام ہے اور اتنا اونچا کام ہے کہ جہاں باقی لوگوں کی انتہا ہے وہاں سے ہماری ابتدا ہے۔ان حضرات کی باتوں سے اور طرز عمل سے اندازہ ہوا کہ ان کو علماء اور مشائخ سے بے نیازی حاصل ہے۔نیز یہ محسوس ہوا کہ یہ حضرات تبلیغی اور اپنا پکا ساتھی اس کو سمجھتے ہیں جو سب سے کٹ کر بلکہ سب کی نفی کر کے انکے ساتھ چلے۔زرعی یونیورسٹی والے پرانے ساتھی نے ایک دفعہ ترغیب دی اور بتایا کہ دین کا کام کرنے کی دو ترتیبیں ہیں ایک اخلاص سے کرنا اور دوسرے استخلاص سے کرنا۔اخلاص تو یہ ہے کہ اللہ کے غیر کے لیے نہ کیا جائے بلکہ صرف اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے اور استخلاص یہ ہے کہ دین کے ایک کام کے لیے خالص ہو جائے،اس کے ساتھ دوسرے دین کے کاموں کی آمیزش بھی نہ کرے۔اس سے آدمی کی قوت مجتمع ہو کر ایک جگہ استعمال ہوتی ہے،جس سے خود کو اور دینی کام کو بہت فائدہ ہوتا ہے،اس لیے تبلیغ والے حضرات کو اِدھر اُدھر علماء و مشائخ کے پاس نہیں جانا چاہئے بلکہ پرانے ساتھیوں اور مرکز کے ساتھ ہی جڑے رہنا چاہئے۔بندہ کو محسوس ہوا کہ یہ حضرات بیعت کو زائد اور اضافی چیز سمجھ رہے ہیں اور صرف تبلیغ کے کام کو مکمل تربیت کے طور پر سمجھ رہے ہیں۔خیر بندہ کو واضح محسوس ہوا کہ بیعت اضافی اور زائد چیز نہیں ہے بلکہ تبلیغ اور بیعت شخصیت کی تعمیر کے لیے ایک دوسرے کا تکملہ اور تتمہ ہیں۔بغیر بیعت کے باطنی رذائل کبر،حسد،لالچ،کینہ،ریا وغیرہ کی تفصیل سامنے نہیں آتی اور باطنی فضائل توکل،تفویض،تواضع،اخلاص وغیرہ کی سمجھ نہیں آتی۔حضرت کی صحبت سے دین کے ایسے پہلو سامنے آتے گئے کہ جن کا فہم پرانے کام کرنے والے ساتھیوں میں نہ پایا اور ایسے اعمال کی توفیق ہوئی جن کا تذکرہ پرانے ساتھیوں کے پاس نہ ملا۔بیس بیس سال کام کیے ہوئے تاجروں اور کاروباریوں سے مذاکرہ ہونے پر پتہ چلا کہ بیعِ باطل،بیعِ فاسد اور بیعِ سلم کا پتہ تک نہیں۔میراث تقسیم کرنے کا خیال تک ہی نہیں۔مشترکہ خاندانوں میں رہتے ہوئے ہر کسی کا آمدن وخرچ کا حساب کتاب ہی نہیں ہوتا،جس سے حق بہ حقدار رسید پر عمل ہو۔خود بندہ کو حضرت کی ترغیب پر دس سال تبلیغی کام سے وابستگی کے بعد قضا نمازوں کے دہرانے کی توفیق ہوئی اور انہی کی صحبت سے بندہ کے کئی متعلقین کو گزشتہ سالہا سال کی زکوٰۃ ادا کرنے کی توفیق ہوئی۔اس بات کا بھی غم ہوا کہ ایسی ضروری باتیں سامنے نہ ہوں اور زعم سب علماء اور مشائخ سے افضل ہونے کا ہو تو اس نقصان کے ازالے کی صورت کیا

ہوگی؟

اخلاص اور استخلاص کے بارے میں دو جگہ سے استفتاء کیا ایک استفتاء ایک ایسے مفتی صاحب سے کیا جو خود ایک سال لگائے ہوئے تھے۔ انھوں نے فتویٰ دیا کہ اخلاص کے حاصل کرنے کی کوشش کو استخلاص کہا جاتا ہے اور اس کوشش کے نتیجے میں جو رضائے الٰہی کا مقام حاصل ہو جائے وہ اخلاص ہے یعنی استخلاص کوشش ہے اور اخلاص نتیجہ ہے۔ ان کے علم میں اخلاص اور استخلاص کا وہ مفہوم تھا ہی نہیں جو زرعی یونیورسٹی والے پرانے ساتھی نے بتایا تھا۔ دوسرا فتویٰ مفتی شفیع صاحب کے دار العلوم سے لیا گیا جس میں انھوں نے لکھا کہ استخلاص کوئی شرعی اصطلاح نہیں ہے اور نہ دین کے ایک کام کے ساتھ دوسرے میں لگنا ناجائز ہے۔ یہ آدمی کی استعداد پر ہے کہ جتنی چیزوں کو نباہ سکے اور چلا سکے۔ بندہ کے خیال میں ایسی چیزیں جو انتظامی لحاظ سے جدا ہوں تب تو ایک ہی تنظیم سے مکمل وابستگی یکسوئی پیدا کرے گی لیکن ایسی چیزیں جو ایک دوسرے کا تکملہ اور تتمہ ہوں انکو کیسے ایک دوسرے سے جدا کیا جا سکتا ہے؟ اسکی ایسی ہی مثال ہوئی کہ ایک آدمی کی ضروریات دن کے وقت ملازمت کرنے سے نہ پوری ہوتی ہوں تو وہ شام کو مزید وقت (اوور ٹائم) لگا کر اپنی ضروریات کے پورا کرنے کا بندوبست کرتا ہے۔ یا طالبعلم سکول کالج کے اوقات میں پڑھنے کے بعد انفرادی ٹیوشن کر کے اپنی استعداد کو بڑھاتا ہے۔

اسی طرح پرانے ساتھی یہ سمجھاتے رہے کہ اپنی فضائل کی کتابوں کے علاوہ دوسری کتابیں نہیں پڑھنی چاہئیں، اس سے ذہن بدل جاتا ہے۔ ذہین آدمی کتابیں پڑھنے سے تو رکتا نہیں، راہنمائی نہ ہو تو اپنی مرضی کا مطالعہ کر کے واقعی آدمی کا ذہن بدل جاتا ہے۔ حضرت مولاناؒ ایک خاص ترتیب سے مطالعہ کرا کے آدمی کی فقہی اور تفسیری استعداد پیدا کر دیتے تھے نیز حدیث اور تصوّف سے مناسبت پیدا کر دیتے تھے۔ بندہ کا بستی نظام الدّین جا کر اور حج وغیرہ کے اسفار میں حضرت جیؒ اور حضرت پالنپوریؒ سے رابطہ بڑھا تو اندازہ ہوا کہ وہ حضرات اس کے قطعاً مخالف نہیں ہیں بلکہ اس کو سراہ رہے ہیں۔

ایک دفعہ چند فکرمند ساتھیوں نے بندہ کو ترغیب دیتے ہوئے کہا کہ خود روشنی کا منارہ بننے کی بجائے دوسروں کی فکر کرنی چاہئے۔ ایک نے کہا ادھر لوگ بے نماز مر رہے ہیں اس لیے ہمیں ترقی کیے ہوئے اونچے میناروں کی ضرورت نہیں ہے۔ خیر بندہ کے سامنے یہ بات واضح تھی کہ اس سے زیادہ مشکل فضا میں جبکہ چاروں طرف کفر تھا، جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں صحابہ کرام حسبِ استعداد ترقی کے مختلف

مدارج طے کر رہے تھے۔ اور اس وقت یہ نہیں کہا گیا تھا کہ صرف کفار کو مسلمان بنانے کی کوشش کی جائے اور باقی چیزوں کو غیر ضروری سمجھا جائے۔

اس سلسلے میں ایک اہم مضمون حضرت شیخ مولانا محمد زکریاؒ صاحب کی حکایات صحابہ میں نظر سے گذرا جسے پورا نقل کرنا بہت مفید ہے ''صحابہ کرامؓ کی ہمت بالخصوص ابتدائی زمانہ میں زیادہ تر کلمہ توحید کے پھیلانے اور کفار سے جہاد کرنے میں مشغول تھی اور وہ علمی انہماک کے لیے فارغ و یکسو نہ تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان مشاغل کے ساتھ ان کا انہماک اور شوق و شغف جس کا ثمرہ آج چودہ سو برس تک علوم قرآن و حدیث کا بقا ہے ایک کھلی ہوئی چیز ہے۔ ابتدائے اسلام کے بعد جب کچھ فراغت ان حضرات کو میسّر ہوئی اور جماعت میں بھی کچھ اضافہ ہوا تو آیت کلام اللہ '' وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ، فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ہ''(توبہ۔۱۲۲) نازل ہوئی۔ جس کا ترجمہ یہ ہے ''مسلمانوں کو یہ نہ چاہئے کہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں، سو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت جایا کرے تا کہ باقی ماندہ لوگ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتے رہیں اور تا کہ وہ قوم کو جب وہ اُن کے پاس واپس آویں ڈراویں تا کہ وہ احتیاط رکھیں''۔

حضرت شیخ ہی کی ایک دوسری تحریر سے اندازہ ہوا کہ مشائخ کے بیعت کے سلاسل دعوت الی اللہ کا ایک مستقل شعبہ ہیں۔ وہ لکھتے ہیں ''وَ مَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَ عَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ''۔ (حٰم السجدۃ۔۳۳)

ترجمہ:۔ ''اور اُس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو خدا کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔''

مفسرین نے لکھا ہے کہ جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کی طرف کسی کو بلائے وہ اس بشارت اور تعریف کا مستحق ہے۔ مثلاً انبیاء علیھم السلام معجزہ وغیرہ سے بلاتے ہیں اور علماء دلائل سے، مجاہدین تلوار سے، مؤذنین اذان سے غرض جو بھی کسی کو دعوت الی الخیر کرے وہ اس میں داخل ہے۔ خواہ اعمال ظاہرہ کی طرف بلائے یا اعمالِ باطنہ کی طرف۔ جیسا کہ مشائخ صوفیہ معرفتُ اللہ کی طرف بلاتے ہیں۔ (فضائل تبلیغ)

بندہ کا ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کا آخری سال تھا۔ ان دنوں حضرت مولانا صاحبؒ ایک انجکشن (vitamin b12) کا باقاعدہ لگواتے تھے۔ یہ انجکشن ایک عیسائی کمپوڈر آ کر لگاتا تھا جو دو روپے فیس لیتا

تھا۔اس دور میں ایم۔بی۔بی۔ایس کی ۵ روپے اور سپیشلسٹ کی ۱۶ روپے فیس ہوتی تھی۔بندہ کے محترم دوست مسرت حسین شاہ صاحب نے بندہ سے کہا کہ تم آخری سال میں ہو، اگر انجکشن لگانے کی خدمت تم شروع کر دو تو بہت اجر کا ذریعہ ہے اور حضرت کے لیے سہولت کا ذریعہ بھی کہ اس طرح عیسائی سے جان چھوٹ جائے گی۔بندہ نے کہا کہ اگر مولانا صاحبؒ فرما دیں تو مجھے کوئی مشکل نہیں۔مسرت صاحب نے فرمایا کہ بزرگ خود کسی کو بھی اپنی خدمت کا نہیں کہا کرتے، آپ خود ہی عرض کریں اور اپنی خدمت پیش کریں۔بندہ حاضرِ خدمت ہوا اور عرض کیا کہ انجکشن لگانے کی خدمت میں انجام دے سکتا ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ میرا ہاتھ Rough ہے (یعنی خاص تجربہ نہیں ہے)۔اس پر آپ نے فرمایا کہ رف نہیں رفرف ہے۔رفرف اس سیڑھی کا نام ہے جس کے ذریعے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سدرۃ المنتہیٰ سے عرشِ معلیٰ تک سفر کیا تھا۔اس پر دل خوش ہوا اور میں نے یہ خدمت شروع کر دی۔مولانا صاحبؒ بہت ہی زیادہ قدردان اور احسان کا پاس رکھنے والی شخصیت تھے، بہت زیادہ شفقت اور محبت سے پیش آنے لگے۔ڈاکٹری کے دوران کئی ابتلائیں اور آزمائشیں آتی ہیں جو سخت تقویٰ شکن اور باطن کو تباہ کرنے والی ہوتی ہیں اور عام آدمی تو کیا اچھے خاصے دیندار لوگ تباہ حال ہو جاتے ہیں۔ایک تو مخلوط تعلیم، وارڈوں میں نرسیں، مرد طلباء کا زچگی کا کورس (maternity) اور اس کے بعد ہاؤس جاب، ان سب جگہوں میں بہت زیادہ اختلاط رہتا ہے۔ہر مقام پر مولانا صاحبؒ کا تعلق آڑے آیا اور اللہ تعالیٰ نے بحفاظت ان جگہوں سے گذارا۔بعد ہاؤس جاب کے مولانا صاحب کی والدہ صاحبہ اور ہمشیرہ وغیرہ کا علاج معالجہ بھی بندہ کے ذمے ہو گیا۔اس طرح بندہ کو بہت قریب ہونے کا موقع مل گیا۔بارہا شام کا کھانا انہیں کے ہاں ہوتا اور عصر کے بعد حاضری ہو کر عشاء کے بعد واپسی ہوتی۔حضرت مولانا صاحبؒ کے مشورہ سے ہی بندہ نے میڈیکل کالج میں بطور استاد demonstrator ملازمت شروع کر دی۔یہ ملازمت بھی بہت ابتلا اور آزمائش تھی کیونکہ مخلوط تعلیم میں اختلاط بہت زیادہ ہوتا ہے۔ایک دن خیال پیدا ہوا کہ مولانا صاحبؒ سے یہ بات عرض کرنی چاہیئے کہ یا تو ایسی صورت ہو کہ اس مخلوط تعلیم میں بالکل سکون ہو جائے، ورنہ یہاں کی ملازمت کو چھوڑ دینا چاہیئے۔بندہ ان خیالات کے ساتھ شام کی مجلس میں حاضر ہوا۔ان دنوں مجلس میں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد آپ سے بے اختیار اللہ یا اِلاّ اللہ کا نعرہ نکلتا تھا، جس سے پاس بیٹھنے والوں پر بھی اثر ہوتا تھا۔چنانچہ تھوڑی دیر بعد آپ نے ایک نعرہ لگایا۔بندہ نے نعرہ کے ساتھ محسوس کیا کہ گویا ایک بجلی کا کرنٹ تھا جو بندہ کی پیشانی پر لگا اور بدن میں پھیل کر نیچے اترا یہاں تک کہ ناف

کے نیچے تک جا کر رکا۔اس کے بعد بندہ کو بہت سکون محسوس ہونے لگا۔اور حیرت ہوئی کہ جس بات کو عرض کرنے کے لیے حاضر ہوا تھا اس کے کہے بغیر ہی انہیں آ گاہی ہوئی اور مسئلہ حل ہو گیا۔اس دن واضح محسوس ہوا کہ واقعی اصل فیض دینے والی ذات اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے، مشائخ محض واسطہ ہوتے ہیں۔

اس طرح کے مواقع کے بارے میں محققین نے لکھا ہے کہ بعض اوقات متاثر ہونے والے کے حالات کا متاثر کرنے والے کو کچھ پتا نہیں ہوتا۔یہ محض ایک اللہ کا فضل ہوتا ہے، جو ہو جاتا ہے۔

فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا
نگاہ میں نہ ہو شوخی تو دلبری کیا ہے

اس کیفیت سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ حضرات نقشبندیہ لطیفۂ نفس کا محل پیشانی اور ناف کو کیوں بتاتے ہیں۔انہیں دنوں رمضان حضرت مولانا صاحبؒ کے ساتھ گذارنے کا اتفاق ہوا۔آپ کے ہاں افطار میں پچیس سے لے کر دو سو تک مہمان ہوتے تھے۔بعد افطار بندہ کا شام کا کھانا بھی انہی کے ہاں ہوتا تھا۔تراویح کا یہ معمول تھا کہ پہلے دو عشروں میں ایک ختم اور آخری عشرہ میں تین ختم کرتے،ایک پانچ یوم کا،ایک تین یوم کا اور جب تک راتیں لمبی تھیں اور سردیوں کا رمضان تھا ایک شب کا ختم ہوتا تھا۔ہماری طرح دنیا دار اور سائنسی طبیعت والوں کے لیے یہ بہت مشقت ہوتی تھی۔اکثر دور دراز سے حفاظ اور قراء آپ کی دعا لینے کی خاطر قرآن سنانے کے لیے آتے تھے۔بندہ کو آپ بزور ٹھراتے تھے۔کچھ عرصہ تو بزور ٹھرتے رہے آخر عادت بن گئی یہاں تک کہ ایک شب صرف دو رکعت میں پورا قرآن سنا۔حضرت کے خاص حافظ،ڈاکٹر حسین علی شاہ صاحب نے دو رکعت میں اس طرح سے پڑھا کہ بیس پارے پہلی رکعت میں پڑھے اور دس پارے دوسری رکعت میں۔اس کمر توڑ تراویح نے کئی نوجوانوں کو شکست دی اور وہ اٹھتے بیٹھتے رہے۔خود بندہ نے پورا قرآن کھڑے ہو کر ہی سنا۔لیکن اس دوران سخت زکام اور نزلہ کا حملہ ہوا۔ناک بہتے بہتے کپڑے بھیگ گئے۔مولانا صاحبؒ نے یہ سارا قرآن معذور ٹانگوں کے ساتھ دو زانو بیٹھے ہوئے سنا۔اس رمضان سے پہلے سال کے رمضان کی روداد بیان کرتے ہوئے شیر حسن صاحب فرماتے ہیں کہ انہی ڈاکٹر حسین علی شاہ صاحب نے ایک رکعت میں ساڑھے اکتیس پارے پڑھے اور دوسری رکعت میں تھوڑا سا پڑھ کر دو رکعت مکمل کیں۔عام طور پر لوگوں کو حیرت ہوتی تھی کہ کس طرح پورا قرآن یہ ایک ہی حالت میں بیٹھے ہوئے سن لیتے ہیں۔لیکن واقعی جب حافظ شروع کرتا تھا تو خاتمے تک مولانا صاحب پر ایک وارفتگی کی کیفیت طاری ہوتی تھی جس کی وجہ سے

تھکاوٹ اور اکتاہٹ نہیں ہوتی تھی۔ جوانوں سے زیادہ ہشاش بشاش رہتے تھے۔ اتنی لمبی راتیں اور آپ شوگر کے مریض لیکن بعض اوقات عشاء کے وضو سے فجر اور اشراق پڑھتے اور اس کے بعد قضائے حاجت کے لیے جاتے۔ رمضان میں آپ کی سخاوت، طویل تراویح، قیام اللیل بصورتِ تہجد اور آخری دس راتوں کا احیاء قرنِ اولیٰ کی یاد تازہ کرتا تھا اور اکابر کے رمضان کی یاد دلاتا تھا۔ اسلامیہ کالج کی مسجد جو ایک عرصہ تک پشاور یونیورسٹی اور اسلامیہ کالج کی واحد جامع مسجد رہی ہے، جب سے بنی اس میں کوئی اعتکاف نہیں ہوا تھا۔ اس مسجد کی تاریخ میں پہلی مرتبہ مولانا صاحبؒ نے چند ساتھی طلباء کو لے کر اعتکاف فرمایا۔ بعد میں معذوری ہوگئی جس کی وجہ سے اعتکاف مشکل ہوگیا۔

۱۹۷۵ء کے رمضان کا واقعہ ہے کہ آپ نے بعد تراویح کے نعت خوانی کروائی جس کے دوران بہت کیفیت محسوس ہوئی کئی مرتبہ آپ نے زوردار نعرہ لگایا۔ اسی کیفیت میں نعت خوانی کے بعد آپ حاضرین مجلس سے ایک ایک کر کے دریافت فرمانے لگے کہ حج پر جاتے ہو۔ کوئی ہاں میں کوئی ناں میں جواب دے رہا تھا۔ بندہ نے سوچا کہ ہاں کہنے میں کیا حرج ہے ہاں ہی کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ بندہ نے ہاں کہہ دیا۔ کیا معلوم تھا کہ یہ عام پوچھنا نہیں ہو رہا بلکہ منظوری ہو رہی ہے۔ چنانچہ عید کی چھٹیوں سے واپسی ہوئی تو مولانا صاحبؒ نے فرمایا کہ بیٹا تمہاری منظوری ہوگئی ہے۔ پیسوں کا بندوبست کرو۔ حیرت ہوئی کہ حج پر اتنی حکومتی پابندیاں اور قرعہ اندازیاں اور ہماری ایک ہاں کرنے سے منظوری ہوگئی۔ واقعی یہ مولانا صاحبؒ کی کرامت تھی جو ظہور پذیر ہوئی۔ بندہ نے اس وقت تک تین سال ملازمت کی تھی اور صرف چھ ہزار روپے والدین کو دیے تھے۔ حج کا خرچہ پشاور سے ہوائی جہاز میں ساڑھے گیارہ ہزار روپے تھا۔ والدین سے پیسوں کا مطالبہ کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی تھی۔ خیر خدا خدا کر کے گھر پر عرض کیا، سب نے بخوشی منظور کیا اور پیسوں کا بندوبست ہوا۔ اس طرح مولانا صاحبؒ سمیت ہمارا چودہ افراد کا قافلہ حج کے لیے روانہ ہوا۔ جس میں دو عورتیں اور بارہ مرد تھے۔ پشاور سے بذریعہ جہاز کراچی پہنچے۔ کراچی میں مولانا صاحبؒ کے مولانا یوسف بنوری صاحبؒ سے بہت محبت والے تعلقات تھے لہٰذا انہیں کے ہاں ٹھرنا ہوتا تھا۔ وہاں قیام ہوا۔ کراچی کے کارخانہ دار جو مولانا صاحبؒ کے مرید تھے، دعوتیں کرتے رہے۔ اس کے علاوہ ہم مدرسے کے مہمان تھے۔ بعض اوقات حضرت بنوری اپنے گھر میں بھی حضرت مولانا کی ہمارے سمیت دعوت فرماتے تھے۔ حضرت بنوریؒ مولانا صاحبؒ کی طرح صاحبِ نسبت حضرات کے مدرسہ میں قیام کی کوشش فرماتے تھے تاکہ طلباء اور اساتذہ کے سامنے دین کا عملی

نمونہ پیش ہو۔ حضرت بنوریؒ کے علاوہ مدرسہ کے طلباء اور اساتذہ مولانا صاحبؒ سے بہت محبت فرماتے تھے اور خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ اساتذہ کی سادگی، خلوص اور انہماک کو دیکھ کر دل متاثر ہوا۔ طلباء بھی سنجیدہ اور محنتی تھے۔ مدرسہ کی صفائی ستھرائی اور مطبخ (Kitchen) کا معیار دیکھ کر بلا تکلف یہ محسوس ہوا کہ ہر چیز کا معیار ہماری پشاور یونیورسٹی سے کسی صورت کم نہیں بلکہ تھوڑا زیادہ ہی ہے۔ حضرت مولانا بنوری صاحبؒ کے گھر کا نقشہ تو سلف کی یاد تازہ کرتا تھا۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں زمین پر معمولی دری اور ایک تکیہ، وہیں سب بیٹھتے تھے۔ باوجود عالمی حیثیت ہونے کے دنیا کو اپنے قریب نہیں آنے دیتے تھے۔

کراچی سے جدہ پہنچے۔ یہ آخری فلائیٹ تھی اور اس میں حکومت کے وزراء وغیرہ بھی سفر کر رہے تھے۔ جدہ کے ہوائی اڈے پر اترے۔ وزیر وزراء اپنا اپنا سامان اٹھائے کسٹم کلیر کروا رہے تھے کہ حضرت مولاناؒ کے جدہ کے مرید ہمیں لینے کے لیے پہنچ گئے اور ہمارا سامان اٹھا کر اپنے گھروں کو لے گئے۔ رات وہاں قیام ہوا۔ دوسرے دن مکہ مکرمہ روانگی ہوئی۔ اس وقت حج سردی کے موسم میں تھا۔ پاکستانی حجاج کو رہائش کا بندوبست خود کرنا ہوتا تھا۔ رہائش کے لیے تھوڑی سی پریشانی محسوس ہوئی لیکن اللہ تعالیٰ نے اچھی جگہ عطا فرما دی۔

اس دور میں سعودی عرب کی مالداری نئی نئی شروع ہوئی تھی۔ زیادہ ترقیاتی کام نہیں ہوئے تھے۔ آب زمزم کا ڈول والا کنواں بھی موجود تھا۔ اگرچہ اب راستہ بند کر دیا گیا تھا اور پانی ڈول سے نکالنا بند ہو گیا تھا۔ مشین پانی نکالتی تھی۔ زیادہ بڑی عمارتیں بھی وجود میں نہیں آئی تھیں۔ موٹروے بھی نہیں بنا تھا۔ صرف ایک سڑک ہی مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان موجود تھی۔ منیٰ، مزدلفہ، عرفات کی سڑکیں بھی قدیم طرز پر تھیں۔ سعودی عرب میں اتنی پابندیاں جیسے آجکل ہیں، نہیں تھیں۔ علماء مشائخ مسجد حرام اور مسجد نبوی میں وعظ اور تعلیم کے حلقے لگاتے تھے۔ حج کے پانچ روز بہت ہی پرسکون گزرے۔ بندہ کو تھوڑا سا بخار ہوا۔ دل میں خیال ہوا کہ اس کے لیے تو انجکشن لگانا پڑے گا اور اس کے لیے صاف (Sterlized) سرنج چاہئے وہ یہاں سے کیسے ملے گی۔ ڈسپوزایبل سرنج کا پاکستان میں رواج نہیں ہوا تھا۔ اتنے میں جرمنی سے ڈاکٹر محمود مروت جو حج کو آئے تھے حضرت مولانا سے ملنے آگئے۔ ڈاکٹر صاحب نے (Disposable syringe) سے انجکشن لگایا اور اللہ نے شفاء عطاء فرمائی۔

اس منیٰ کے قیام میں مانکی شریف کے گدی نشین روح الامین صاحب بھی اسی حلقے میں تھے۔ وہ

بیمار ہو گئے۔ حضرت مولانا نے بندہ کو عیادت اور علاج کا حکم دیا۔ بندہ کے علاج سے روح الامین صاحب بہت خوش ہوئے اور کہا کہ پاکستان جا کر میں آپ لوگوں کی ضرور کھانے کی ضیافت کروں گا۔ چنانچہ انھوں نے ضیافت کی۔ بندہ بھی حضرت کے ساتھ مانکی شریف گیا۔ جمعے کا دن تھا، پیر صاحب نے ان الفاظ کے ساتھ اعلان کیا ’’آج ہمارے بڑے بھائی اور تبلیغی جماعت کے امیر حضرت مولانا محمد اشرف صاحب تشریف لائے ہیں۔ وہ بیان فرمائیں گے اس کے بعد جمعے کی نماز پڑھی جائے گی۔‘‘ چنانچہ حضرت کا بیان ہوا پھر جمعے کی نماز پڑھی گئی۔ ایک ضیافت انھوں نے بھی ہماری قبول کی جس میں انکے کئی حضرات شامل ہوئے۔ دراصل حضرت مولانا کو بڑی چاہت تھی کہ یہ حضرات اگر اپنے آباؤ اجداد کی میراث کو سنبھال لیں تو بہت کار آمد ہو سکتے ہیں۔

حج کے ارکان کی ایسی سہولت والی ترتیب آپ اختیار فرماتے تھے کہ آمد و رفت، وقوف، رمی جمار (شیطانوں کو مارنا) کسی وقت ہڑبونگ اور افراتفری سے سابقہ نہیں پڑتا تھا۔ یہ بات تجربہ میں آئی کہ ساری تکلیف کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ اکثر حجاج کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ کیا کرنا ہے، کہاں کرنا ہے اور کس وقت اور کیسے کرنا ہے۔ چنانچہ ایک بھیڑ کی طرح بڑھ رہے ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے مشکلات اور خطرات درپیش ہوتے ہیں۔ نیز مستحبات کی پابندی سے ایسے چمٹتے ہیں کہ اپنی اور دوسروں کی جان جانے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ آخری دن یعنی ۱۲ ذی الحج کو دس بجے سے ہی معلم کے کارندے رمی (شیطان کو مارنا) کے لیے شور شروع کر دیتے ہیں۔ جب کہ وقت زوال سے شروع ہوتا ہے اور غروب تک رہتا ہے۔ چار بجے کے قریب ایک ہڑبونگ مخلوقِ خدا کا جمع ہو جاتا ہے۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ ان کی بات پر کان نہ دھرو۔ بارہ بجے آرام سے کھانا کھایا نمازِ ظہر پڑھی اور لیٹ گئے۔ اٹھے چائے پی، معلم کے کارندوں نے بہت شور مچایا کہ جلدی کرو نکلو ہم بھی جا رہے ہیں۔ خیمے اکھاڑنا شروع کر دیے۔ ہم نے عرض کیا کہ آپ ایک طرف سے شروع کریں جب ہمارے قریب آئیں گے تو ہم یہ جگہ آپ کے لیے خالی کر دیں گے۔ عصر کی نماز پڑھ کر رمی کے لیے روانہ ہوئے تو اس وقت مکمل سکون تھا۔ عالم اسلام کے بڑے علماء و مشائخ رمی کر رہے تھے۔ اس قدر سکون تھا کہ حضرت مولاناؒ اور مولانا زکریاؒ نے اپنی اپنی وہیل چیر (پہیہ والی کرسی) میں بیٹھ کر خود اپنے ہاتھ سے رمی کی۔ غروب سے پہلے منیٰ سے نکلنا ہوتا ہے، سو ہم آسانی سے نکل گئے۔

حج اتنا اہم رکن ہے لیکن بوجہ لاعلمی کے اتنی تکلیف برداشت کر کے اور مال خرچ کر کے امت اس سے خاطر خواہ فائدہ نہیں حاصل کر رہی۔ حضرت مولاناؒ کو اللہ تعالیٰ نے بار بار حاضری کی توفیق عطا فرمائی۔ یار

لوگ اعتراض بھی کرتے رہتے تھے کہ نعوذ باللہ پیسے کا ضیاع کررہے ہیں۔ معذور ہوتے ہوئے نفل حج کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں لیکن حضرتؒ کے ساتھ حج کر کے محسوس ہوا کہ اس طرح کی شخصیات کی وہاں حاضری امت کے لیے کس طرح ظاہری و باطنی فوائد کا ذریعہ بنتی ہیں۔ جس انہماک سے ذکر و عبادت اور دعا میں آپ مشغول ہوتے اور آپ کے متعلقین جس نظم وضبط، گریہ وزاری اور ذکر و شغل کی فضا بناتے وہ پورے ماحول پر اثر انداز ہوتی اور دوسرے لوگوں کے لیے تقویت اور رجوع الی اللہ کا ذریعہ بنتی۔ واقف اور ناواقف لوگ آ آ کر آپ کی مجالس میں شریک ہوتے، مسائل پوچھتے، دعا کرواتے اور باطنی حال میں واضح فرق آتا ہوا دیکھ کر جاتے۔ جس سوز و گداز کے ساتھ آپ امت کے لیے دعا میں مصروف ہوتے، وہ منظر قابل دید ہوتا۔ واقعی انہی مستجاب الدّعوات حضرات کی وجہ سے اس امت کی گاڑی چلتی ہے۔

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

کُل بیس روز مکہ مکرمہ میں قیام کر کے مدینہ منورہ روانگی ہوئی۔ وہاں بھی بیس روز قیام ہوا۔ عصر تا عشاء اور فجر تا اشراق دو اوقات خاص طور سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدمین مبارک کی طرف گذرتے۔ یہ پورا وقت کسی سے بات چیت نہیں فرماتے تھے اور مسلسل درود شریف اور مراقبہ میں مصروف رہتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بار بار زیارت ہوتی رہتی تھی۔ ایک بار فرمایا کہ مسجد نبوی میں حاضری ہوئی تو جگہ بہت دور ملی حسرت محسوس ہوتی رہی اور دل میں خیال آیا کہ قریب سے آپ کے درود شریف خود سننے کی بشارت ہے، ہمیں تو آج دور جگہ ملی ہے قریب کی اس بشارت سے محرومی رہی۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بالین مبارک (سر مبارک) کی طرف سے ایسے دیکھا کہ گویا ہنڈیا کے سرپوش کی طرح ایک ڈھکن ہٹ گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سامنے جلوہ فرما نظر آنے لگے اور فرمایا ہاں وہاں سے بھی سنتا ہوں۔ خواب میں اور بیداری میں زیارت سے مشرف ہوتے رہے۔

دورانِ حج حضرت نے بارہا یاد دلایا کہ حضرت مولانا یوسف بنوری صاحبؒ کے لیے بطور ہدیہ کوئی اچھا سا گرم کپڑا لے لینا چاہئے۔ ساتھیوں کو خیال نہیں رہا۔ بندہ کا خیال تھا کہ سارے ساتھی مل کر خرید لیں گے۔ لیکن دن آخر ہو گئے مگر کسی نے نہیں خریدا۔ اس پر بندہ نے خود ہی ایک کپڑا خرید کر پیش کیا لیکن دل میں خیال آیا اس پر بہت پیسے لگے اس میں دوسرے ساتھیوں کو بھی حصہ لینا چاہئے تھا۔ گویا ہدیہ پورا طیب خاطر

(دل کی خوشی) سے نہیں تھا۔ حضرت نے زندگی میں کبھی بندہ کا ہدیہ رد نہیں فرمایا لیکن یہ ہدیہ قبول نہیں فرمایا اور واپس کردیا۔ بہت حیرت ہوئی کہ طیب خاطر نہ ہونے کی حضرت کو آگاہی ہوگئی اور ہدیہ قبول نہیں فرمایا۔ پھر خود ہی ایک اچھا سا کپڑا حضرت مولانا یوسف بنوریؒ کے لیے خرید لیا۔

اس سفر میں حضرت مولانا زکریا صاحبؒ کے پاس دو مرتبہ حاضری ہوئی۔ حضرت کی زندگی کے آخری سال تھے، بہت ضعیف ہو چکے تھے، صرف ایک گھنٹہ عصر و مغرب کے درمیان باہر تشریف لاتے تھے۔ زائرین کا ہجوم ہوتا تھا، کمرہ محدود تھا اس لیے مصافحہ اور زیارت کے لیے خدام صرف پانچ منٹ کا وقت دیتے تھے۔ حضرت صرف مصافحہ فرماتے، کلام نہیں فرماتے تھے۔ حضرت مولانا صاحبؒ اور ہم حاضر ہوئے تو خادم نے حضرت شیخ سے عرض کیا مولانا اشرف صاحب پشاور والے آئے ہیں، حضرت نے حال پوچھا۔ پانچ منٹ بعد اعلان ہوا کہ پہلے والے حضرات اٹھ جائیں نئے اندر آجائیں ہم اٹھنے لگے تو خادم نے حضرت مولانا صاحبؒ سے عرض کیا کہ یہ آپ کے لیے نہیں آپ تشریف رکھے رہیں۔ حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ بہت محبت فرماتے تھے۔ اوجز المسالک شرح موطا امام مالک حضرت مولانا صاحبؒ کو ہدیۃً دی تھی اور لامع الدّراری شرح بخاری شریف کے بارے میں فرمایا کہ میری زندگی میں چھپ کر آگئی تو میں خود ہدیہ بھیج دوں گا اور اگر میری وفات ہوگئی تو تقاضا کر کے میرے لواحقین سے لے لینا۔

حضرت مولاناؒ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے نو مرتبہ حج کی سعادت نصیب فرمائی اور ایک مرتبہ آپ رمضان میں عمرہ کے لیے تشریف لے گئے۔ اس طرح کل دس مرتبہ حاضری ہوئی۔ آپ کا حج کا پروگرام اچانک ہو جاتا تھا، ایسے حالات میں ہو جاتا تھا کہ مالی اسباب ہی نہیں ہوتے تھے اور ایسے دنوں میں ہو جاتا تھا کہ وقت بہت تنگ ہوتا تھا جس میں ویزے اور پاسپورٹ کی انتہائی مشکلات درپیش ہوتی تھیں۔ عام طور پر آپ کے قریبی ساتھیوں کا یہ خیال ہوتا تھا کہ یہ ممکن نہیں ہو سکے گا۔ لیکن جب آپ کمرِ ہمت باندھ کر تگ ودو شروع فرماتے تھے تو حیرت کی انتہا نہیں رہتی تھی کہ اسباب مسخر ہو کر گویا قدموں میں آگرتے تھے۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ آپ کا حج پر تشریف لے جانا گویا بلاوا ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ آخری دنوں میں آپ حج کی کوشش کے لیے اسلام آباد تشریف لے گئے تو ریگولر سکیم، ویزا وغیرہ سب راستے بند ہو چکے تھے اور دن بالکل آخری ہو گئے تھے۔ چاروں طرف پھر پھرا کر آخر دلبرداشتہ ہو کر واپس ہونے لگے۔ واپسی پر خیال آیا کہ جسٹس عبدالحکیم صاحب (سابق گورنر صوبہ سرحد) سے ملتے ہوئے واپس پشاور جائیں گے۔ ان سے ملاقات ہوئی اور

مسئلہ ان کے سامنے آیا تو انھوں نے کہا کہ جسٹس افضل چیمہ سے مل لیتے ہیں۔ افضل چیمہ رابطۂ عالم اسلامی کے جنرل سیکرٹری اور ضیاء الحق کے خاص آدمی تھے، ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے براہِ راست ضیاء الحق صاحب سے منظوری دلوادی۔

۱۹۸۷ء میں رمضان میں آپ عمرہ پر جانا چاہتے تھے لیکن مالی وسائل ایسے وقت ہاتھ آئے جب سعودی ایمبیسی سے رمضان کے عمرے کے ویزوں کا وقت ختم ہوگیا تھا۔ پھر افضل چیمہ صاحب سے رابطہ کیا گیا وہ پھر ضیاء الحق کے پاس گئے۔ ضیاء الحق نے ان سے کہا کہ مولانا صاحب وقت پر تو سوئے ہوتے ہیں جب وقت گذر جاتا ہے تو جاگ اٹھتے ہیں۔ بہر حال اس نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے ویزا لگوادیا۔

ایک مرتبہ بالکل آخری دنوں میں آپ نے ساتھیوں سے فرمایا کہ حج پر جانا ہے۔ اس وقت اتنے تھوڑے دن رہ گئے تھے کہ کسی طریقے سے جانے کی گنجائش نہیں بنتی تھی۔ بقول میر حاتم صاحب محض حضرت مولانا کو خوش کرنے کے لیے ہم سارا دن چل پھر کر معلومات کر کے واپس آ گئے اور عرض کیا کہ کام نہیں ہوسکتا۔ دوسرے دن پھر حضرت نے فرمایا۔ ہمیں تو حیرت ہوئی لیکن حضرت نے ڈانٹ کر فرمایا کہ کوشش ضرور کرنی چاہیئے۔ چنانچہ میر حاتم صاحب ہی کی گاڑی میں اسلام آباد سٹیٹ بینک گئے۔ میر حاتم صاحب تو بینک میں بات کرنے کے لیے چلے گئے جبکہ مولانا صاحب گاڑی میں دعا میں مشغول ہوگئے۔ بینک منیجر نے پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ میں یونیورسٹی میں پروفیسر ہوں تو بینک منیجر نے کہا ''حج کا موسم ختم ہوگیا ہے، سعودی ایمبیسی بند ہوگئی ہے آپ لوگ سرکاری ملازم ہیں آپ کے پاس ادارے کا NOC بھی نہیں ہے ،تو آپ کا کام میں کیسے کرسکتا ہوں؟ آپ کوئی ناسمجھ آدمی بھی نہیں ہیں کہ سمجھتے نہ ہوں۔ پڑھے لکھے آدمی ہیں ۔'' میر حاتم صاحب نے پھر عاجزانہ عرض معروض کی کہ جتنا کام آپ کے ذمے ہے وہ کردیں آگے دیکھیں گے ۔اس نے کہا چلو اگر تمہاری یونیورسٹی کا رجسٹرار ٹیلیفون پر ہی تمھیں اجازت دے دے تو میں مان لیتا ہوں۔ اسی کے ٹیلی فون سے رجسٹرار کو ملایا، حسن اتفاق سے پہلی ڈائلنگ پر ہی رجسٹرار مل گیا اور اس نے منیجر صاحب سے بات کر کے اجازت دے دی۔ اجازت ملنے کے بعد مسئلہ ویزا لگوانے کا تھا۔ اسلام آباد میں سعودی ایمبیسی چھٹیاں کر چکی تھی کیونکہ ۵ ذوالحجہ تھی۔ ڈاکٹر اسلم صاحب کو بذریعہ ہوائی جہاز کراچی بھیجا گیا تا کہ کراچی کے کاؤنسلیٹ سے ویزا لگوایا جائے۔ ڈاکٹر اسلم صاحب نے ساتھ والی سیٹ والے آدمی سے بات شروع کی تو

حیرت ہوئی کہ وہ کراچی کے کاؤنسلیٹ کے سعودی کونسل جنرل تھے۔انھوں نے کہا اگر چہ کل جمعہ کی چھٹی ہے لیکن آپ آجائیں ہم آپ کو ویزا لگا دیں گے۔ڈاکٹر اسلم نے ویزا لگوا کر آپ کے ہوئی ٹکٹ واپس پشاور بھیجے کیونکہ انہی ٹکٹوں پر آپ نے سفر کرنا تھا۔حضرت مولانا مع ساتھیوں کے کراچی پہنچے۔وہاں معلوم ہوا کہ جدہ کے لیے ساری پاکستانی فلائٹیں ختم ہوچکی ہیں۔

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند

دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا

ساتھی اداس بیٹھے تھے کہ اتنے میں اطلاع ہوئی کہ چینی حاجیوں کی ایک خاص فلائٹ جانے والی ہے۔تگ ودو کی تو اس میں پانچ کے پانچ ساتھیوں کی سیٹیں ہوگئیں۔

مزید ابتلائیں:

آزمائشیں اور ابتلائیں جہاں کفار پر بطور سزا اور فاسق مسلمانوں پر بطور اصلاح آتی ہیں وہاں اہل اللہ پر ابتلائیں برائے ترقی درجات آتی ہیں۔چنانچہ حدیث شریف میں فرمایا

انّ اشدالنّاس بلاءَ الانبیاء فا الامثل و الامثل

ترجمہ: بے شک سب سے زیادہ بلائیں انبیاء پر آتی ہیں پھر جو درجہ بہ درجہ ان کے قریب ہوں۔

چنانچہ حضرت مولانا صاحب پر بھی مختلف قسم کی ابتلائیں آئیں۔۱۹۷۳ء کا واقعہ ہے کہ پروفیسر عبدالعلی خان پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر بن کر آئے۔ان دنوں مرکز میں بھٹو کی حکومت تھی اور صوبہ سرحد و بلوچستان میں جمیعۃ العلماء و نیشنل عوامی پارٹی کی حکومت تھی۔علی خان صاحب نیشنل عوامی پارٹی کے بانی خان عبدالغفار خان کے صاحبزادے تھے اور دینی رجحان رکھنے والے آدمی نہیں تھے۔کچھ ان کی اپنی افتادِ طبع اور کچھ مخالفین کا کان بھرنا تھا کہ خان صاحب موصوف حضرت مولانا کے درپے ہوگئے کہ اس کے گھر میں اجتماع رہتا ہے، جماعت کی نماز ہوتی ہے، تراویح ہوتی ہے، یہ اقامتی علاقے کے قانون کے خلاف ہے۔حالانکہ یونیورسٹی کے مکانات اتنے وسیع ہوتے تھے اور دو مکانوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہوتا تھا کہ ایک آدمی کی خلوت (Privacy) دوسرے کی وجہ سے بالکل متاثر نہیں ہوتی تھی۔حضرت مولاناؒ کی ایک زمین جو مکانوں کی تعمیر کے لیے خریدی ہوئی تھی یونیورسٹی کی زمین کے ساتھ ملی ہوئی تھی اور اس کی چاردیواری بنی ہوئی تھی۔ خان موصوف نے تنازعہ کھڑا کر دیا کہ مولانا صاحب نے یونیورسٹی کی ایک فٹ زمین پر قبضہ کرلیا ہے اور مقدمہ

شروع کر دیا۔مولانا صاحبؒ کے بڑے بھائی ڈاکٹر اسلم صاحب ان دنوں صوبہ سرحد کے ہیلتھ سیکرٹری تھے۔وہ آئے اور مولانا صاحب سے کہنے لگے کہ ایک فٹ زمین ہے چھوڑ دو۔آجکل مسٹر بھٹو کی حکومت ہے اور کوئی کسی کا پرسان حال نہیں، کہیں تمہیں نوکری سے ہی نہ نکال دیں۔اس پر مولانا صاحبؒ نے فرمایا کہ میں تو ساری عمر اپنے اخلاق سنوارنے کی کوشش کرتا رہا کہ دیانتداری سیکھوں۔اب ایک فٹ زمین چھوڑ کر کیا میں یہ ثبوت فراہم کروں کہ میں نے بددیانتی کر کے یہ زمین لی ہے؟ اگر یونیورسٹی کو ضرورت ہو تو مجھ سے مانگ لیں میں یہ پوری زمین مفت ان کے حوالے کر دوں گا لیکن اس طرح بددیانت بن کر ایک انچ زمین بھی نہیں دوں گا۔ احتیاطاً آپ نے پٹواری کو بلا کر حد براری کروائی، پٹواری نے بتایا کہ بجائے یونیورسٹی کے آپ کی زمیں یونیورسٹی کی طرف گئی ہوئی ہے۔

خیر یہ تنازعہ اور دیگر اختلافات انتظامیہ کے ساتھ اس حد تک چلے کہ بوجہ سخت دباؤ (Tension) کے آپ کی صحت متاثر ہوگئی۔ایک دن ایک مجذوب فقیر آپ سے ملنے آئے۔بندہ بیٹھا ہوا تھا، آپ نے فقیر سے کہا کہ علی خان نے بہت تنگ کیا ہوا ہے۔اس نے فوراً کہا ''یہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور ۸ فروری تک چلا جائے گا اور کچھ واقعات مزید ہیں لیکن وہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا ورنہ فقرا میں سے میرا نام کاٹ دیا جائے گا''۔بندہ کو حیرت ہوئی کہ اتنا مضبوط وائس چانسلر جس کا خاندان صوبے پر حکومت کر رہا ہے وہ کیسے بیک جنبش قلم چلا جائے گا۔وہ خود بھی کہا کرتا تھا کہ مجھے اگر ٹریکٹر سے باندھ کر بھی نکالا جائے تو میں نکلنے کا نہیں۔ ۸ فروری ۱۹۷۵ء کو بندہ اس انتظار میں تھا کہ کیا ہونے والا ہے کہ اتنے میں عصر کی نماز کے دوران آخری قعدے میں یونیورسٹی میں زوردار دھماکے کی آواز آئی۔بندہ دوڑ کر ہاسٹل کے دروازے پر آیا۔تحقیق سے معلوم ہوا کہ پشاور یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں دھماکہ ہوگیا ہے اور حیات خان شیر پاؤ گورنر صوبہ سرحد کی موت واقع ہوگئی ہے۔اس واقعے کی وجہ سے پشاور یونیورسٹی کے بارے میں جہاں اور فیصلے ہوئے ایک فیصلہ یہ بھی تھا کہ وائس چانسلر علی خان کو تبدیل کر دیا گیا۔انہی دنوں میں مولانا کی ایک مجلس میں تذکرہ ہوا کہ وائس چانسلر نے مولانا کو بہت تنگ کیا ہوا ہے تو حاضر فقراء میں سے ایک نے کہا ''یا اللہ پشاور بدر، اسلام آباد میں او۔ایس۔ڈی'' چنانچہ ایسے ہی آڈر ہوا اور اخباروں میں آ گیا کہ وائس چانسلر علی خان صاحب اسلام آباد میں او۔ایس۔ڈی بنا دیے گئے۔

اگر گیتی سراسر باد گیرد　　چراغِ مقبلاں ہرگز نہ میرد

یعنی ''اگر ساری زمین کو ہوا گھیر لے تب بھی اللہ کے مقبول بندوں کا چراغ ہرگز نہیں بجھتا۔''

اس سلسلے کا دوسرا واقعہ ۱۹۷۶ء کا ہے۔ یہ دور حضرت مولاناؒ کے لیے بہت زیادہ مقبولیت اور محبوبیت کا تھا۔ یہاں تک کہ حضرت مولانا فقیر محمد صاحبؒ، جو حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ کے خلیفہ تھے اور حضرت مولانا صاحبؒ کو خلافت دی ہوئی تھی، جب تشریف لاتے تو ازراہِ محبت حضرت مولانا صاحبؒ کا ہاتھ چومتے۔ علماء وصوفیاء، عوام ہر طبقے میں آپ کا چرچا تھا کہ ایک عجیب اور نئی ابتلا کا دور دورہ شروع ہوا۔ بندہ نے گذشتہ اوراق میں تذکرہ کیا تھا کہ ۳۲۔ دی مال (پشاور کینٹ ایریا میں ایک قطعہ زمین) کو آپ نے تبلیغ والے حضرات کو پیشکش کی تھی کہ اس زمین کو تبلیغی مرکز کے لیے استعمال کر لیں لیکن انہوں نے یہ عذر کر دیا کہ یہ متنازعہ فیہ زمین ہے اس لیے ہم اسے نہیں لیتے۔ جب شب جمعہ کا مجمع بڑھنے کی وجہ سے مسجد خواجہ معروف تنگ ہوگئی تو ایک پرانے ساتھی نے مرکز کے لیے زمین کی پیشکش کی۔ اندرونی حالات ایسے تھے کہ ان صاحب کا کافی رقبہ اس جگہ پر تھا جسے حکومت نے واپڈا کالونی کے لیے (Acquire) جبری لے لیا تھا۔ ان صاحب کو بڑا نقصان ہو رہا تھا۔ وہ بہرصورت اس رقبہ کو واپس لینا چاہتے تھے کیونکہ حکومت بہت تھوڑے پیسے دے رہی تھی۔ ۱۳ کنال زمین مرکز اور مسجد کے لیے دے دی گئی۔ ابھی حکومت نے لی ہوئی زمین کی چاردیواری نہیں بنائی تھی کہ اس میں مسجد کی تعمیر شروع کر دی گئی۔ بجائے مزدوروں کے یہ اپنے ساتھیوں سے ہی کام کرواتے تھے۔ بندہ بھی بیس پچیس طلباء کے ساتھ موقع پر حاضر ہوتا تھا اور اس طرح موقع پر سو دو سو آدمیوں کا مجمع ہر وقت رکھا جاتا تھا تاکہ حکومت آسانی سے ہاتھ نہ ڈال سکے۔ واپڈا والوں نے بہتیری خط وکتابت کی اور اپنی حاصل شدہ زمین پر تعمیر کو روکنے کے بار بار نوٹس دیے۔ آخر واپڈا والوں نے مسجد کے تیرہ کنال علیحدہ کر کے باقی زمین پر چاردیواری لگا دی اور یہ مطالبہ کیا کہ تیرہ کنال کی قیمت جو ادا کی گئی ہے اس کے پیسے واپس کیے جائیں۔

خیر مسجد بن گئی اور اس میں اجتماع مقرر کیا گیا۔ ایک دن مشورہ کے دوران یہ بات مشورہ میں آئی کہ جب اجتماع شروع ہو تو حکومت کی بنی ہوئی دیوار کو توڑ دیا جائے اور اجتماع کا ایک حصہ اس زمین پر منتقل کر دیا جائے جسے حکومت نے لیا ہے، اس طرح حکومت کا قبضہ ٹوٹ جائے گا۔ یہ بات ڈاکٹر برہان ڈینٹل سرجن نے سنی اور آکر راقم السطور سے کہی۔ بندہ نے یہ بات حضرت مولانا سے عرض کی اور حضرت مولاناؒ نے مشورہ والے ساتھیوں کو پیغام بھیجا کہ اگر دورانِ اجتماع آپ نے حکومتی دیوار کو توڑا تو ذمہ داری آپ کی اپنی ہوگی۔

بطور امیر میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں گا۔ یاد رہے کہ اس وقت حضرت مولاناؒ تبلیغ کے امیر تھے۔ اس پر صاحب زمین کو بہت کوفت ہوئی۔ یاد رہے کہ آپ کو خلافت مل جانے کے بعد اور تبلیغ کے کام کے ساتھ بیعت کا سلسلہ چلانے کی وجہ سے ایک طبقہ مسلسل آپ کے ساتھ چپقلش رکھتا تھا اور تبلیغ و تصوف کے تقابل کی فضا رہتی تھی۔ کاملین لوگ تو اصولی اختلاف رکھتے ہیں۔ کام کرنے کے طریقہ کار کا اختلاف کوئی کفر و اسلام یا حلال و حرام کا اختلاف نہیں تھا بلکہ راجح اور مرجوح (کم بہتر زیادہ بہتر) طریقہ کار کا اختلاف تھا۔ کاملین اختلافات ضرور رکھتے ہیں لیکن اختلاف رائے کو دل شکنی اور دین شکنی تک نہیں پہنچنے دیتے اور ایسے ہی اختلاف رحمت ہوتے ہیں۔ لیکن ناقص کے ہاتھ میں آ کر اختلاف، مخالفت، مخاصمت اور عناد کی حدوں کو چھونے لگتا ہے۔ جو دل شکنی بلکہ دین شکنی پر جا کر منتج ہوتا ہے۔ چنانچہ انہی دنوں ایک ایسی گھناؤنی تہمت آپ پر لگائی گئی کہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عائشہؓ کے دور کی یادیں تازہ کر دیں اور کچھ سادہ لوح کارکن بنیاد بنے اور مشورہ والے ساتھی جو تحریکی و تشکیلی شخصیات تو ضرور تھے لیکن دینی فہم میں ناپختہ تھے اس کو پھیلانے اور اچھالنے کا ذریعہ بنے۔ آپ کی والدہ صاحبہ، اہلیہ اور بہن کسی کو معاف نہ رکھا اور اپنی سادہ لوحی سے جگہ جگہ چرچا کر کے اور گلی کوچہ، حجرہ، مسجد میں پراپگنڈہ کر کے آپ کو بدنام کرنے کی کوشش کی گئی اور بات اس حد تک لے گئے کہ الامان والحفیظ۔ حالات اتنے خراب کر دیے کہ سخت اذیت کی وجہ سے حضرت مولاناؒ جو پہلے ہی پانچ چھ جان لیوا بیماریوں میں مبتلا تھے، بے دم اور بے جان ہو کر صاحبِ فراش ہو گئے اور بات کرنے تک کی سکت نہ رہی۔ آپ کے حلقے کی طرف سے ردعمل فطرتی بات تھی۔ سخت چپقلش کی فضاء پیدا ہو گئی۔ بندہ جو حضرت مولاناؒ کا خاندانی معالج (Family Doctor) تھا اور دن رات کا حاضر باش تھا نیز اس وقت تک تقریباً دس سال حضرت کے ساتھ ہو گئے تھے۔ اس لیے عینی اور کل وقتی شاہد اور گواہ ہونے کی وجہ سے بندہ کو اس سارے کارنامے کا جھوٹ، فریب اور دجل ہونا روزِ روشن کی طرح عیاں تھا لہٰذا اِن حضرات سے رابطہ کر کے سمجھایا اور خطرات سے آگاہ کیا۔ ایک سمجھدار ساتھی نے جواب میں کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ عمر میں چھوٹے ہیں ان باتوں کو چھوڑیں۔ اب مولانا صاحب کو تبلیغی جماعت کی امارت سے ہٹایا جائے گا۔ اس پر بندہ سٹپٹایا کہ سارے منصوبے کی انتہا اگر یہ ہے کہ آپ کو امارت سے ہٹایا جائے تو اس کا کوئی علاج نہیں۔ خیر اس سارے ڈرامے کے بعد ایک پرانے کارکن اور بڑے مالدار تاجر آئے اور حضرت مولاناؒ سے امارت سے استعفیٰ لکھوا لیا اور بعد میں بڑے فخر سے کہنے لگے کہ اب یہ مولانا پشاور چھوڑ کر بھاگے گا۔ حضرت مولاناؒ تو بڑے کھلے سینے اور

فراخ دل کے مالک تھے۔ان کے پاس فقراء میں سے ایک نے کہایا اللہ اس کے کاروبار کو فیل کردے اور پشاور بدر کردے۔اللہ کی شان کہ بندہ نے دیکھاوہ پشاور بدر ہوااور شہر شہر مارا مارا پھرتا ہے۔سب سنجیدہ لوگوں کو افسوس تھا۔کیونکہ ہزارہا افراد حضرت مولاناؒ کے مرید تھے، حضرت مولانا کی ایسی برادری تھی کہ اس میں بڑی حیثیت کے تاجر، کارخانہ دار، آرمی وسول افسر سیاسی لیڈر، صوبائی وزیر وغیرہ تھے۔سسرال کا خاندان مشہور سادات وعلماء کا خاندان تھا۔سب حضرات کے سامنے تہمت لگانے والوں کی ناپختگی اور نقص تربیت ظاہر ہوا اوراس بات کا اندازہ ہوا کہ جن حضرات کو مشائخ کاملین کی صحبت نہ ملی ہوان کے اندر چلے وغیرہ لگانے سے سطحی دین تو وجود میں آجاتا ہے مگر گہرا فہم اور تربیت کا فقدان ضرور رہتا ہے۔حضرت مولانا کے متعلقین، علماء و اہل مدارس کو خاص طور پر شدید دکھ اورافسوس ہوا۔کچھ سمجھدار لوگوں نے رائے ونڈ والوں کو مداخلت کرنے کا کہا ۔اندازہ ہوا کہ رائیونڈ میں بعض بڑی حیثیت کے پرانے غیر عالم ساتھی بھی پشاوروالوں کے ہمنوا نظر آتے ہیں ،اس لیے توقع فضول ہے۔چنانچہ ایک صاحب نے کہا کہ ہمیں تو کام کی فکر ہے ہم پرانے فکر مند ساتھیوں کی جماعت بھیجیں گے جو وہاں کام کی فضا بنائے گی ،اس سے اختلافات خود بخود مٹ جائیں گے۔اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ جیسے کام کی فکر کوئی اور چیز ہے اور دین کی فکر کچھ اور۔کام کی فکر نے دین کی فکر کو مغلوب کیا ہوا ہے۔ بہرحال کچھ سمجھدار لوگوں نے کئی تار رائیونڈ بھیجے اوراس بات کا تقاضا کیا کہ صرف کام کی فکر سے کام نہیں بنے گا بلکہ اب دین کی فکر کرتے ہوئے مسئلے کا شرعی حل نکالنا پڑے گا اور تصفیہ کرنا پڑے گا۔پشاور شہر کے حضرات جو شوریٰ کے رکن ہونے کے علاوہ تبلیغی مرکز کی خدمت میں پیش پیش تھے اور ضرورت کے وقت دل کھول کر خرچ کرنے والے تھے نیز حضرت مولانا کے آبائی شہر کے تعلق کی وجہ سے ایک طرح سے آپ کے حلیف تھے، اپنی طبعی شرافت کی وجہ سے اس موقع پر سامنے نہ آئے اور حضرت مولانا یک گونہ تنہا رہ گئے۔لوگ حق بات کہنا چاہتے تھے لیکن تبلیغی اکابرین کی ناراضگی مول لینے کی ہمت نہیں کر رہے تھے۔باامر مجبوری بندہ نوجوان اساتذہ اور سنجیدہ طلباء کو لے کر جن میں ڈاکٹر عالم خان، ڈاکٹر برہان شامل تھے رائیونڈ اس مقدمہ کی وکالت کے لیے پہنچا اور مختلف حضرات سے مل کر صورتِ حال واضح کی۔بندہ کو اندازہ ہوا کہ حاجی بشیر صاحب بہت سنجیدہ اور صاحبِ فہم وفراست شخصیت ہیں نیز ٹیلی فون وٹیلیگراف کے محکمے کے ڈائریکٹر جنرل رہنے کی وجہ سے تحقیقِ حال (inquiry) اور دونوں فریقوں کو وضاحت اور صفائی کا پورا موقع دے کر فیصلہ کرنے کے عادی ہیں۔ انھوں نے بندہ سے فرمایا کہ میں بات کو پورا سمجھ گیا ہوں اب اس کا حل کیا ہے؟ بندہ نے اپنی سمجھ کے مطابق دو

تین صورتیں عرض کیں۔ دوسرے حضرات سے ملاقات کرنے پر ڈاکٹر برہان کی تو تو میں میں ہوگئی۔ چونکہ ہم حقیقت حال کو واضح کر کے عنداللہ اپنے فریضے سے فارغ ہو گئے تھے اس لیے بات کے بڑھنے سے پہلے واپس ہو گئے۔ کئی سمجھدار حضرات نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ اگر حاجی بشیر صاحب ریٹائرڈ ڈائریکٹر جنرل ٹیلیفون اینڈ ٹیلیگراف اور مفتی زین العابدین صاحب مداخلت کریں تو پختہ اور شرعی فیصلہ کی امید ہے۔

حضرت مولانا کو پشاور کے مشورہ والے ساتھیوں سے زیادہ توقعات نہیں تھیں کیونکہ یہ ساتھی نہ تو اہل علم تھے اور نہ ہی ایسے تھے کہ جو مشائخ کی صحبت میں آ کر تربیت حاصل کیے ہوئے ہوں اور مجاہدات کر کے فنا و بقا کی منزلیں طے کر کے رذائل کا ازالہ کر کے، فضائل حاصل کیے ہوئے ہوں۔ بلکہ یہ چند کاندار، زمیندار اور کالجوں کے پروفیسر قسم کے لوگ تھے، جو چلوں وغیرہ سے موٹے موٹے دین کا فہم رکھنے والے تھے۔

حضرت مولانا کو زیادہ دکھ ان حضرات سے تھا جو ذمہ دار تھے اور ان فساد کرنے والوں کو روک سکتے تھے۔ کچھ عاقبت نا اندیش اور لگائی بجھائی کرنے والے لوگوں نے قاضی عبدالقادر صاحب سرگودھے والے اور بھائی عبدالوھاب صاحب رائے ونڈ والوں سے حضرت مولانا کا دل بہت آزردہ کر دیا۔ بلکہ پشاور والے یہی شوریٰ والے ساتھی ہی ایسے ناپختہ بیانات دے رہے تھے کہ گویا رائیونڈ والے حضرات ان کا ساتھ دے رہے ہوں۔ اتفاقاً انہی دنوں قاضی عبدالقادر صاحب کا سخت حادثہ ہوا اور گاڑی ٹوٹ گئی۔ یہ خبر حضرت مولانا کی مجلس میں پہنچی بندہ موجود تھا، مجلس میں ایک فقیر (جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ان پر امور تکوینیہ کھلتے ہیں) نے کہا کہ اب بھائی عبدالوھاب کا نمبر ہے۔ چند دن بعد یہی فقیر آئے انھوں نے کہا میں نے ایک خواب دیکھا ہے جس میں نظر آیا کہ ایک فلک بوس اونچائی والی گاڑی ہے جس کے آگے ہاتھی بندھا ہوا ہے اس پر بھائی عبد الوھاب صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ گاڑی بجلی کی تاروں سے ٹکراتی ہے ایک آواز آتی ہے پچک گئے دوسری آواز آتی ہے بچ گئے۔ اس خواب کے چند دن بعد لاہور میں عبدالوھاب صاحب کا سخت حادثہ ہوا اور ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اب تو یار لوگوں کو بزرگوں کے خلاف باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ بندہ کو ذاتی طور سے چونکہ حضرت قاضی صاحب اور عبدالوھاب صاحب سے بہت فائدہ حاصل ہوا ہوا تھا اس لیے بندہ نے اس بات کو رد کرتے ہوئے کہا کہ اوّل تو خواب اور مجذوب کوئی شرعی حجت نہیں ہیں۔ بالفرض اگر کچھ ہو بھی تو ہم یوں کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر دو کاملین حضرات پر جانی تکلیف لا کر ان کو پاک کر دیا۔ حضرت مولانا تو اس ساری ابتلاء میں بجائے دوسروں کو برا بھلا کہنے اور بددعا دینے کے اپنی ہی نفی فرماتے رہے اور توبہ و استغفار میں مصروف

رہے۔ بندہ سے فرمایا کہ میں نے ان میں سے کسی کو بھی بددعا نہیں دی۔ مزید فرمایا کہ اب بھی اگر کوئی ان حضرات پر ایسی تہمت لگائے جو انھوں نے مجھ پر لگائی تو میں اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔

لیکن اس تہمت میں شمولیت والے حضرات کو کچھ نہ کچھ جانی و مالی تکالیف پہنچیں اور کچھ کی دینی توفیق سلب ہوگئی۔ اور محققین کا کہنا ہے کہ جسمانی تکلیف معمولی بات ہوتی ہے دینی توفیق سلب ہونا اللہ کی سخت ناراضگی کے باعث ہوتا ہے۔ دو آدمیوں کے بارے میں حضرت مولانا نے بندہ سے فرمایا کہ وہ کٹ گئے، واقعی ان کی توفیق سلب ہوئی۔ واقعی یہ سب باتیں " من عاد لی ولیاً فقد آذنته باالحرب "جو میرے ولی کو تکلیف پہنچاتا ہے میرا اس کے خلاف اعلانِ جنگ ہے" کا مظہر تھیں۔ اس ساری ابتلاء میں حضرت مولانا نے جس صبر وسکون کا مظاہرہ کیا اور جس طرح جم کر ساری بات کو جھیلا اس کی مثال کم ملتی ہے۔ بندہ ازراہِ مذاق ساتھیوں سے کہا کرتا تھا کہ ذکر وفکر، مراقبہ، تہجد وغیرہ مجاہدات کر کے بزرگی حاصل کرنا آسان ہے لیکن اس طرح کے اتار چڑھاؤ گذار کر بزرگی ملتی ہو تو ہم اور آپ تو نیت اور ہمت بھی نہیں کر سکتے۔

ان ساری باتوں کی شکایت حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ کی خدمت میں حضرت مولاناؒ نے کی جس پر حضرت شیخ نے تسلی دی اور فرمایا کہ ہر دین کا کام کرنے والے کے لیے ایسی آزمائشیں ضروری ہیں اور صرف تمہارے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہوا ہمارے ساتھ بھی یہ معاملات پیش آچکے ہیں، اس کے بعد حضرت شیخ کی محبت آپ سے بہت بڑھ گئی اور حضرت جی مولانا انعام الحسن صاحبؒ بھی بہت زیادہ محبت فرمانے لگے۔

یہ چپقلش اور بے اکرامی صرف حضرت مولاناؒ کے ساتھ خاص نہ تھی بلکہ مختلف شہروں میں علماء، مشائخ، مدارس اور بعد میں جہادی تنظیموں کے ساتھ ساتھیوں کی یہ تردید، تنقید، تقابل وتنقیص بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ ایک سال رائیونڈ کے سالانہ اجتماع میں حضرت مولانا محمد عمر پالنپوریؒ صاحب نے جانے والی جماعتوں کو ہدایات دیتے ہوئے یہ جملہ کہا "ہمارے ساتھیوں سے علماء اور مشائخ کی بے قدری ہو رہی ہے۔ اس کے لیے ہم دست بستہ انکی خدمت میں معافی کے خواستگار ہیں۔" اس کے بعد والے سال عام مجمعے میں بیان کرتے ہوئے حضرت پالنپوریؒ نے اس بات کو دوبارہ دہراتے ہوئے کہا "ہمارے ساتھیوں سے علماء اور مشائخ کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ دراصل ہمارا تو ایک عامی مجمع ہے کسی کو دکان سے اٹھاتے ہیں، کسی کو کھیت سے لاتے ہیں، اُن بے چاروں کو اتنا ہی فہم ہوتا ہے۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ یہ حضرات لِلّٰہ ہمیں معاف فرمائیں

اور بروزِ قیامت ہمیں نہ پکڑوائیں۔'' اِن الفاظ کو ادا کرتے ہوئے آپ روئے۔

انہی ایاّم میں کچھ مزید واقعات سامنے آئے، جن سے ناگواری بڑھی، جو ترتیب وار مندرجہ ذیل ہیں۔

پشاور یونیورسٹی میں جمعہ اسلامیہ کالج کی مسجد میں پڑھا جاتا تھا۔ اس جامع مسجد میں جو صاحب نماز پڑھاتے تھے، ایک تو انکی ڈاڑھی شرعی حد (ایک مٹھی) سے کم تھی نیز وہ دوسری اذان کے بعد پہلا خطبہ اردو میں دیتے جبکہ صرف دوسرا خطبہ عربی میں پڑھا کرتے تھے۔ پہلی کوتاہی پر تو نماز مکروہ تحریمی ہوتی ہے جبکہ دوسری کوتاہی کی وجہ سے بعض محتاط بحثوں میں نماز ادا ہی نہیں ہوتی۔ اسکا حضرت مولاناؒ پر ایک ذہنی بوجھ رہتا تھا۔ پشاور یونیورسٹی میں جب طلباء کی تعداد بہت بڑھ گئی مزید یہ کہ یونیورسٹی پورے موسمِ گرما میں کھلی رہنے لگی، جس سے نمازِ جمعہ کے لیے اسلامیہ کالج کی مسجد ناکافی ہوگئی۔ طلباء مسجد سے باہر صف سے چالیس پچاس فٹ دور درختوں کے سائے کے نیچے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ مسجد کی صف سے بقدر تین صفوں کی مقدار سے زیادہ دوری ہونے کی وجہ سے انکی نماز بھی نہیں ہوتی تھی۔ ان مجبوریوں کے پیش نظر طلباء نے وائس چانسلر سے مدینہ مسجد میں دوسرا جمعہ شروع کرنے کی اجازت لے لی۔ لیکن یونیورسٹی نے کوئی خطیب مہیا نہ کیا۔ حضرت مولاناؒ نے خواہش ظاہر فرمائی کہ اگر ڈاکٹر فدا اس مسجد کو سنبھال لے تو بہت اچھا ہو۔ چنانچہ یونیورسٹی کے طلباء نے اعلان کر کے بندہ سے جمعہ کی نماز شروع کروا دی۔ بغیر معاوضہ کے کام کرنے کی وجہ سے یونیورسٹی والوں کو بھی اعتراض نہ ہوا۔ یہ بات مخالفین اور خاص طور سے زائغین کو گراں گذری کہ ہم لوگوں کی بات اہم ممبرِ مسجد تک پہنچ گئی۔ انھوں نے اپنے ساتھ تبلیغی حضرات کو بھی مِلا لیا کہ ڈاکٹر فدا تمہارے تبلیغی کام کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ چنانچہ ایک شوریٰ کے صاحب کو ساتھ کر کے مسجد بلال پشاور یونیورسٹی کے امام کے کمرے میں بیٹھ کر ایک خط رائیونڈ لکھا گیا جس میں لکھا گیا کہ ڈاکٹر فدا نے بغیر مشورہ کے جمعہ پڑھانا شروع کر دیا ہے اور جمعۃ الوداع پر اس نے جمعہ کی تقریر میں کہا ہے کہ فلاں صاحب کافر ہیں۔ ان دنوں حاجی بشیرؒ صاحب امیر تھے، وہ کوئی کام بغیر تحقیق کے نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے یہ خط حضرت مولاناؒ کی خدمت میں بھیج دیا۔ حضرت نے بندہ کو بلایا اور وضاحت چاہی۔ بندہ نے عرض کیا کہ بندہ نے تو اس جمعۃ الوداع کی نماز مدینہ مسجد میں پڑھائی ہی نہیں بلکہ اس دفعہ کی نماز بندہ نے یہاں سے ڈیڑھ سو میل دور اپنے گاؤں میں پڑھی ہے اور بندہ نے کبھی کسی کا نام لے کر تکفیر نہیں کی۔ حضرت نے تفصیلات حاجی بشیر صاحب کو لکھ کر بھیج دیں اور اُن کو اطمینان ہو گیا۔

اس ترتیب میں ناکام ہونے کے بعد مشورے والے ساتھیوں نے پروفیسر اقتدار سے رابطہ کیا جو وارڈن ہاسٹل نمبر ۱' پشاور یونیورسٹی (نزد مدینہ مسجد) تھے۔ان سے کہا کہ تم ایک خط پشاور یونیورسٹی کو لکھو، جس میں اس بات کا تذکرہ کرو کہ ڈاکٹر فدا جمعہ میں شر انگیز مواد بولتا ہے، اس لیے اُسے ہٹایا جائے۔ پروفیسر اقتدار بندہ کا ذاتی دوست تھا، اس نے یہ بات تو نہ لکھی لیکن اسے ان حضرات کے رویے سے بہت حیرت ہوئی۔

حضرت مولانا زکریاؒ صاحب نے ماہِ رمضان کے اعتکاف کی ترتیب شروع کروائی، جس کا بہت زیادہ فائدہ سامنے آیا۔ بندہ نے حضرت مولاناؒ کی اجازت سے مدینہ مسجد پشاور یونیورسٹی میں اسی طرز پر اعتکاف شروع کیا۔ بفضلہٖ تعالیٰ معتکفین کی تعداد ساٹھ ستر تک ہوگئی جبکہ حاضرین مجالس کی تعداد سو سے تجاوز کرنے لگی۔ حضرت مولاناؒ کی دعا و توجہ سے ساتھیوں کو نا قابل یقین حد تک فائدہ ہونے لگا۔ حیرت کی انتہا نہ رہی کہ حضرت کے ایک مرید نے اطلاع دی کہ یہاں تبلیغی مرکز میں ایک خط آیا ہے جسے مشورہ والے حضرات بطور شکایت رائیونڈ لے جانے والے ہیں۔ خط میں لکھا تھا ''ڈاکٹر فدا نے مدینہ مسجد میں ایک فتنہ شروع کیا ہے جسے اگر بروقت نہ روکا گیا تو اس سے بہت نقصان ہو جائے گا۔'' حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ایک نا معلوم خط پر بغیر تحقیق کے کیسے اعتبار کر لیا گیا۔

حضرت شیخؒ نے مدرسہ شرعیہ مدینہ منورہ میں جہری ذکر کی مجلس شروع کروائی اور پوری دنیا میں اہل مدارس کو خطوط لکھے جس میں خانقاہی ترتیب کی اہمیت پر زور دیا۔ پشاور میں حضرت مولاناؒ کے شیخِ ثالث حضرت مولانا فقیر محمد صاحبؒ (خلیفہ حضرت تھانویؒ) نے بھی جہری ذکر کی مجلس شروع کروادی۔ یہاں یونیورسٹی میں بندہ نے حضرت کی اجازت سے دو مجالس شروع کیں۔اس پر ایک مشورہ والے ساتھی نے پروفیسر عالمگیر (انجنیئر نگ یونیورسٹی) کو پکڑا اور کہا کہ سنا ہے کہ تم لوگوں نے جہری ذکر کی مجلس شروع کی ہے۔انھوں نے جواب میں کہا کہ ''ہاں''۔اس پر انھوں نے پوچھا کہ کیا یہ سنت سے ثابت ہے؟ اس پر عالمگیر صاحب نے کہا کہ ہم تو حضرت تھانویؒ کے پیروکار ہیں۔اس پر انھوں نے کہا ''یہ اگر اس نے بھی کیا ہے تو غلط کیا ہے''۔ حیرت ہوئی کہ حضرت مولانا الیاسؒ نے تو حضرت تھانویؒ کی زبانِ مبارک سے تائیدی کلمات حاصل کرنے کے لیے کس قدر کوشش فرمائی جبکہ انکے پچاس سال بعد ایک انگریزی تعلیم یافتہ شخص حضرت تھانویؒ کے بارے میں کیا کلمات بول رہا ہے۔

انہی دنوں ایک مرتبہ حضرتؒ نے فرمایا کہ بدھ کے دن یونیورسٹی ہاسٹلوں میں میرے بدھ والے

تبلیغی بیان کی ترتیب جو کچھ دنوں سے رک گئی تھی دوبارہ بحال کریں۔ بندہ نے ہاسٹل والوں کو پیغام بھیجا کہ اس دفعہ آپ گشت کرلیں، مغرب کے بیان کے لیے حضرت مولاناؒ تشریف لائیں گے۔ ہاسٹل کے طلباء مشورہ والے پرانے ساتھی سے پوچھنے گئے۔ اس نے طلباء سے کہا کہ ایک دن پہلے تم گشت کر کے بیان کرلو اور بدھ کے دن ہاسٹل سے چلے جاؤ تاکہ یہ خود ہی لوگوں کو جمع کرے اور تقریر کرے۔ واضح رہے کہ ان دنوں اگرچہ آپ امیر نہیں رہے تھے لیکن شوریٰ کے رکن تھے۔ دوسرے مشورے والوں سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس بھلے آدمی نے مشورے میں پیش کیے بغیر اپنی رائے سے یہ سب کچھ کیا اور معصوم طلباء کو یہ تسلی رہی کہ انھوں نے بزرگوں سے پوچھ لیا ہے۔ یہ سارے واقعات خوفِ خدا، فکرِ آخرت اور اخلاص کی اصطلاحات کی روشنی میں ناقابلِ فہم تھے۔

آپ کی معذوری اور ضعف بھی بہت بڑھ گیا، مشورے والے بعض تبلیغی ساتھیوں کی طرف سے بدلحاظی اور بے اکرامی کا رویّہ جاری رہا۔ یہ حضرات تبلیغی طرز کی انتظامی ترتیب کو ایسا الہامی سمجھتے تھے کہ گویا کسی دوسری مسنون ترتیب سے کام کرنا بدعت اور ناجائز ہو۔ ایک دفعہ ایک پروفیسر صاحب (جو تبلیغ کا کام کرتے تھے) نے بندہ سے کہا کہ حضرت مولاناؒ پر ساری مصیبت اور ابتلاء اس وجہ سے آئی کہ وہ تبلیغ کا کام بزرگوں کے بتائے ہوئے طریقے کے خلاف کر رہے تھے۔ حیرت ہوئی کہ بجائے اپنی غلطی کو تسلیم کرنے کے الزام دوسرے کے سر پر ہی تھوپا جا رہا ہے۔ یہ ساری باتیں مل کر مقام پر تبلیغی طرز سے کام کرنے میں رکاوٹ بنیں۔ اس لیے اس کے بعد آپ کی مجلس ہی ہوتی رہی اور آنے والے لوگ بیعت ہو کر اپنی اصلاح کے لیے رجوع کرتے رہے۔ اللہ نے اس طرز میں بہت برکت عطا فرمائی اور آنے والوں کی زندگیاں بدلتی رہیں۔ یہ ابتلاء اتنی سخت تھی کہ ایک طرف تہمت کی بات ایسے لوگ کر رہے تھے جو باشرع اور تبلیغ میں چار چار مہینے لگائے ہوئے اور ملکوں کے سفر کیے ہوئے تھے جنھیں جھٹلانا مشکل، اور دوسری طرف ایسی شخصیت جن کی ولایت پر عرصہ دراز سے خواص و عوام نے گواہی دی اور جن سے واضح کرامات کا ظہور ہوا اور جن کی وجہ سے کئی انسانوں کی زندگیاں بدلیں۔ اس لیے کئی لوگ فتنہ میں مبتلا ہوئے اور کئی پریشان ہوئے۔ اس پریشانی کے عالم میں کئی حضرات کو رؤیائے صادقہ کے ذریعہ بشارتیں ہوئیں۔ بندہ نے دو خواب دیکھے ایک میں تہمت میں بنیادی کردار ادا کرنے والے طالب علم کو دیکھا کہ وہ بندہ کے ساتھ تانگے میں بیٹھا ہے۔ اس کا منہ کالا ہے اور بندہ سے کہہ رہا ہے کہ میں نے اپنا منہ تو کالا کرلیا ہے، اب مولانا کا منہ کالا کرنے جا رہا ہوں۔ دوسرے خواب میں تہمت

لگانے والے ساتھیوں کو دیکھا کہ کوئی ان کو تائب ہونے کے لیے تیار کر رہا ہے لیکن اس اثناء میں ان سب کی شکلیں غائب ہوگئیں اور ایک آدمی رہ گئے۔ بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ وہی صحیح طریقے سے اخلاص سے کام کر سکے۔ حاجی ایوب صاحب تاجر بازار مسگراں نے خواب میں دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضے کے آگے کھڑے ہیں، اندر سے ایک آدمی باہر آئے اور کہا کہ شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب سے کہو کہ مولانا اشرف صاحب کی برأت کا اعلان کریں۔

ابراہیم خلیل جو مولانا صاحب کے ایک دوست حاجی اسلم تاجر کے صاحبزادے ہیں، ان کو ان ہی دنوں میں جن دنوں مرکز سخی چشمہ کی زمین کے متنازعہ ہونے کا قصہ چل رہا تھا خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی کہ تبلیغی مرکز سخی چشمہ میں لوگ ہیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم مرکز کے پاس ایک دوسری عمارت میں ہیں، جس میں حضرت مولاناؒ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تشریف فرما ہیں۔

ڈاکٹر برہان نے خواب میں تہمت لگانے والوں کو دیکھا کہ ایک مردہ خنزیر کو پکڑے ہوئے ہیں۔ اس نے خواب میں کہا کہ اللہ کے بندو گڑھا کھود کر اس کو دفن کر دو۔ اس پر وہ نہ مانے اور اس کو ایک رسی میں باندھ کر سب نے مل کر آگے سے پکڑ لیا اور اپنے پیچھے گھسیٹنے لگے۔ علماء، مشائخ اور مجاذیب آ آ کر حضرت مولانا سے ملاقات کرتے رہے اور تسلی دیتے رہے۔ ایک مجذوب آئے اور ڈانٹ ڈپٹ اور وشور وغل کے انداز میں بات کی اور کہا کہ شکر نہیں کرتے ہو کہ حضرت عائشہؓ جیسی آزمائش تم پر بھی آئی، تم کہاں اس کے قابل تھے ۔ان مجذوب کی باتوں کے بعد آپ کا بوجھ ہلکا ہوا اور طبیعت بحال ہوئی۔ ان سب باتوں کے باوجود سالانہ اجتماع اور حضرت جی کی ملاقات کے لیے حضرت مولانا اپنے آپ کو گھسیٹ کر مع خدام ہوائی جہاز کا کافی خرچ برداشت کر کے حاضر ہوتے رہے اور آخری سال آپ کی وفات ہی اجتماع سے روکنے کا ذریعہ بنی۔

قادیانیوں کے خلاف آپ کے معرکۃ الآرا کارنامے:

قادیانیوں کا فتنہ ایک صدی سے چل رہا تھا۔ اس کے خلاف ۱۹۵۳ء میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحبؒ نے تحریک چلائی جس میں کئی ہزار علماء شہید کیے گئے۔ دوسری تحریک ۱۹۷۴ء میں بھٹو دور میں چلی، جس کا کچھ تذکرہ گذشتہ اوراق میں آ گیا۔ دو واقعات مزید نقل کرتا ہوں۔ یہ ۱۹۶۷ء کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں ہم ڈیرہ اسماعیل خان سے حفّاظ تراویح کے لیے بلاتے تھے۔ ایک نابینا حافظ عبدالحق بھی آئے تھے، یہ بہت پختہ حافظ تھے، انھیں تیاری کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ ان کو قادیانیوں کے ساتھ مناظروں کا شوق تھا۔

انہوں نے معلومات کیں تو پتہ چلا کہ یونیورسٹی سے ملحق ایک محلے میں قادیانی آباد ہیں۔ جس میں کچھ یونیورسٹی کے پروفیسر بھی تھے۔ حافظ عبدالحق دیہاتی مناظروں کا فاتح ہوتا تھا لیکن پروفیسروں کے آگے بیچارہ پھنس گیا۔ کسی نے حضرت مولانا صاحبؒ کو اطلاع دی آپ نے فرمایا کہ وہاں اعلان کر دیں کہ کل میں آ کر بات کروں گا۔ دوسرے دن مناظرہ کی تیاری کے لیے آپ رات کو مرزا غلام احمد قادیانی کی کتابیں پڑھتے رہے۔ آپ کے ایک معتقد مہربان نامی انجینیر آپ کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کو بھی شوق ہوا کہ اس طرح وہ بھی قادیانی کتب پڑھیں۔ چنانچہ انہوں نے مطالعہ شروع کر دیا۔ رات کو خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی، فرمایا کہ تم یہ کتابیں نہ پڑھو ان کے لیے اشرف ہی کافی ہے۔ دوسرے دن آپ نے جا کر مناظرہ کیا۔ قادیانیوں کو منہ کی کھانی پڑی اور اس محلّہ کو ہی چھوڑ کر بھاگ گئے۔

دوسری مرتبہ صدر ضیاء الحق کے دور میں قادیانیوں نے اپنے مرتد ہونے کے خلاف سپریم کورٹ میں کیس دائر کیا ہوا تھا۔ اس کیس کی وکالت کے لیے پشاور میں حضرت مولاناؒ اور قاضی مجیب الرحمٰن صاحب صدر شعبہ اسلامیات منتخب ہوئے۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ حضرت مولاناؒ بیمار ہو گئے اور اس قدر شدید بیمار ہوئے کہ ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ ہسپتال کے کمرہ میں اپنا کتب خانہ شفٹ کر دیا اور وہاں تحقیقی کام کئی آدمیوں کو ساتھ لگا کر کرتے رہے۔ جس دن روانگی تھی تو اٹھنے کی ہمت نہیں تھی۔ حاجی عبدالرحمٰن صاحب سنیٹر بڑی گاڑی لے کر آئے، جس میں لٹا کر اسلام آباد تک سفر کروایا گیا۔ فرماتے تھے کہ مجھے خطرہ ہو رہا تھا کہ راستے میں مر جاؤں گا لیکن میں اس راستے میں مرنے کے لیے ہی جا رہا تھا۔ سپریم کورٹ میں پیش ہونے پر اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسی قوت عطا فرمائی کہ قادیانی بری طرح ہارے اور ان پر اسلامی شعائر اذان دینا، اپنی عبادت گاہ کا نام مسجد رکھنا، اس کی شکل مسجد جیسی بنانا سب ممنوع کر دیے گئے۔ اس سفر سے واپسی پر اللہ تعالیٰ نے پھر صحت عطا فرمائی۔ مناظروں میں آپ کا طریقہ "وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ" (نحل۔۱۲۵) (اور الزام دے ان کو جس طرح بہتر ہو) کا نمونہ ہوتا تھا۔ دلائل کے ساتھ بات کر کے مقابل کو علمی لحاظ سے لاجواب فرماتے تھے۔ اس بات کا نتیجہ تھا کہ بڑے سے بڑا مخالف بھی آپ کے اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

ایک مرتبہ ایک آدمی آپ کی مجلس میں آیا۔ یونیورسٹی میں کسی شعبے کا طالبعلم تھا اور کوئی منفی لٹریچر پڑھ کر گمراہ ہو گیا تھا، خاص طور سے صحابہ کرام کے بارے میں بہت غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔ اس نے مجلس میں بہت ہرزہ سرائی کی اور خاص طور سے حضرت امیر معاویہؓ کو نشانہ بنا کر اعتراضات کیے۔ حضرت نے تحمل سے

اس کی بات سنی خدام میں سے کسی سے فرمایا ''وہ سامنے شیلف سے امام بخاریؒ کی کتاب الادبُ المفرد اتارو۔'' کتاب اتاری گئی آپ نے ورق الٹ کر ایک جگہ سے دو احادیث سنائیں۔پہلی کا مفہوم یہ تھا کہ ''حضرت امیر معاویہؓ بروز قیامت ایسے حال میں اٹھیں گے کہ ان پر نور کی چادر ہوگی۔'' دوسری حدیث کا مفہوم یہ ہے ''اے امیر معاویہ جب تمھیں شہروں کا والی بنایا جائے تو انصاف کرنا''۔اس آدمی کی ساری بحث کا جواب دو جملوں میں ہوگیا کہ جس شخصیت کے بارے میں تمہارے یہ فضول خیال ہیں ان کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ رائے ہے۔

ہندوستان کا سفر:۔

بندہ کو حضرت مولانا صاحب کے ساتھ ایک سفر ہندوستان کا نصیب ہوا۔۱۹۸۰ء میں دیوبند والوں نے مدرسہ کی صد سالہ تقریبات منانے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے ساری دنیا سے وفود بلائے گئے۔تقریباً دس بارہ لاکھ کا اجتماع ہوا۔پاکستان سے بھی کافی لوگوں کو یہ سفر نصیب ہوا۔صوبہ سرحد سے دارالعلوم حقانیہ والے دیوبند کی نمائندگی کرنے گئے۔لوگوں کا انتخاب ہو رہا تھا۔حضرت مولانا صاحب کو مع خدام و احباب بطور مندوب شمولیت کی دعوت ملی۔بندہ کا بہت جانے کو دل ہو رہا تھا۔ساتھ تو آپ ایسے احباب کو رکھتے تھے جو آپ کی معذوری کے پیش نظر آپ کی خدمت کرسکیں۔بندہ اس میں شامل نہیں تھا۔بہت دعائیں کیں کیونکہ حرمین شریفین اور ارض شام (اردن، فلسطین، شام، عراق) کے بعد ہندوستان کی سرزمین کو اللہ نے برکتوں سے نوازا ہے۔شوق میں کچھ منت بھی مان لی۔ساتھیوں نے حضرت سے تذکرہ کیا۔حضرت نے بندہ کو منظور فرمایا۔لاہور میں حضرت مولاناؒ کے مرید و معتقد جناب انجنیئر نسیم صاحب کے ہاں قیام کر کے بذریعہ ریل دیوبند روانگی ہوئی۔یہ عجیب وغریب سفر تھا۔نابغۂ روزگار شخصیات مولانا مفتی محمود صاحب، مولانا عبدالحق صاحب اکوڑہ خٹک، مولانا خان محمد صاحب کندیاں شریف اس ریل میں سفر کر رہی تھیں۔پوری رات سفر میں بسر ہو کر صبح کے قریب دیوبند پہنچے۔حاضری کی اطلاع دی گئی۔دیوبند والے حضرات نے ہاسٹل کا ایک کمرہ حضرت مولانا کو مع خدام کے عنایت فرمایا اور مطبخ (Kitchen) والوں کو ہدایت ہوئی کہ ہمارا کھانا ہمیں اپنے کمرے تک لے جانے کی اجازت ہے۔میزبانوں میں سے حضرت مولانا انظر شاہ صاحب صاحبزادہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ حضرت سے ملنے تشریف لائے۔دیگر علماء دیوبند بھی ملنے تشریف لاتے رہے۔حضرت مولانا بوجہ معذوری نماز اپنے کمرے میں ہی با جماعت پڑھتے تھے۔ہم بھی ان کے ساتھ بوجہ مسافر ہونے کے

پڑھتے تھے۔ نماز راقم الحروف ہی پڑھاتا تھا۔ ایک بزرگ حلیمی صاحب کاکاخیل جو فاضل دیوبند تھے ملنے کے لیے تشریف لائے۔ بندہ نے نماز پڑھائی۔ حلیمی صاحب نے بھی بندہ کے پیچھے نماز پڑھی۔ ان دنوں بندہ کو شلوار ٹخنوں سے اوپر کرنے کا چنداں دھیان نہیں ہوتا تھا۔ دوسرے دن فجر کے لیے وضو کررہا تھا کہ حلیمی صاحب سامنے سے گذر رہے تھے اور مسجد کی طرف نماز کے لیے جارہے تھے۔ انہوں نے تھوڑی دیر کے لیے کھڑے ہوکر بندہ کے سامنے خوب اپنی شلوار کو درست کیا اور تسلی کی کہ ان کے پائنچے ٹخنوں سے نیچے تو نہیں ہیں۔ بندہ کو بڑی حیرت ہوئی کہ انکا بڑھاپا اور ضعف اس قدر ہے کہ اب تو تکبر کے خطرات سے نکل چکے ہیں اور پھر اتنا اندھیرا لیکن ان بزرگوں کو اس مسئلے پر عمل کا اتنا اہتمام! اس سے بندہ کو بہت ندامت ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے شلوار کے ٹخنوں سے اوپر رکھنے کے معاملے میں بندہ کو سختی سے عمل کی توفیق عطا فرمائی۔

دیوبند کے اجتماع کے ہجوم اور مجمع کی کثرت کی وجہ سے حضرتؒ پہلے دن پروگراموں میں شامل نہ ہوسکے۔ آپ کی آمد و رفت بھی عجیب ہوتی تھی۔ جس دن آپ کا شرح صدر نہ ہوا اور آپ نہ جائیں تو بعد میں ہمیں معلوم ہوجاتا تھا کہ جانے سے کوئی نہ کوئی تکلیف پیش آسکتی تھی یا اس وقت آپ کا جانا مفید نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ اس دن افتتاح کا رنگ سیاسی تھا، اندرا گاندھی وزیر اعظم ہندوستان افتتاح کرنے آئی ہوئی تھی۔ ہندو عورت ہونے کے ناطے اس کے آنے کو علماء اور عوام نے بہت ناگواری سے دیکھا اور اس کی وجہ سے پروگرام میں بھی زیادہ نظم و ضبط نہیں تھا۔

دوسرے دن حضرت نے فرمایا کہ میں آج ضرور جاؤں گا۔ ہم ساتھیوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ کچھ ایسی تدبیر کرو کہ حضرت نہ جاسکیں کیونکہ انتشار ہے کہ صحیح سالم آدمی نہیں جاسکتا تو ان کو وہیل چیئر میں کیسے لے جاسکیں گے۔ لیکن حضرت نے عزم بالجزم کیے ہوئے سختی سے کہا کہ میں جاؤں گا۔ چنانچہ کرسی میں بٹھا کر روانہ کیا گیا۔ حیرت کی انتہا کہ راستے میں کوئی تکلیف نہ ہوئی اور حضرت کی کرسی بغیر کسی تکلیف کے ہم نے ہجوم میں سے گذار دی۔ سٹیج جو تقریباً دس فٹ اونچا تھا فرمایا کہ ہم سٹیج پر جائیں گے۔ ہمیں تشویش ہوئی کہ منتظمین سے ہمارا تعارف نہیں، سکیورٹی پولیس کھڑی ہے، تو اس طرح کیسے ہم سٹیج تک پہنچیں گے۔ لیکن جس راستے سے گذرے گویا استقبال ہو رہا تھا۔ قریب ہونے پر سکیورٹی پولیس نے خود راستہ بنایا اور حضرت مولانا مع ہم سب خدام کے سٹیج پر پہنچ گئے۔ واقعی دوسرے روز کے پروگرام کا رنگ علمی اور روحانی تھا۔ اکابرین علماء کرام قاری طیب صاحبؒ، مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، مولانا عبیداللہ صاحب بستی نظام دین، مولانا مسیح اللہ خان

صاحب، مفتی محمود صاحبؒ، مولانا عبدالحق صاحبؒ، خان محمد صاحب سٹیج پر تشریف فرما تھے۔ ان کے علاوہ مصر کے وزیر معارف (وزیر تعلیم) عرب ممالک کے علماء و مشائخ کے وفود اپنی اپنی نشستوں پر رونق افروز تھے۔ حضرت ابوالحسن علی ندویؒ نے خطاب فرمایا، جو واقعی اجتماع کا نمائندہ خطاب تصور ہوا۔ دل کو بہت تسلی ہوئی اور اتنا سفر جو کیا تھا اس کا کچھ معاوضہ ہم لوگوں کو مل گیا۔ سٹیج پر حضرت ابوالحسن علی ندوی صاحبؒ سے حضرت مولانا کا مصافحہ کروایا گیا اور ان سے حضرت مولاناؒ نے اپنے لکھنو حاضر ہونے کا ارادہ ظاہر کیا۔ حضرت مولانا ابوالحسن ندوی صاحب نے آپ کے کچھ روز قیام کی خواہش ظاہر کی۔ باقی بزرگوں کی زیارت ہوئی اور دارالاقامت کو واپسی ہوئی۔ بندہ جمعہ کی نماز پڑھنے پنڈال گیا۔ اجتماع والے اجتماعی نماز جمعہ نہ کروا سکے۔ جماعت تین جگہ ہوئی۔ صفوں کی ترتیب درست نہ ہونے کی وجہ سے بندہ نے دو دفعہ نماز پڑھی۔ لیکن سلام پھیرنے پر امام اور اپنے رخ میں واضح فرق محسوس ہونے کی بنا پر دل کو تسلی نہ ہوئی لہٰذا بندہ نے اپنی نماز کو دہرایا۔ حضرت مولاناؒ پنڈال تشریف نہیں لے گئے تھے، دیوبند کی جامع مسجد میں ہی نماز پڑھی۔

عموماً ثواب کے کاموں میں کمی آنے کا حضرت کو دکھ اور قلق ہوتا تھا۔ اس لیے بندہ نے عرض کیا کہ آپ کے پنڈال نہ جانے میں حکمت تھی کہ وہاں نماز کی ادائیگی مشتبہ رہی۔ اس موقع پر رائے ونڈ والوں کا اجتماع یاد آیا کہ ان کے ہاں خوب نظم وضبط کا مظاہرہ ہوتا ہے، صفیں درست ہوتی ہیں اور نماز میں عموماً فرق نہیں آتا۔

اجتماع سے فارغ ہو کر ٹیکسی کرایہ پر لے کر دوسرے دن تھانہ بھون، گنگوہ، نانوتہ، جلال آباد کے قصبوں میں حاضری دی۔ تھانہ بھون کی وہ عظیم خانقاہ سامنے تھی، جس میں اکابرین سلسلۂ چشتیہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حافظ ضامن شہیدؒ، شیخ محمد تھانویؒ رونق افروز رہے اور جہاں بیٹھ کر ان تین حضرات نے مولانا قاسمؒ نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی موجودگی میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا منصوبہ بنایا۔ فتویٰ تیار کیا اور جسے چھاؤنی کے طور پر استعمال کر کے شاملی کے میدان میں لڑے۔ ہر تین افراد کے اتنے چھوٹے چھوٹے خلوت خانے تھے کہ بمشکل ایک آدمی سما سکے۔ خلوت خانے کے دروازے میں کالے نشان تھے، مقامی آدمی نے بتایا کہ یہ انگریزوں کی گولہ باری کے نشانات ہیں۔ جس دینی مرکز میں حاضری ہوتی حضرتؒ کا جذبہ ہوتا کہ وہاں چندہ ضرور دیا جائے یا کم از کم ان کے مکتبہ کی کچھ کتابیں ہوں تو وہ ضرور خریدی جائیں۔ بندہ نے تربیت السالک دو جلد وہیں سے خریدی۔

خانقاہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ کے دور کی تاریخ کو بھی لیے ہوئے تھی۔ ذاکرین کے لیے تقریباً چالیس حجرے موجود ہیں۔ اسی جگہ بیٹھ کر دین اسلام کی تجدید کا کارنامہ حضرت تھانویؒ کے ہاتھوں انجام پایا۔ تقریباً سو سے اوپر خلفاء کی تربیت کی اور ہزار سے اوپر کتابیں تصنیف کیں۔ یہاں سے فارغ ہو کر لکھنؤ حاضری ہوئی۔ ندوۃ العلماء میں پندرہ روز قیام رہا۔ حضرت ابوالحسن علی ندویؒ ندوہ میں ہی تشریف فرما تھے کیونکہ پاکستانی وفود حاضر خدمت ہو رہے تھے۔ مدرسہ والوں نے بتایا کہ حضرت ندوی مہمانوں کی وجہ سے یہاں قیام پذیر ہیں ورنہ ان کا زیادہ وقت آج کل رائے بریلی میں گذرتا ہے۔ جوں جوں عمر زیادہ ہوتی جا رہی ہے لکھنو میں ندوہ کا کام باقی حضرات کے حوالے کر کے خود ذکر و فکر اور یکسوئی کی زندگی رائے بریلی میں ہی گذار رہے ہیں۔ اور درس و تدریس وعظ و تقریر کی بجائے آنے والے مریدوں کی تربیت اور ذکر و فکر کی طرف زیادہ متوجہ ہیں۔ ہمیں محسوس ہوا کہ حضرت ندوی چاہتے ہیں کہ حضرت مولانا کا زیادہ سے زیادہ وقت ندوہ میں گذرے تاکہ وہ طلبا کے سامنے اتباع سنت اور تعلق مع اللہ کا عملی نمونہ آ جائے۔ طلباء اور اساتذہ بہت ہی محبت سے پیش آتے رہے۔

حضرت مولانا منظور احمد نعمانی کو اطلاع ہوئی تو مدرسہ ہی میں تشریف لے آئے، ان سے ملاقات ہوئی۔ سبحان اللہ الفرقان کے ایڈیٹر اور معارف الحدیث کے مصنّف جن کے علمی دبدبہ کی دھاک دلوں پر تھی، آج سامنے تھے۔ سوز و گداز اور عجز و نیاز کی تصویر۔ تھوڑی دیر اُن کے ساتھ بیٹھ کر دنیا کے فنا ہونے کی کیفیت دل پر طاری ہوئی اور آخرت کے جذبات میں اضافہ محسوس ہوا۔ ان آخری ایام میں ان پر بہت رقت تھی۔ پھر ایک بار حضرت نعمانی کے گھر بھی حضرت مولانا نے مع خدام کے حاضری دی۔ بہت شفقت سے پیش آئے اور ہمارے تھانوی تعلق کی بنیاد پر حضرت تھانویؒ کے حالات سناتے رہے۔ جب رخصتی ہونے لگی تو غالباً تین سو روپے ہدیہ عطا فرمائے اور ساتھ یہ فرمایا کہ یہ تھانوی ضیافت ہے اور عذر فرمایا کہ چونکہ اہلیہ کی وفات ہو گئی ہے اور گھر پر صرف ایک بچی ہے اس لیے آپ کے لیے کھانے پکانے کا بندوبست نہیں ہو سکتا لہٰذا یہی آپ حضرات کی دعوت ہے۔

حضرت ابوالحسن علی ندوی آرام اور انفرادی اوقات کے علاوہ مہمانوں کے ساتھ تشریف فرما ہوتے۔ مدرسہ کے علماء اور اہل شہر زیارت کے لیے حاضر ہوتے رہتے تھے۔ حضرت ندوی کم گو، گہری فکر میں ڈوبے ہوئے اور اکثر اوقات کسی دور منزل کو گھورتے ہوئے فکر و حزن کی تصویر بنے رہتے۔ کبھی کبھی مسکراہٹ چہرے

پر پھیلتی۔ ندوہ کے اساتذہ، عرب علماء اور حضرت مولانا کے سوالوں پر تھوڑی دیر کے لیے گویا ہوتے۔ بہر حال بندہ کے سامنے وہ شخصیت تھی۔ جن کی کتب پڑھ کر بندہ کے دل میں ان کے ساتھ ایک عجیب وابستگی تھی۔ اسلام اور دنیائے اسلام کے حالات کے بارے میں آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹے تھے اور جن کی سیرت سید احمد شہید کے پڑھنے سے راقم بارہا کچھ دیر تک گم سم ہو کر آنسو بہاتا رہتا تھا اور ایک عرصہ تک خیبر میڈیکل کالج کے طلباء کے سامنے اس کا درس دیا کرتا تھا جس کے دوران پوری مجلس پر ایک وارفتگی کی کیفیت طاری ہوتی رہی۔ سبحان اللہ آخر وہ شخصیت سامنے تھی اور ہم ان کی زیارت سے مسرور ہو رہے تھے۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد

رو ئے گل سر ندید یم و بہار آخر شد

ترجمہ: افسوس کہ آنکھ جھپکنے میں دوست کی صحبت کے لمحات ختم ہو گئے، پھول کے چہرے کو جی بھر کے دیکھا بھی نہیں کہ موسم بہار ختم ہو گیا۔

حضرت ندوی مہمانوں کا سلسلہ ختم ہونے پر رائے بریلی تشریف لے گئے۔ ہمارے دل میں رائے بریلی جانے کی تمنّا پیدا ہونے لگی اور ہوک اٹھنے لگی۔ وہاں کا اجازت نامہ نہیں تھا لیکن مدرسہ کی گاڑی میں چلے گئے۔ رات گئے رائے بریلی دائرہ شاہ علم اللہ پہنچے۔

لکھنؤ کے تکلف والے ماحول سے یہاں آ کر الفقرُ فخری کا نمونہ سامنے آیا۔ یہاں حضرت ندویؒ نے فقیرانہ شان والے حالات رکھے ہوئے تھے۔ رات بسر ہوئی۔ سحری کے وقت خانقاہ کے ماحول میں جہری ذکر کی صدا گونجنے لگی اور ایک کشش ذکر کے لیے محسوس ہونے لگی۔ بعد ناشتہ کے حضرت مولانا شاہ علم اللہ رحمۃ اللہ علیہ جدِ امجد حضرت ندویؒ کے مزار پر حاضر ہوئے جو ذرا اونچائی پر تھا۔ حضرت مولانا مراقب ہوئے اور دوران مراقبہ حسب عادت نعرہ مارا اور فرمایا کہ پورے علاقے پر ان کی نسبت کے انوارات چھائے ہوئے ہیں۔ حضرت ندویؒ نے فرمایا یہی بات حضرت تھانویؒ و حضرت مدنیؒ ہر دو حضرات نے فرمائی تھی۔ اس کے بعد اس مکان کی زیارت کی جس میں سید احمد شہیدؒ کی ولادت اور پرورش ہوئی تھی۔ وہ مسجد اور ندی دیکھی جہاں مجاہدین بالاکوٹ کی تربیت ہوئی تھی۔ شاہ علم اللہ رحمۃ اللہ علیہ سید احمد شہیدؒ کے بھی جد امجد ہیں۔ آہ آج اس جگہ کھڑا تھا جن بزرگ ہستی کی تحریک میں بقول والد صاحب بندہ کے پردادا نے بالاکوٹ کے مقام پر جام شہادت نوش فرمایا۔ اس جگہ بہت کشش ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد واپسی ہوئی۔ حضرت ندویؒ حضرت مولاناؒ

کے ساتھ بہت محبت اور قلبی تعلق کا رویہ فرما رہے تھے۔ دیرینہ واقفیت اور حضرت مولانا کی دینی خدمات نیز تصانیف کی وجہ بھی ہو سکتی تھی لیکن بعد میں بندہ کے تحقیق کرنے سے عجیب روحانی وجہ سامنے آئی اور اس بات کو پھر بندہ نے حضرت مولانا سے خود پوچھا بھی اور ان ہی کی زبانی سنا بھی۔

حضرت مولانا نے فرمایا کہ ایک دفعہ مدینہ منورہ میں حاضری ہوئی تو خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ ایک سرخ رنگ والی بس پاس سے گذر گئی پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علی سے کہو جب تک طلباء رہیں بند نہ کرے۔ خواب سے بیدار ہو کر غور کرنے لگا کہ اس خواب کا مطلب کیا ہے۔ خیر نماز کے لیے مسجد نبوی جانے لگے، بازار میں سے گذر رہے تھے کہ سامنے سے اسی رنگ کی بس گذری جو خواب میں دیکھی تھی اور اس پر لکھا ہوا تھا ''مدینہ یونیورسٹی''۔ خیر یہ تو سمجھ میں آ گیا کہ یہ پیغام مدینہ یونیورسٹی کے بارے میں ہے۔ اب اس سے متعلق شخصیت علی کون ہیں؟ غور کرنے پر خیال آیا کہ یہ حضرت ابوالحسن علی ندوی ہی ہو سکتے ہیں۔ وہ بھی حج پر تشریف لائے ہوئے تھے۔ ان کو یہ پیغام دیا تو فرمایا ''سبحان اللہ سبحان اللہ مولانا صاحب آپ نے تو ہمارا مسئلہ ہی حل کر دیا''۔ حضرت ندویؒ فرمانے لگے کہ سعودی حکومت نے ہم اساسی ممبران مدینہ یونیورسٹی کو بلایا ہوا ہے اور اس بات پر فیصلہ لینا چاہتے ہیں کہ آیا اس یونیورسٹی کو جاری رکھا جائے یا بند کر دیا جائے کیونکہ اخراجات زیادہ ہیں اور طلباء نہیں آ رہے۔ اب جب کہ آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام دے دیا تو مسئلہ ہی حل ہو گیا۔ چنانچہ اس بات پر حکومت نے فیصلہ دے دیا۔ اس کے بعد حضرت مولانا ندویؒ کو خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ عطر کی شیشی مولانا اشرف کو دے دو۔ آپ جو بیدار ہوئے تو وہ شیشی ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھے۔ یہ شیشی حضرت ندوی نے حضرت مولانا کے حوالے کی۔ اس شیشی کی حضرت مولانا نے اپنی حیات میں دو دفعہ زیارت کروائی۔ وفات کے وقت حسبِ وصیت اس کو کفن پر چھڑکا گیا۔ خالی شیشی حاضرینِ غسل کے کپڑوں پر ملی گئی۔

ندوۃ العلماء کے بڑے ہال میں حضرت مولانا کا بیان بھی ہوا۔ اور علماء و طلبا نے سید سلمان ندویؒ کے مسترشد ہونے کے ناطے بہت دلچسپی سے سنا۔ لکھنؤ کے تبلیغی مرکز والے حضرات تشریف لائے اور انہوں نے بھی شب جمعہ میں بیان کروایا۔ حضرت مولانا مدارس اور دینی مراکز میں کچھ نہ کچھ چندہ ضرور دیتے دلواتے تھے مگر ندوہ والوں نے کچھ بھی قبول نہ کیا اور مُصر رہے کہ آپ کی دعا ہی ہمارے لیے سب کچھ ہے۔

ندوہ کے بعد دہلی روانگی ہوئی۔ دہلی میں جمیعۃ العلماء ہند کے دفتر واقع بہادر شاہ ظفر میں ایک

رات قیام ہوا۔ حضرت مولانا اسعد صاحب مدنی مدظلہ تشریف فرما تھے۔ دوسری رات بستی نظام دین بنگلہ والی مسجد میں تبلیغی مرکز میں گذری۔ حضرت جی مولانا انعام الحسن صاحب بقید حیات تھے۔ حضرت نے بہت خوشی کا اظہار فرمایا اور رہائش کے لیے وہ کمرہ عنایت فرمایا جس میں حضرت مولانا الیاسؒ کا قیام رہا اور جس میں ان کی وفات ہوئی۔ مولانا محمد عمر صاحب پالن پوریؒ اور میاں جی محراب صاحب بیان و ہدایات فرماتے تھے۔ عشاء کو کتاب حیات الصحابہ حضرت جیؒ پڑھتے تھے۔ حضرت نے اپنے صاحبزادے حضرت مولانا زبیر صاحب کو حضرت مولاناؒ کی خدمت کے لیے مقرر فرمایا۔ حضرت کے ہاں ایک دسترخوان عمومی اور ایک بیرون ملک والا ہوتا تھا۔ حضرت مولانا کے لیے ان کے علاوہ دسترخوان لگوایا اور کئی طرح کے کھانے چنوائے۔ وہ روٹیاں بندہ نہیں بھولے گا جو مولانا زبیر صاحب تازہ بتازہ تنور سے پکی ہوئی اٹھا کر لا رہے تھے۔ ایسے یاد پڑتا ہے کہ یہ روٹیاں گھر سے لاتے رہے۔

مغرب کی نماز کے بعد حضرت جی اپنے حجرے سے باہر تشریف لائے۔ اس پر مرکز میں ہلچل مچ گئی۔ سیدھے حضرت مولانا کے پاس تشریف لائے اور فرمایا آپ ٹھہر رہے ہیں یا تشریف لے جاویں گے۔ حضرت نے فرمایا رات آپ کے پاس ہی قیام ہے۔ اس پر حضرت جی واپس حجرہ میں تشریف لے گئے۔ وہاں موجود احمد حسن صاحب جو رائیونڈ کے مقیم ہیں اور ان دنوں بستی نظام الدّین میں تھے نے فرمایا کہ حضرت جی مغرب تا عشاء حجرہ میں خلوت میں ہوتے ہیں اور کسی سے ملاقات نہیں فرماتے اوابین میں تقریباً سوا یا ڈیڑھ پارہ قرآن مجید پڑھتے ہیں۔ احمد حسن صاحب نے حضرت مولانا صاحب سے عرض کیا کہ یہ صرف آپ کی خاطر حضرت جی خلوت سے باہر تشریف لائے ہیں۔ صبح کا ناشتہ حضرت جی کے ہمراہ ہوا۔ حضرت مولانا نے اجازت چاہی۔ حضرت جی نے پوچھا مولانا کہاں کہاں تشریف لے گئے۔ حضرت نے عرض کیا۔ لکھنؤ، اعظم گڑھ، رائے بریلی وغیرہ۔

حضرت مولانا نے عرض کیا کہ حضرت اجازت نامہ رائے بریلی کا تو نہیں تھا بغیر اجازت کے ہی چلے گئے۔ حضرت نے مزاحاً فرمایا ''اس طرح اگر جایا کرتے ہیں تو کہا نہیں کرتے''۔ دراصل کافر حکومت کے ملک میں بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔ پھر حضرت مولاناؒ نے پچاس روپے ہدیہ میں پیش کیے تو حضرت جی نے مزاح میں فرمایا کہ تمہیں تو کرنسی ہی تھوڑی ملی ہے اس میں سے ہدیہ کیسے دیتے ہو۔ حضرت مولانا نے عرض کیا کہ یہ اس کے علاوہ ہم لائے تھے۔ واقعی وہ پاکستانی نوٹ تھا۔ اس پر مسکرا کر مزاح میں فرمایا کہ یہ تو خلاف

قانون کیا۔ خیر پچاس روپے ہدیۃً قبول فرمائے۔ حضرت جی کا یہ مکالمہ سنتے ہوئے بندہ کو ان کی طرف ایسی کشش ہورہی تھی کہ بڑھ کر ان کو چومنے کو دل چاہ رہا تھا۔ واقعی بہت ہی زیادہ پیارے بندے تھے۔ دہلی میں اولیاء اللہ کے مزارات ومقابر پر حاضری ہوئی، ایصال ثواب کیا اور حضرت مولانا مراقب ہوئے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ کے قبرستان اور نظام الدّین اولیاء رحمۃ اللہ کے قبرستان خاص طور سے یاد ہیں۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا قبرستان تو بدعات سے بالکل پاک ہے، کوئی مجاور وغیرہ نہیں ہے۔ لیکن نظام الدین اولیاءؒ کے مزار پر مجاور اور مختلف بدعات دیکھنے میں آئیں۔ دہلی سے اجمیر شریف کا سفر کیا اور خواجہ غریب نواز معین الدّین اجمیریؒ کے مزار پر حاضری ہوئی۔ مزار کا اتنا بڑا علاقہ ہے کہ اس کی تین مساجد ہیں۔ اکبر بادشاہ کی بنائی ہوئی مسجد جو ویران ہے، اس میں نماز نہیں ہوتی۔ شاہ جہاں کی بنائی ہوئی مسجد میں جمعہ ہوتا ہے۔ اور نگزیب عالمگیرؒ کی مسجد میں پانچ وقت نماز ہوتی ہے۔ اکبر بادشاہ کی بنائی ہوئی دو دیگیں ہیں، جن میں بیک وقت سو من اور اَسی من چاول پکتے ہیں۔ دیگوں کو سیمنٹ کی گول سیڑھیاں بنا کر ان پر رکھا گیا ہے۔ وہی سیڑھیاں چولہوں کا کام بھی دیتی ہیں۔ حضرت مولانا کا سیڑھیوں پر چڑھنے کا شوق ہوا۔ یہ چڑھانا بہت مشکل تھا۔ اٹھانے کا کام نعمان صاحب اور احمد خان صاحب کرتے تھے۔ احمد خان صاحب کا چونکہ بندہ کے ساتھ برخوردارانہ تعلق تھا۔ اس لیے بندہ نے کہا احمد خان صاحب حضرت مولانا کو اوپر دیگ کی سیڑھی پر چڑھاؤ۔ احمد خان صاحب کو بہت غصہ آیا اور گُھور کر دیکھا کہ آخر اس میں کیا فائدہ اور تُک ہے کہ دیگ پر چڑھایا جائے۔ خیر چار و نا چار احمد خان نے چڑھایا۔ جب اتارا تو بندہ نے حضرت مولاناؒ کی طرف دیکھا اور بندہ کے قلب میں فوراً یہ بات وارد ہوئی کہ احمد خان حج کے لیے منظور ہوگیا۔ بندہ نے اسی وقت احمد خان سے پشتو میں کہا کہ حج تو تمہارا انشاء اللہ ہوگیا۔ (چنانچہ اسی سال حسب معمول غیب سے حضرت مولاناؒ کا حج منظور ہوا۔ تو فوراً آپ نے فرمایا کہ ساتھ احمد خان کو بھی لے جائیں گے کیونکہ اٹھانے میں بہت باہمت ہے۔ نعمان صاحب کو یاد آیا تو کہا کہ یہ منظوری تو خواجہ اجمیریؒ کے ہاں ہی ہوگئی تھی، جب احمد خان نے حضرت مولانا کو پیٹھ پر اٹھا کر سیڑھی پر چڑھایا تھا۔)

مزار مبارک پر مجاور بیٹھے ہوئے تھے اور ایسی بدعات اور خرافات کروا رہے تھے کہ الامان والحفیظ۔

وہاں سے فارغ ہو کر ایک ہوٹل میں آئے جہاں قیام کرنا تھا۔ وہاں پہنچ کر حضرت مولانا نے فرمایا کہ مزار پر تو بالکل انوارات نہیں تھے لیکن یہاں اس ہوٹل سے مزار کے انوارات محسوس ہو رہے ہیں۔ شاید وہاں انوارات اس لیے محسوس نہیں ہو رہے تھے کہ مجاور حضرات بدعات وخرافات میں مصروف تھے۔ وہاں سے پھر دہلی واپسی

ہوئی۔

حضرت مولاناؒ اپنے ساتھیوں کی بڑی رعایت فرماتے تھے۔خود ہی فرمایا کہ ساتھیوں کو آگرہ اور فتح پورسیکری دکھانا چاہئے۔ چنانچہ آگرہ اور فتح پورسیکری کا سفر کیا۔آگرہ پہنچے تو سٹیشن سے تو ایک مسلمان رہبر نے ہمیں وصول کیا لیکن لے گیا ہندو ہوٹل میں۔حضرت نے فرمایا کہ چائے اور بسکٹ وغیرہ استعمال کریں اس کے علاوہ ذبیحہ وغیرہ والی کوئی چیز استعمال نہ کریں۔تاج محل پہنچے۔سنتے تھے کہ تاج محل دنیا کے سات عجائب میں سے ہے تو خیال ہوتا تھا کہ ایک عمارت کیا ہوگی جو عجوبہ بن سکے۔لیکن وہاں پہنچ کر جو عمارت کو دیکھا تو واقعی دل تسلیم کر رہا تھا کہ یہ عجوبہ ہے۔سفید سنگِ مرمر سے تراشی ہوئی عمارت بس دیکھ کر ہی فیصلہ کرنے کے قابل ہے۔وہاں سے فتح پورسیکری حاضری ہوئی۔فتح پورسیکری کے قلعے کی تعمیر کا رخ ایسے ہے کہ گرمیوں کے موسم میں ساری عمارات میں سامنے والی جھیل سے مسلسل ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آتے رہتے ہیں۔فتح پورسیکری میں ایک مسجد ہے، جس میں حضرت سلیم چشتیؒ کا مزار ہے،ان کے خاندان کا قبرستان ہے اور کچھ حجرے مدرسہ کے ہیں۔یہ سلیم چشتیؒ کا مدرسہ اور خانقاہ تھی۔سلیم چشتیؒ وہ بزرگ ہیں کہ اکبر بادشاہ باوجود دین الٰہی رائج کرنے کے سلیم چشتیؒ کی بزرگی کا قائل تھا۔ان کی دعا سے جہانگیر کی پیدائش ہوئی تھی اور اکبر نے جہانگیر کا نام سلیم، سلیم چشتیؒ کی یاد میں ہی رکھا تھا اور باوجود ساری خرافات کے اکبر یہ کہتا تھا کہ وہ مسلمان ہے۔حضرت سلیم چشتیؒ نے ملا دوپیازہؒ کو جو حضرت چشتیؒ کے مرید خاص تھے اکبر کے نورتنوں میں رکھوایا ہوا تھا اور ان کے ذمہ یہ فریضہ تھا کہ لطائف وظرائف وغیرہ کے ذریعے سے جیسے تیسے ہو اپنے آپ کو مقبول رکھنا ہے اور یہ کوشش کرنی ہے کہ اکبر کم ازکم یہ بات کہتا رہے کہ وہ مسلمان ہے اور اپنے ہندو ہونے کا اعلان نہ کرے۔ایک دن بیربل وغیرہ ایک ہندو جوگی کو لے آئے جو کچھ منتر پڑھ کر زمین میں دھنس کر گم ہو جاتا تھا۔پھر تھوڑی دیر بعد ذرا فاصلے سے نمودار ہو کر نکل آتا تھا۔ہندوؤں کا پروگرام تھا کہ اس جوگی کے ذریعے سے اکبر سے ہندو ہونے کا اعلان کروائیں گے۔اس دن دربار کو ایسا سیل (seal) کیا کہ اندر سے باہر اور باہر سے اندر کوئی نہیں آسکتا تھا۔ کسی طریقے سے ملا دوپیازہ حضرت سلیم چشتیؒ کو لے آئے، اکبر کھڑا ہو گیا اور حضرت کو اپنے پاس بٹھایا۔ حضرت نے پوچھا کہ کیا ہو رہا ہے؟ اکبر نے عرض کیا کی ہندو جوگی عجیب کرتب دکھا رہا ہے۔آپ نے دکھانے کو کہا اس پر وہ زمین میں ڈوب کر غائب ہو گیا۔حضرت نے وہاں اپنا قدم مبارک رکھا اور فرمایا کہ جوگی کو کہو کہ نکلے۔لیکن وہ نہ نکل سکا اور ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا۔

سلیم چشتیؒ کی مسجد سنگِ سرخ کی بنی ہوئی ہے اور مزار سفید سنگِ مرمر سے بنا ہوا ہے۔ درمیان میں گنبد ہے۔ سرخ و سفید کا امتزاج عجیب حسن پیدا کیے ہوئے ہے۔ دروازہ آبنوس کی لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ یہ لکڑی کالے رنگ کی ہے اور صفائی و ملائمت میں ایسی کہ گویا نفیس چمڑا ہو۔ قبر شریف سمندر کی سیپیوں کو جوڑ کر بنائی گئی ہے۔ ایسی خوبصورت کہ آج کی ٹائلیں اس کا جواب نہ لا سکیں۔ واقعی تاج محل، فتح پور سیکری، قطب مینار، لال قلعہ دہلی، جامع مسجد دہلی ایسی یادگاریں ہیں جو مسلم دور کی شان و شوکت اور عظمت کو اپنے اندر لیے ہوئے ہیں۔ بندہ نے پہلی مرتبہ حضرت مولاناؒ کو مزار پر مراقب ہوتے دیکھا تھا۔ چونکہ تعلق بے تکلفی کا تھا اس لیے بندہ نے عرض کیا کہ آپ مزارات پر مراقب ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ انوار نظر آئے۔ ہمیں تو کچھ پتہ نہ چل سکا۔ بندہ کا خیال تھا کہ اگر کچھ ہے تو ہمیں بھی بتائیں۔ یہ بات بندہ نے سلیم چشتیؒ کے مزار پر حاضری سے پہلے کہی تھی۔ جب مزار پر حاضر ہوئے تو کھڑے ہی ہوئے تھے کہ بغیر وجہ اور سبب کے بندہ پر رقت اور گریہ کی کیفیت طاری ہوئی اور ایسی کشش صاحب قبر کی طرف ہوئی کہ ساتھی فاتحہ پڑھ کر جانے لگے لیکن بندہ کا دل اٹھنے کو نہ چاہا، گویا صاحب قبر نے پکڑ لیا ہو۔ آخر ساتھیوں نے زور سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب وقت تھوڑا ہے اور ہم نے واپس جانا ہے۔ بندہ واپس تو چل پڑا لیکن دل اٹھنے کو نہیں ہو رہا تھا۔ تب پتہ چلا کہ واقعی مقابر کے انوارات اور کیفیات کیا ہوتے ہیں۔ سہارنپور مدرسہ مظاہر العلوم میں ایک شب کا قیام ہوا۔ حضرت مولانا طلحہ صاحب، حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ کے صاحبزادے اور مولانا شاہد صاحب حضرت شیخ الحدیث کے نواسے ہر دو حضرات نے بہت پرتپاک استقبال کیا۔ مدرسۂ سہارنپور کی زیارت ہوئی۔ پرانے مخطوطے اور نایاب کتابیں دیکھنی نصیب ہوئیں۔ ابوالفضل اور فیضی کی تفسیر ساطع الالہام پہلی بار یہیں دیکھی۔ اخوند درویزہ باباؒ جو پیر باباؒ کے بڑے خلیفہ تھے ان کی پشتو کی دو کتابیں تذکرۃ الابرار والاشرار اور مخزن الاسلام پہلی دفعہ یہیں دیکھیں۔ حضرات نے کئی طرح کے کھانے پکائے ہوئے تھے۔ مدرسہ کے احاطہ کی دو مساجد ہیں۔ مدرسہ کے علماء سے ملاقات ہوئی۔ صبح کا ناشتہ باقی وفود کو تو مدرسے میں دیا گیا لیکن حضرت مولانا اور خدام کو مع دیگر مشائخ کے حضرت شیخ کے کچے گھر میں دیا گیا۔ اس مکان میں حضرت شیخ کا ساری عمر ہجرت مدینہ سے پہلے قیام رہا۔ بعد نماز فجر ہم پہنچ گئے۔ اشراق تک حاضرین جہری ذکر میں مصروف رہے۔ بتایا گیا کہ مدینہ منورہ مدرسہ شرعیہ میں حضرت شیخ کے ہاں بھی اسی طرح بعد فجر تا اشراق ذکر جہری ہوتا ہے۔ یہ تقریباً ایک مہینے کا سفر اختتام پذیر ہوا اور پاکستان واپسی ہوئی۔

آپ کے معاملات:

انسان کے ایمان اور دین کا امتحان معاملات میں ہوتا ہے۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ تھوڑے ایمان سے عبادت کی توفیق تو ہو جاتی ہے لیکن اس تھوڑے ایمان سے معاملات درست نہیں ہوتے اس لیے کئی حضرات جو وضع قطع اور عبادات میں شریعت کے پابند ہوتے ہیں، معاملات کے کھوٹے نکلتے ہیں۔ بندہ کے سامنے حضرت مولاناؒ کے جو معاملات گذرے ان میں چند ایک کا تذکرہ ضروری ہے۔

پشاور صدر میں درمیانی بڑی سڑک پر آپ کی ایک جائیداد تھی۔ جس میں دکانیں اور فلیٹ تھے۔ جن پر عرصہ دراز سے کرایہ داروں نے قبضہ کیا ہوا تھا اور چھوڑنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ ان کے خیال میں حضرت مولاناؒ کی چونکہ کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے بعد وفات کے ان کا قبضہ پکا ہو جانا تھا۔ اس لیے وہ چھوڑنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ مجبوراً مقدمہ کرنا پڑا، جس پر تقریباً پچیس سال کا عرصہ لگ گیا۔ باوجود اتنی مقبولیت اور تائید کے جو عوام اور خواص میں آپ کو حاصل تھی اور باوجود جانباز مریدوں کے آپ نے کبھی کرایہ داروں کو ہراساں نہیں کیا اور صبر کا مظاہرہ کرتے رہے۔ جب مقدمہ جیت چکے اور قبضہ لیا جا رہا تھا۔ اور پولیس کے ہمراہ آپ کے ایک سو کے قریب مرید جن میں سے بعض مسلح تھے موجود تھے۔ لیکن ان کو بالکل جائیداد کے قریب نہیں ہونے دیا تاکہ کرایہ داروں کے بچے ہراساں نہ ہوں اور ان کی عورتوں کے پردہ میں فرق نہ آئے۔ بندہ چند ساتھیوں اور پولیس کے ہمراہ اندر داخل ہوا اور کرایہ داروں سے جگہ خالی کرنے کا کہا جو انہوں نے تھوڑی دیر میں خالی کر دی۔ اس قبضہ لینے میں پیر معصوم شاہ صاحب جو ماہر قانون دان تھے نے ہمارے ساتھ پوری کوشش فرمائی۔

دوسرا واقعہ یوں ہے کہ ایک پبلشر نے آپ کا محلّہ مقرب خان والا آبائی مکان کرایہ پر لیا ہوا تھا۔ اس نے کسی وقت اسکے خریدنے کا عندیہ ظاہر کیا۔ حضرت مولاناؒ نے بھی بیچنے کی خواہش ظاہر کی اور قیمت مقرر فرمائی۔ لیکن مکان کے وارث اکیلے آپ نہیں تھے اور بھائی بہن بھی تھے۔ جن کے حامی بھرنے کے بعد ہی شرعی بیع وشرا ہو سکتی تھی۔ لیکن پبلشر صاحب نے خواہش اور قیمت مقرر کرنے کو شرعی بیع وشرا سمجھ کر مکان پر قبضہ جما لیا اور غلط مواد پیش کر کے مفتیوں سے مشورے لینے لگا اور مولانا صاحب کو خوب پریشان کرنے لگا۔ آخر بات عدالت تک پہنچی اور مقدمہ چلنے کے بعد پبلشر صاحب کو مقدمہ ہار کر جگہ خالی کرنا پڑی۔ لیکن پبلشر صاحب کی کبھی مجلس میں نہ غیبت کی، نہ برا بھلا کہا اور نہ ہی کبھی اس کو بد دعا دی۔ اسی پبلشر صاحب نے

حضرت مولانا صاحبؒ کی کتاب پیام رسان امت چھپائی کے لیے لی۔ کچھ عرصہ کام کو معرضِ التوا (Post-ponment) میں رکھ کر اطلاع دی کہ اس کا مسودہ ہی گم ہو گیا ہے۔ ایک مصنّف کے لیے اس سے بڑا دکھ اور افسوس کیا ہو سکتا ہے کہ اس کے سالہا سال کی محنت شاقہ کے نتیجے کا مسودہ ہی گم کر دیا جائے۔ لیکن اس کو بھی آپ نے برداشت کیا اور صاحب موصوف کو بد دعا یا انتقام کا نشانہ نہیں بنایا۔

بندہ ایک عرصے تک حضرت مولاناؒ کا کرایہ دار رہا بندہ خود اور دوسرے کرائے دار کبھی پریشان اور ناخوش نہیں ہوئے۔ حضرت نے ہمیشہ ہمیں ہمارے حق سے بڑھ کر سہولتیں پہنچائیں۔ کبھی کرائے کی ادائیگی کے سلسلے میں پریشان نہیں کیا۔ ہمیں جس چیز کی ضرورت ہوتی تھی خود ہی خرید لیتے تھے اور پیسے ماہوار کرائے میں سے وضع کر لیتے تھے۔

دوران ملازمت حضرت کے رفقائے کار ہم عصریت اور مسابقت کا رویہ رکھتے رہے لیکن آپ شفقت اور محبت سے ہی پیش آتے رہے۔ جس طرح آپ نماز روزہ اور دیگر تعبدی اعمال کی پابندی فرماتے تھے اسی طرح سرکاری ڈیوٹی کو تندہی اور جانفشانی سے پورا فرماتے تھے۔ شعبہ عربی پشاور یونیورسٹی نے ایک سائیکل چپڑاسی کے استعمال کے لیے دے رکھی تھی جسے آپ کا خادم نعمان (طالبعلم شعبہ عربی) حضرت کے ذاتی کاموں کے لیے بھی استعمال کرتا رہا۔ یار لوگوں کو تو ملامت کا بہت اچھا موقع ہاتھ آتا رہا کہ سرکاری چیز ذاتی کام میں استعمال ہو رہی ہے۔ لیکن ریٹائرمنٹ کے وقت آپ نے ایک بالکل نئی سائیکل خرید کر ڈیپارٹمنٹ کے حوالے کی۔

بندہ کے پاس ایک ملازم نو سال کام کرتا رہا جس کا ذہنی توازن پوری طرح درست نہیں تھا۔ جس کسی کے پاس کام کرتا، مالک نالاں ہو کر فارغ کر دیتا تھا۔ اس کے ساتھ بندہ کا معاوضہ طے نہیں ہوا تھا۔ کھانا پینا لباس اور کچھ پیسے وہ لیتا رہا۔ نو سال بعد اس نے حضرت مولانا کے ہاں بندہ کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ جب معاملہ واضح طور پر طے نہیں ہوا تو یہ معاملہ معاملہءِ فاسد رہا۔ یہ معاملہ تب درست ہوگا جب مستاجر اور اجیر (مالک اور ملازم) کسی ایک معاوضے پر باہم راضی ہو جائیں۔ چنانچہ اس شخص نے پانچ ہزار روپے کا مطالبہ کیا۔ اس دور میں پانچ ہزار اچھی خاصی رقم تھی۔ حضرت مولاناؒ نے بندہ سے وہ پانچ ہزار روپے ملازم کو دلوائے اور ساتھ فرمایا کہ اس وقت اگر اس کو ادا نہیں کرو گے تو بروز قیامت اس کی طرف سے اللہ تعالیٰ فریق بن کر تم سے مطالبہ کرے گا۔ باوجودیکہ بندہ مولانا کا حاضر باش مرید اور ہر وقت کا

خادم تھا اور بندہ کا ملازم ایک اجنبی آدمی تھا لیکن حق کے خلاف حضرت نے بندہ کی کوئی حمایت نہیں کی۔

ایک مرتبہ بندہ نے ایک ساتھی سے موٹر کار خریدی موٹر کار ناقص نکلی، بہت افسوس ہوا چونکہ قیمت قسطوں میں ادا کرنی تھی اس لیے قسطیں ادا کرنے کو دل بالکل نہیں چاہتا تھا اور گاڑی واپس کرنے کا خیال ہوا۔ اس ساتھی نے حضرت کے پاس مقدمہ دائر کر دیا وہ چونکہ ابتدائی فقہ کی کتابیں پڑھا ہوا تھا اور اس کا علماء کے پاس بیٹھنا اٹھنا تھا اس لیے اس نے دو دلائل دیے۔ایک تو یہ کہ اس نے بیچتے وقت یہ واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ گاڑی کو ماہر مستری اور کسی سمجھدار آدمی کو دکھا دیا جائے اپنی تسلی کر کے لیں، دوسرے یہ کہ واپسی کی تین دن کی مہلت بھی گذر چکی ہے۔لہٰذا اس کا قیمت لینے کا حق ہے۔اس پر حضرت نے بندہ سے فرمایا کہ فقہی رو سے تم پیسے ادا کرنے کے پابند ہو۔ چنانچہ بندہ نے پوری قیمت ادا کی۔لیکن حضرت نے حق کے خلاف بندہ کی کوئی حمایت نہیں کی۔

حضرت کی برادری کے چھوٹے بڑے بہن بھائی اور انکی اولادیں نیز سسرال والے سب ہی میراث کی تقسیم یا دیگر خاندانی جھگڑوں میں آپ ہی سے فیصلہ کرواتے تھے اور آپ کی رائے سے اتفاق کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اہل حکومت کو مشکل کیسوں میں جرگہ اور فیصلہ کے لیے آپ ہی کی خدمات حاصل کرنا پڑیں۔

حضرت مولانا کی تربیت جہاں آخرت کے لحاظ سے آدمی کو محتاط اور متقی بنا دیتی تھی وہاں دنیا کے لحاظ سے بھی انتہائی ذمہ دار بنا دیتی تھی۔ چنانچہ اکثر خدام کو دنیا کے لحاظ سے کافی ترقی کرنے کے مواقع ملے۔ آپ کے خلفاء میر حاتم صاحب، شیر حسن صاحب، سراج صاحب، اور آپ کے مریدین میں سے عالم خان صاحب، خان بہادر صاحب، غلام ناصر صاحب، شاہ ولی صاحب بطور طلباء پشاور یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں داخل ہوئے۔ان کے ہم جماعت طلباء تو تھوڑا بہت پڑھ کر کچھ عام ملازمتوں پر چلے گئے۔لیکن مذکورہ بالا سب حضرات کو آپ کی بیعت نے اتنا ذمہ دار بنایا کہ یہ سب حضرات اندرون ملک یا بیرون ملک سے پی۔ایچ۔ڈی کر کے اہم پوسٹوں پر ملک وقوم کی خدمت کر رہے ہیں۔

حیرت انگیز واقعات:

تعلق مع اللہ کے نتائج میں اللہ کے خاص بندوں کو حیرت انگیز عطیات ملتے ہیں۔جن میں کرامات بصورتِ قبولیتِ دعاء، فراست اور شرح صدر کے عطا ہوتے ہیں۔جن کی وجہ سے ان کے ذریعے سے ایسے

واقعات وجود میں آتے ہیں جو عام اسباب کے بغیر ہو جاتے ہیں اور واقعی حیرت انگیز ہوتے ہیں۔ ذیل میں اسی فہرست کے کچھ واقعات درج کئے جاتے ہیں۔

برخوردار احمد خان ایف۔ ایس۔ سی کر کے میڈیکل میں سلیکٹ نہ ہونے کی وجہ سے دل برداشتہ تھے۔ اس اثنا میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مولاناؒ کی خدمت کی توفیق عطا فرمادی۔ یہاں سے میڈیکل کالج میں لیباٹری اسسٹنٹ کی ملازمت اختیار کرلی۔ لیکن حضرتؒ کی تربیت نے ایسا علمی جذبہ پیدا کیا کہ بی۔ اے اور ایم۔ اے کے امتحانات پاس کیے اور مقابلے کے امتحان میں شامل ہو کر سیکشن افسر بنے اور آج کل ڈپٹی سیکرٹری ہیں۔

ان کی سلیکشن کا بھی عجیب قصہ ہے۔ امتحان پاس کرلیا۔ انٹرویو بھی بہت اچھا ہوا۔ لیکن ایک دن بہت رنجیدہ اور اداس آئے اور کہا کہ مجھ سے پہلے والے تو سب امیدوار سلیکٹ ہو گئے اور مجھے چھوڑ دیا گیا۔ حضرت کی مجلس میں دعا ہوئی۔ راقم کی زبان سے بے اختیار نکل گیا کہ اللہ تعالیٰ غیب سے سامان پیدا فرما دے گا۔ چنانچہ جیسے کہ محکموں میں گھپلے ہوتے ہیں اس طور پر دو پوسٹیں محکمہ والوں نے چھپائی ہوئیں تھیں۔ اتفاقاً ایک آدمی کی زبردست سفارش ہوئی۔ اس کو پوسٹ دینے کا فیصلہ ہوا۔ لیکن اس کے نمبر احمد خان صاحب سے کم تھے۔ اب اس کو پوسٹ تب ہی مل سکتی تھی جب پہلے احمد خان صاحب کو سلیکٹ کیا جاتا۔ آخر پہلے احمد خان صاحب کو لیا گیا پھر دوسرے آدمی بھی منتخب ہو گئے۔

فضل ودود صاحب زرعی کالج میں ایک کلیریکل پوسٹ پر کام کرتے تھے۔ ایک دن مجلس میں ازراہِ مذاق حضرت مولاناؒ نے فرمایا ''بابو صاحب! عرصہ دراز ہوا آپ نے ضیافت کی تھی اور ایک مرغا کھلایا تھا۔ پھر پوچھا ہی نہیں'' بابو فضل ودود صاحب نے فوراً عرض کیا مولانا صاحب سیونٹین (Seventeen) مانگتا ہوں۔ یعنی ۱۷ گریڈ کی ترقی مانگتا ہوں۔ سب دوستوں نے بات کو مذاق میں ٹال دیا۔ کسی کو یہ وہم و گمان بھی نہ ہوا کہ فضل ودود صاحب کلیریکل پوسٹ سے ۱۷ گریڈ میں پہنچ جائیں گے۔ اللہ کی شان فضل ودود صاحب نے پرائیویٹ ایم۔ اے اسلامیات کیا اور سلیکشن بورڈ میں پیش ہو کر اسلامیہ کالج جیسے ادارے میں اسلامیات کے لیکچرر ہو کر گریڈ ۱۷ میں پہنچ گئے۔

دماغی امراض اس دور میں بہت عام ہوئے ہیں۔ دماغی امراض کے علاج میں جہاں دوائیں استعمال ہوتی ہیں۔ وہاں ماہرین امراض اس بات کو جانتے ہیں کہ ایسے مریضوں کو مناسب ماحول کی ضرورت

ہوتی ہے۔جس سے ان کی بیماری کے علاج میں بہت مدد ملتی ہے۔چنانچہ ایسے مریضوں کی دل بستگی کرنا (Reassurance) اوران کے دماغ کو بوجھ (Tension) والے خیالات سے خالی کرنا (Cath arcis-) دنیائے نفسیات اور دماغی امراض (Psychatric Diseases) کے میدان میں مانے ہوئے اصول ہیں۔ایسے بیماروں کی دل بستگی (reassurance) اور Catharcis میں حضرت کی بہت زیادہ خدمات ہیں۔اور کئی مریضوں کو اس طرح آپ کی برکت سے شفا ملی ہے۔چنانچہ ایک صاحب روشن دین نامی یہاں پشاور کے زرعی ٹریننگ انسٹیٹیوٹ میں ہوتے تھے۔جو دماغی مریض ہوگئے۔پورا محکمہ پریشان ۔کام کرنے سے رہ گئے۔راقم الحروف ان کو حضرت کی مجلس میں لایا۔روشن دین صاحب کو یہ خبط تھا کہ وہ بڑے شاعر ہیں کچھ تک بندی کرتے رہتے تھے۔جس میں نہ ربط نہ قافیہ، نہ مضمون نہ خیالات۔ان کا سارے معاشرے سے گلہ تھا کہ ان کا کلام نہیں سنا جاتا اور ان کی قدردانی نہیں ہوتی۔حضرت مولاناؒ اس بات کو بھانپ گئے۔جب وہ مجلس میں آتے تو کافی دیر متوجہ ہوکر آپ ان کا کلام سنتے اور داد دیتے۔یہاں تک کہ ان کا خوب دل لگ گیا اور انہیں افاقہ ہونا شروع ہوگیا۔ڈاکٹری علاج بھی وہ کرواتے رہے۔لیکن ان کو حضرت کی مجلس کی Reassurance اور Catharcis نے بہت فائدہ دیا۔

ایک طالب علم انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔کچھ وقت ان کا تبلیغی جماعت والوں کے ساتھ لگا تھا۔اس سے ان کا جذبہ ہر کسی کو دین کی دعوت دینے کا بن گیا تھا۔ان کے ہاسٹل کے پاس سے ایک شعبہ اردو کی ایم۔اے کی طالبہ گذرا کرتی تھی۔انہوں نے اسے دعوت دینے کی فکر کی۔لڑکی شوخ اور شریر تھی۔اس نے بھی اس سادہ لوح دیہاتی کا مذاق اڑانے کے لیے خوشگوار ردعمل کا مظاہرہ کیا۔نتیجۃً برخوردار اس کے عشق میں مبتلا ہوگئے۔اور ہوش وحواس کھو بیٹھے۔اس اثناء میں حضرت مولاناؒ کے پاس لائے گئے۔حضرت گویا اس کے رازدان بن گئے۔اور آدمی کو تسلی ہونے لگی کہ یہاں سے اس کا گوہر مراد مل جائے گا۔ایک مرتبہ وہ سیدھا حضرت کے پاس آیا اور کہا کہ مجھے ایسا تعویذ دو کہ مجھے وہ فوراً مل جائے۔حضرت نے ایسے ہی ایک کاغذ پر یہ لکھ کر کہ یا اللہ اس دیوانے کو شفا عطا فرما, کاغذ اس کو دے دیا۔برخوردار دوسرے دن مجھ سے ملا اور کہہ رہا تھا کہ حضرت مولانا کے تعویذ نے اس قدر اثر کیا کہ وہ تعویذ باندھ کر میں شب جمعہ کے اجتماع میں چلا گیا۔ (اس اجتماع میں صرف مرد جمع ہوتے تھے۔عورتیں وہاں آ ہی نہیں سکتی تھیں۔لیکن) برخوردار کہنے لگا کہ تعویذ باندھ کر جب میں شب جمعہ میں پہنچا تو وہ لڑکی وہاں آ گئی اور میری داڑھی کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

یہ اس کے تصورات (illusion) تھے۔ جو پاگل پنے کی وجہ سے اسے محسوس ہوتے تھے۔ خیر اس کا دماغی علاج (Psychatric Treatment) بھی شروع کروایا گیا۔ ساتھ حضرت Catharcis اور Reassurance بھی فرماتے رہے۔ کچھ عرصہ میں اللہ تعالیٰ نے شفا دے دی۔ لیکن اس کا دماغ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ پڑھائی بالکل نہیں کر سکتا تھا۔ آخر حضرت نے سفارش کروا کے ایک ماچس کی فیکٹری میں ملازمت دلوا دی۔

بندہ کے محترم دوست حاجی عبدالمنان صاحب اور سعید الرحمٰن صاحب دونوں حضرات محکمہ تعمیرات میں ایس۔ ڈی۔ او ہوتے تھے۔ دونوں نیک، صالح اور دیانتدار بندے تھے۔ دونوں نے اپنی چاہت سے اپنی تبدیلی ڈیزائین آفس میں کروائی ہوئی تھی۔ ایک تیسرے انجنیئر صاحب کو بطور سزا ان کی چاہت کے خلاف اس دفتر میں تبدیل کیا گیا تھا ان کی ترقی بھی رکی ہوئی تھی، یہ بیچارے بہت سخت پریشان اور مضطرب رہتے تھے۔ ایک دفعہ حاجی عبدالمنان صاحب اور سعید الرحمان صاحب دونوں حضرت مولانا کی مجلس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہمارے ساتھ ایک انجنیئر ہے جو ہر وقت اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخیاں کرتا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی شان میں مغلظ گالیاں بکتا رہتا ہے۔ مجلس میں دعا ہوئی کہ یا اللہ اس آدمی کو ھدایت نصیب فرما، یا تباہ و برباد فرما۔ ہفتہ نہیں گذرا تھا کہ آدمی توبہ تائب ہوا اور مجلس میں حاضر ہوا۔

خیبر میڈیکل کالج میں ملازم ہونے کے بعد بندہ کو یونیورسٹی اساتذہ کے ہاسٹل ایس۔ ٹی۔ سی میں جگہ ملی۔ یہاں جغرافیہ کے ایک استاد ڈاکٹر اسلم صاحب سے واقفیت ہوگئی۔ ہم اکثر کھانے، چائے وغیرہ پر اکٹھے رہنے لگے۔ نماز کے اوقات میں بندہ نماز کے لیے چلا جاتا، ڈاکٹر صاحب انتظار کرتے رہتے۔ کچھ دن بعد ڈاکٹر صاحب نے بھی نماز شروع کر دی۔ بندہ عموماً مغرب کی نماز کے لیے حضرت مولاناؒ کے پاس حاضر ہو جاتا۔ ڈاکٹر صاحب معترض ہو کر کہتے کہ تم چلے جاتے ہو اور میں اکیلا رہ جاتا ہوں۔ انھوں نے پوچھا کہ آخر تم جاتے کہاں ہو؟ بندہ نے بتایا کہ ایسے ایک بزرگ ہیں جن کی مجلس میں، میں شامل ہونے جاتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ''یار! مجھے بھی اُن بزرگوں سے ملنا چاہئے، لیکن میرے پاس تو پہننے کو شلوار بھی نہیں ہے، ہر وقت پتلون ہی پہنے رہتا ہوں۔'' بندہ نے کہا کہ اس کی کوئی فکر نہ کریں آپ پتلون پہنے ہوئے ہی مل لیں۔ ان کی ملاقات ہوئی، آمد و رفت شروع ہوئی، زندگی میں دینی تبدیلی آگئی۔ کچھ دنوں بعد بندہ نے ان سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب! تمہاری تو شادی ہونی چاہئے، کوئی جگہ بتاؤ۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے جغرافیہ ڈیپارٹمنٹ کی

ایک سٹوڈنٹ ہے اگراس سے شادی ہو جائے تو اچھا ہو۔ اسلامی اور علاقائی روایات کے مطابق لڑکی کے والدین سے ہی رابطہ کیا جا سکتا تھا۔حضرت مولانا سے عرض کیا۔ حضرت، پروفیسر محمد حسین خان (سابق وائس چانسلر زرعی یونیورسٹی) اور پروفیسر ڈاکٹر میر حاتم صاحب کے ہمراہ لڑکی والوں کے ہاں رشتہ مانگنے گئے۔لڑکی کے والد پاکستان کے صف اوّل کے کارخانہ داروں میں سے تھے جبکہ ڈاکٹر اسلم ایک سیکشن افسر کے بیٹے تھے۔اس لیے لڑکی کے والد نے صاف انکار کر دیا۔اس پر ڈاکٹر اسلم بہت دلبر داشتہ ہوئے۔ حضرت نے فرمایا ’’ڈاکٹر صاحب فکر نہ کریں انشاء اللہ جمعہ کے دن آپ کا نکاح پڑھیں گے‘‘۔ حالات کا اتار چڑھاؤ جاری رہا یہاں تک کہ آخر وہ جمعہ آیا جب حضرت نے جا کر ڈاکٹر صاحب کا نکاح اُسی لڑکی سے پڑھایا۔

نومبر ۲۰۰۰ء میں پروفیسر کمال صاحب نے اپنا ۱۹۷۳ء کا واقعہ بندہ کو سنایا کہ میں سٹوڈنٹ ٹیچر سنٹر کے ہاسٹل میں رہتا تھا۔اس ہاسٹل میں غیر شادی شدہ حضرات رہتے تھے۔ کمال صاحب جو ہاسٹل کے نگران اور وارڈن تھے انہی کے کمرے میں جُوئے کی مجلس ہوتی تھی، جس میں بے دین پروفیسر حضرات بیوروکریٹس اور خوانین شامل ہوتے تھے۔ بقول کمال صاحب انھوں نے تو گویا اپنی زندگی اسی کے لیے وقف کی ہوئی تھی اور اکثر وقت جاگتے رہتے تھے اور بہت کم سوتے تھے تاکہ مجلس آباد رہے۔ کہنے لگے ایک دفعہ رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی ان کو نیزہ مار رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ ٹھیک ہو جاؤ۔آنکھ کھل گئی سوچا کہ ایسے ہی وہم ہے ،کروٹ بدل کر سو گیا لیکن دوبارہ وہی خواب دیکھا۔ جاگنے پر سوچا کہ شاید کھانا زیادہ کھا لیا ہے جس سے پیٹ میں گیس جمع ہو گئی ہے اور ڈراؤنا خواب آ گیا۔ اُٹھا، کمرے میں چلا پھرا پھر سو گیا۔ تیسری بار پھر وہی خواب دیکھا اب جو بیدار ہوا تو خیال آیا کہ یہ محض پریشان خیالی نہیں بلکہ کوئی معنی خیز خواب ہے۔ اٹھا، پاک صاف ہو کر کپڑے پہنے اور صبح کی نماز کے لیے ہاسٹل کی مسجد پہنچ گیا۔ پروفیسر سراج صاحب (زرعی یونیورسٹی) جو نماز پڑھایا کرتے تھے سمجھے کہ یہ آدمی شاید ہنگامہ کرنے مسجد آ گیا ہے کیونکہ میرے نماز کے لیے مسجد آنے کا کوئی وہم وگمان بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سراج صاحب کو خواب سنایا اور ساتھ یہ سنایا کہ خواب میں کسی نے کہا ہے کہ ایسے شیخ سے بیعت ہو جاؤ جس کا ایک ہی بیٹا ہو۔ سراج صاحب نے تعبیر کے طور پر کہا کہ تمہیں مولانا اشرف صاحب کے پاس لے کر جاؤں گا ان کا ایک ہی خلیفہ ہے۔ جس کے ساتھ ان کو بیٹے جیسی محبت ہے۔ واضح رہے کہ ان دنوں حضرت مولاناؒ یونیورسٹی والوں کی ہدایت کی بہت زیادہ دعائیں فرماتے تھے۔ سراج صاحب، کمال صاحب کو حضرت مولاناؒ صاحب کے پاس ان کے گھر لے گئے۔ گھر پر حضرت مولانا عصر تا مغرب مختصر سی مجلس

فرمایا کرتے تھے اس روز بجائے تصوّف اور اصلاح نفس کے تبلیغی جماعت والوں کے ساتھ جانے کی ترغیب دی اور چار مہینے کے لیے اللہ کے راستے میں نکلنے کا مطالبہ کر دیا۔ کمال صاحب کہتے ہیں کہ میں نے چار مہینے لکھوا دیے اور نکل کھڑا ہوا۔ بعد چار ماہ اس حال میں واپسی ہوئی کہ زندگی مکمل تبدیل ہو چکی تھی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت مولاناؒ کے ایک مرید سلطان حنیف اورکزئی جو ایم۔اے پولیٹیکل سائنس کے طالبعلم تھے پشاور یونیورسٹی میں پھر رہے تھے کہ ان کی ملاقات دو نوعمر انگریز لڑکوں سے ہوئی جو کیلیفورنیا سے آئے ہوئے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ پاکستان کے صوفیاء سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔ سلطان صاحب انھیں حضرت مولانا کی ملاقات کو لے آئے۔ بندہ مجلس میں موجود تھا ان دونوں صاحبان نے حضرت مولانا سے عرض کیا کہ please take us to the fifth plane where the souls of pious people live (کہ جناب ہمیں پانچویں طبق پر لے جائیں جہاں صالحین کی ارواح ہوتی ہیں) حضرت نے ان سے پوچھا کہ کیا تم توجہ لینا اور توجہ دینا جانتے ہو۔ انھوں نے ہاں کہا۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ تم متوجہ رہو، میں تمھیں توجہ دوں گا۔ حضرت مولانا نے توجہ دینی شروع کی درمیان میں زور سے اللہ اللہ کا نعرہ حضرت کی زبان سے نکلا۔ ان لڑکوں نے کہا کہ so easily you took us to the fifth plane (اتنی آسانی سے آپ نے ہمیں پانچویں طبق پر پہنچا دیا)۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ پھر انھوں نے کہا کہ اب ہم پر کوئی خاص توجہ کرو۔ جوں حضرت متوجہ ہوئے تو کیلیفورنی جوان نے کہا please stop if you donot stop i shall be in need of an ambulance to shift me to the hospital . (جناب رکیے اگر آپ نہ رکے تو مجھے ایمبولینس کی ضرورت ہوگی جو مجھے ہسپتال پہنچائے۔) دراصل وہ آپ کی شدّت توجہ کو برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ ان سے پوچھا کہ تم نے یہ چیز کہاں سے حاصل کی ہے؟ انھوں نے بتایا کہ ہمارے ایک استاد ہیں، جنہوں نے رومی کے لٹریچر سے روحانیت حاصل کی ہے، ان سے ہم نے سیکھا ہے۔ پوچھا کہ آپ نے کیا سیکھا ہے۔ جواب میں انھوں نے بتایا he has instructed us to follow shareya (اس نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم شریعہ کی پابندی کریں)۔ مولاناؒ نے ان سے پوچھا کہ شریعہ کیا چیز ہے۔ انھوں نے بتایا کہ جھوٹ نہ بولیں، سچ بولیں، ظلم نہ کریں انصاف کریں۔ خدمت خلق کریں۔ تب اندازہ ہوا کہ ان کا مقصد شریعت کی پابندی کرنا ہے۔ دوسرا انھوں نے بتایا کہ he has advised us to practice an

exercise (اس نے ہمیں ایک مشق کرنے کو کہا ہے) ان سے پوچھا کہ مشق کیا ہے تو وہ لہک لہک کر ھُو حق کا ذکر کرنے لگے۔ بالکل ایسے جیسے چشتیہ یا قادریہ حضرات ضربوں کے ساتھ جہری ذکر کرتے ہیں۔ تب پتہ چلا کہ انھوں نے بغیر کلمے، آخرت اور رضائے الٰہی کی نیت کے محض نفسانی کمالات حاصل کرنے کی نیت سے یہ سب کچھ سیکھا ہوا تھا۔ چند مجالس میں وہ آئے اور آخر میں مسلمان ہوگئے۔ واقعی

دمِ عارف نسیمِ صبحدم ہے　　　اسی سے ریشہ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسر　　　شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

ایک مرتبہ رائیونڈ جارہے تھے۔ کچھ یونیورسٹی کے طلباء واساتذہ اور کچھ شہر کے حضرات تھے۔ حضرت مولاناؒ بھی ساتھ تھے۔ شدید گرمی تھی غم ہو رہا تھا کہ سفر میں بہت تکلیف ہوگی۔ جوں ہی پشاور سے ریل چلی بادل چھاگئے اور رائیونڈ تک بادلوں کا سایہ رہا۔

بندہ کی شادی تھی جمعہ کا دن تھا سخت بارش شروع ہوگئی۔ اسی حال میں جمعے کی نماز کو گئے۔ بعد جمعہ کے رخصتی کے لیے جانا تھا۔ نماز کے بعد لوگوں نے درخواست کی کہ حضرت دعا فرمائیں کہ بارش رک جائے۔ حضرت نے دعا فرمائی چنانچہ سنتیں پڑھنے کے بعد ہم اس حال میں باہر نکلے کہ بارش رک گئی تھی اور دھوپ چمکنے لگی تھی۔

میاں بشیر احمد صاحب کاکاخیل اسلامیہ کالجیٹ سکول کے ٹیچر تھے۔ ان کا مقابلہ روح الامین صاحب سے ہوا۔ روح الامین صاحب پرنسپل بنادیے گئے۔ میاں بشیر صاحب دلبرداشتہ ہوئے کہ حضرت کا مرید! اور پیچھے رہ گیا۔ اللہ کی شان میاں بشیر صاحب ایجوکیشن انسٹیٹیوٹ کے لیکچرر ہوئے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی ہوئے اور ڈائریکٹر ہوکر ریٹائر ہوئے۔

حضرت مولاناؒ کی اہلیہ نے بندہ کی اہلیہ کو بتایا کہ ایک مرتبہ ایک ڈاکٹر صاحب کی نوبیاہتا دلہن بغیر دوپٹہ اوڑھے جدید لباس میں حضرت کے پاس آگئیں۔ بعض خاندانوں میں پردے کا رواج نہ ہونے کی وجہ سے اچھے ذہن کی نیک عورتیں بھی اس بات کو عیب نہیں سمجھتیں۔ موصوفہ جوں سامنے ہوئیں حضرت کی زبان سے بے ساختہ نکلا یا اللہ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امّت کو ہدایت نصیب فرما۔ اسکی زندگی میں ایسی تبدیلی آئی کہ ساری عمر کے لیے ایسی باپردہ ہوئی جس کی مثال کم ہے۔ حضرتؒ کی وفات کے بعد ان کا بندہ کے ساتھ اصلاح کا تعلق ہوا تو حیرت ہوئی کہ اصلاح کے بارے میں حضرت تھانویؒ کی ترتیب کا انھیں قابل رشک فہم

ہے۔

راقم الحروف خیبر میڈیکل کالج میں بطورِ ڈیمانسٹریٹر کام کررہا تھا ایک دن حاضر خدمت ہوا اور عرض کیا کہ میں ایم۔فل میں داخلہ لینا چاہتا ہوں۔ پوچھا کیوں؟ عرض کیا کہ بغیر اس کے پرموشن نہیں ہوتی۔ حضرت نرم طبع شخصیت تھے، بہت کم غصّے کا مظاہرہ فرماتے تھے لیکن اس دن میرے اس جواب پر بہت جلال کی کیفیت کے ساتھ ارشاد فرمایا ''کیا میرا اللہ آپ کو ایم۔فل کے بغیر پروموٹ نہیں کرسکتا؟'' بندہ کو اندازہ ہوا کہ حضرت کا منشاء نہیں ہے۔ چنانچہ ارادہ ترک کردیا۔ بندہ سے تقریباً آٹھ سال سینئر ایک لیڈی ڈاکٹر تھی، وہ ایم۔فل کے لیے چلی گئی۔ چند ہی دنوں بعد اسسٹنٹ پروفیسر کی پوسٹ کا اشتہار آ گیا۔ بندہ کے کوائف تو پورے نہیں تھے لیکن توکلاً درخواست دے دی۔ وہاں پانچ سالہ تجربہ مانگا گیا تھا۔ بندہ کا چار سالہ تجربہ تھا لیکن خلافِ توقع ایک سالہ ہاؤس جاب کو بھی شامل کرکے درخواست منظور ہوگئی۔ صوبائی پبلک سروس کمیشن میں پیش ہوا تو پتہ چلا کہ بندہ پورے صوبہ سے واحد امیدوار ہے۔ انٹرویو ہوا اور بندہ اسسٹنٹ پروفیسر منتخب ہو گیا۔ وہ لیڈی ڈاکٹر صاحبہ ایم۔فل کرکے واپس آئیں تو باوجود ایم۔فل اور آٹھ سالہ سنیارٹی کے بندہ سے جونیئر تھیں۔ وہ بہت جزبز ہوئیں اور کہا کہ میں ہائی کورٹ میں مقدمہ کروں گی۔ لیکن چونکہ ساری کاروائی اور سلیکشن قواعد وضوابط کے مطابق ہوئی تھی اس لیے کچھ نہ کرسکیں۔ حضرت کی دعا کی برکت تھی کہ بندہ صرف ایم۔بی۔بی۔ایس ہوتے ہوئے سنیارٹی لسٹ میں ایم۔آر۔سی۔پی، ایف۔آر۔سی۔ایس اور ایم۔فل لوگوں سے سینئر رہا۔

دوبارہ بندہ نے ۱۹۸۶ء میں حضرت سے خفیہ لاہور میں ایم۔فل کے داخلے کی کوشش کی۔ داخلہ نہ مل سکا۔ مجبوراً رائیونڈ کے اجتماع کے دوران حضرت سے عرض کیا کہ ایم۔فل کے داخلے کی کوشش کی تھی لیکن داخلہ نہ ہوسکا۔ حضرت نے دعا فرمائی اور فرمایا کہ دوبارہ جاکر کوشش کرو۔ بندہ دوبارہ گیا وہی پروفیسر صاحبہ جنھوں نے داخلہ رد کیا تھا راضی ہوگئیں اور بغیر تکلیف کے داخلہ ہوگیا۔

ایم۔فل کا کورس مشکل ہونے کی بناء پر بہت تکلیف درپیش ہوئی۔ اور خطرہ محسوس ہوا کہ پاس نہیں ہوسکوں گا۔ خارجی ممتحن (External examiner) پشاور سے گئے۔ انھوں نے بندہ کی پروفیسر کو خوش کرنے کے لیے سوالوں کے کل نمبر (total marks) میں تو پاس کردیا لیکن اندر شیٹ میں چھ نمبر کم لکھے ہوئے تھے۔ ایسی شیٹ کو جب دوبارہ چیک کرنے والا آدمی دیکھتا ہے تو ایسا طالبعلم ٹوٹل کی غلطی درست

ہوکر فیل تصور کیا جاتا ہے۔ بندہ نے حضرت کو خط لکھا جس میں اس پریشانی کا تذکرہ کیا۔ پشاور حاضری ہوئی تو آپ نے فرمایا ''ڈاکٹر صاحب آپ نے تو مجھے پریشان کر دیا۔ میں نماز سے لے کر بیت الخلاء تک ہر وقت تمہارے مسئلے کے دھیان میں رہا۔ چنانچہ پنجاب یونیورسٹی نے نتیجہ نکالنے سے پہلے پرچہ بندہ کی داخلی ممتحنہ (internal examiner) کو بھیجا اور رائے طلب کی تو انھوں نے اپنے سوال پر چھ نمبروں کا اضافہ کیا اور پاس کیا۔

ڈاکٹر نعمان صاحب بطورِ طالبعلم ایم۔اے عربی آپ کے شاگرد ہوئے۔ شروع سے ہی انھوں نے آپ کی خدمت کے لیے کمر باندھ لی اور دن رات انتھک خدمت کی، ان کی خدمت آپ کو اتنی پسند آئی کہ فارغ ہونے کے بعد انھیں حضرت نے جانے نہیں دیا۔ حضرت کو یونیورسٹی کی طرف سے ایک ذاتی نوکر رکھنے کی اجازت تھی۔ اس پوسٹ پر نعمان صاحب کو لگا دیا، وہ بخوشی کام کرتے رہے۔ اس اثناء میں انھیں پبلک سروس کمیشن سے محکمہ تعلیم میں لیکچررشپ کی کال ملی لیکن حضرت نے جانے نہیں دیا اور بجائے اس کے یونیورسٹی پبلک سکول میں ٹیچر بھرتی کرا دیا، وہاں سے یونیورسٹی امپلائیز کی سیٹ پر ایم ایڈ کرنے کا موقع مل گیا۔ نعمان صاحب نے بتایا کہ وہ حضرت کے ساتھ حج پر تھے کہ مولانا صاحب نے ایک موقع پر مطاف میں بہت لمبی دعا کی۔ نعمان صاحب کہتے ہیں کہ خیال ہوا کہ میں بھی دعا کی درخواست کروں۔ جب حضرت نے دعا ختم فرمائی تو نعمان صاحب سے کہا ''بیٹا آپ کی لیکچررشپ منظور کروالی ہے۔'' چنانچہ جب حج سے واپسی ہوئی تو تھوڑے دنوں بعد ہی اللہ نے ادارہ تعلیم و تحقیق میں لیکچرر بنا دیا۔

بندہ کی جب بطورِ پروفیسر ترقی ہونے لگی تو بندہ سے دو سینئر حضرات جو بندہ سے پیچھے رہ رہے تھے بندہ کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے اور ہائی کورٹ، سروسز ٹرائبونل اور سپریم کورٹ میں مقدمے دائر کرائے۔ حضرت کی دعا سے بندہ ہر جگہ کامیاب ہوا۔ پروموشن فائل وزیرِ صحت سے ہو کر بذریعہ چیف سیکرٹری وزیرِ اعلیٰ تک جاتی تھی۔ اتفاقاً وزیرِ صحت بندہ کے مخالف کے ہم قوم ہونے کے علاوہ انکے ذاتی دوست بھی تھے۔ وزیرِ صحت نے پانچ پیراگراف بندہ کے خلاف لکھے اور پروموشن پر disagree (نامنظور) لکھا۔ بندہ دعا کے لیے حضرت کے پاس حاضر ہوا۔ حضرت نے خاموشی سے دعا فرمائی دورانِ دعا حضرت کے قلب سے بندہ کے قلب پر ایک جملہ "علی رغمِ انفِ وزیر" وارد ہوا۔ بندہ کو اسکے معنی نہیں آتے تھے۔ نعمان صاحب سے پوچھا کہ اس کے کیا معنی ہیں تو انھوں نے بتایا کہ اس کے معنی ہیں کہ وزیر کا دل چاہے یا نہ چاہے یہ کام ہو۔ چنانچہ

فائل لاءڈیپاٹمنٹ بھیجی گئی اس کے جواب پر چیف سیکرٹری نے جملہ لکھا The minister wants to supercede the decesion of highcourt and supreme court. یعنی وزیرِصحت ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے فیصلے سے آگے نکلنا چاہتا ہے۔اور وزیرِاعلیٰ کو واضح الفاظ میں پروموشن سے اتفاق کی رائے دے دی، وزیرصاحب دیکھتے کے دیکھتے رہے اور بندہ پروموٹ ہوگیا۔

ایک مرتبہ رمضان کے مہینے میں یونیورسٹی کے پاس جو آپ کا ذاتی مکان تھا اس محلے کے لوگ آئے اور شکایت کی کہ پرنسپل اسلامیہ کالج ارباب سکندر حیات صاحب نے ہمارے محلے کا یونیورسٹی کی طرف جانے والا راستہ بند کردیا ہے۔حضرت نے افطار کے بعد پروفیسر شیر حسن صاحب اور بندہ کو ارباب صاحب سے بات چیت کرنے کے لیے بھیجا۔شیر حسن صاحب نے انتہائی عاجزی سے پشتو زبان کے ایک مخصوص محاورے کا سہارا لیتے ہوئے بات کی کہ جی جب انسان کا ہاتھ ٹوٹ جاتا ہے تو وہ اسی کے گلے میں ڈالا جاتا ہے۔مطلب یہ تھا کہ ہمیں اگر تکلیف پہنچی ہے تو ہم آپ ہی کے ہیں۔لیکن اس کے جواب میں ارباب صاحب سے سختی کا جواب ہوگیا۔ہم دونوں واپس ہوئے۔ارباب صاحب چونکہ اچھے ایڈمنسٹریٹر تھے اور بندہ کو پسند تھے اس لیے بندہ کا خیال تھا کہ حضرت مولانا سے اس کا تذکرہ نہیں کریں گے۔شیر حسن صاحب بھی ایسی شخصیت ہیں کہ اجتماعی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دیتے ہیں لہٰذا انکی بھی یہی رائے تھی۔لیکن اہلِ محلّہ نے حضرت کے سامنے منفی بیان دے دیا۔حضرت نے فرمایا ''اچھا!''۔بندہ کو فوراً خطرہ ہوا کہ پرنسپل شپ گئی۔چنانچہ رمضان کے بعد ارباب صاحب کی پرنسپل شپ ختم ہوگئی اور انکی جگہ ڈاکٹر عبدالمتین صاحب پرنسپل مقرر ہوگئے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ بندہ حضرت کی مجلس سے فارغ ہوکر عشاء کے بعد گھر کی طرف آرہا تھا کہ یونیورسٹی کے دھوبی گھاٹ والے ٹیوب ویل کے پاس بلا سوچ وتفکر کے بندہ کے قلب پر یہ بات وارد ہوئی کہ حضرت مولانا قُطب ہوگئے ہیں۔بندہ نے سوچا کہ حضرت ہمارے شیخ ہیں لہٰذا کچھ بھی ہوں ہمارے لیے تو قطب ہی ہیں۔بقول شخصے '' پیر گرچہ خس است ،برائے مرید بس است''۔اس کے چند دن بعد حضرت نے اپنے کتب خانے کی صفائی کا حکم دیا۔اس کے لیے ساری کتابیں اور ریکارڈ الماریوں سے اتارا گیا۔کام کرنے والے حضرات کام کررہے تھے کہ بندہ کی نظر ایک تحریر پر پڑی۔یہ تحریر غازی مرجان صاحب کی تھی۔موصوف حضرت مولانا کے خلیفہ ہیں اور تبلیغی جماعت کے ساتھ زندگی وقف کرکے مدینہ منورہ میں ہی مقیم ہیں۔اشراق اور ظہر کے درمیانی وقت کے علاوہ پورا دن مسجد نبوی میں ہوتے ہیں۔تحریر میں انھوں نے لکھا

تھا کہ روضہ شریف پر صلوٰۃ وسلام پڑھ کر وہیں بیٹھا ہوا تھا کہ خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوگئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم اشرف کی طرف سے سلام پڑھتے ہو؟''۔ غازی مرجان صاحب نے جواب دیا ''جی حضور''۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''وہ تو قطب ہیں''۔ میں نے عرض کیا کہ اس بات کی ان کو اطلاع کر دوں۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب وہ میرے شہر میں آئیں تو پھر انھیں کہہ دینا''۔ غازی مرجان صاحب کہتے ہیں کہ مجھے پورا یقین ہوگیا کہ حضرت اس دفعہ حج پر ضرور تشریف لائیں گے۔ چنانچہ دوران حج غازی مرجان صاحب نے یہ خوش خبری آپ کو سنائی۔ آپ کے اخفاء کا کمال تھا کہ کسی کے سامنے اسکا تذکرہ نہیں کیا۔ بندہ کو بھی اس تحریر کے ذریعے ہی پتہ چلا۔

کشمیر خان نامی ایک طالبعلم پشاور یونیورسٹی کے انجینئر نگ کالج میں زیر تعلیم تھا۔ یہ حضرت مولانا سے بیعت تھا۔ اس نے فائنل ایئر انجینئر نگ کا امتحان دیا۔ بہت اچھے نمبر تھے لیکن ایک مضمون میں مکمل فیل تھا۔ اسے فائنل کے امتحان کے بعد حضرت نے چار مہینے تبلیغی جماعت کے ساتھ گذارنے کے لیے رائیونڈ بھیجا ہوا تھا۔ تبلیغ والے حضرات کی مخالفتوں اور ناگواریوں کے باوجود آپ اپنے متعلقین کو چلے، چار مہینے لگانے کے لیے بھیجتے رہتے تھے۔ برخوردار کو نتیجے کی اطلاع ملی۔ اسے پورا یقین تھا کہ وہ مضمون میں فیل نہیں ہے۔ یہ بات اس نے رائیونڈ والوں کے مشورے میں رکھی۔ ان دنوں رائیونڈ کا کام ماہوار مجلس شوریٰ کے تحت آگیا تھا اور دنیا بنے یا بگڑے حالات کیسے ہی ہو جائیں، ہر چیز کی پرواہ کیے بغیر چار مہینے لگوانے کی ترتیب بدل چکی تھی۔ چنانچہ مشورہ والوں نے کشمیر خان سے کہا کہ آپ واپس جا کر اپنے مسئلے کو درست کریں اور چار مہینے کے لیے پھر آجائیں۔ (کیونکہ اس ترتیب سے سال ضائع ہونے سے بچ رہا تھا۔) کشمیر خان نے یونیورسٹی آکر ڈیٹیل مارکس سرٹیفکیٹ لیا تو پتا چلا کہ مذکورہ مضمون کے پریکٹیکل میں پچاس میں سے صفر نمبر لگے ہوئے ہیں۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا وہ آکر حضرت مولانا کے ہاں ہی پڑ گیا۔ حضرت مولانا نے متعلقہ پروفیسر سے معلومات کروائیں۔ پروفیسر اقبال حسین شاہ صاحب ایک سیدھے مزاج والے (straight forward) اور مہربان شخصیت تھے۔ انھوں نے واضح طور پر بتا دیا کہ نمبر تو چالیس تھے لیکن مجھ سے لکھنے میں غلطی ہوئی اور ایوارڈ لسٹ پر مجھ سے صفر '0' لکھا گیا۔ یونیورسٹی کے قوانین جاننے والے اس بات کو جانتے ہیں کہ ایسے کیس کا کوئی حل نہیں۔ خیر حضرت مولانا نے اپنے مرید پرنسپل اسلامیہ کالجیٹ سکول کو وائس چانسلر پروفیسر اسماعیل سیٹھی صاحب کے پاس بھیجا اور صورتحال بتائی۔ سیٹھی صاحب حضرت مولانا کے بہت قدردان تھے۔ انھوں

نے کہا کہ اگر مذکورہ پروفیسر لکھ کر دے دے تو کچھ کریں گے۔ پروفیسر صاحب نے بلا جھجک لکھ دیا۔ سیٹھی صاحب نے وائس چانسلر کے اختیارات کا وہ خصوصی دفعہ استعمال کرتے ہوئے جس کے تحت وہ ہنگامی صورتحال (crisis) کے وقت سارے قوانین سے بالاتر کام کرسکتا ہے، برخوردار کو پاس کر دیا۔ وہ برخوردار پوزیشن کے ساتھ پاس ہوا۔ یہ شاید پشاور یونیوسٹی کی تاریخ میں منفرد واقعہ ہو۔

حضرت مولانا یوسف بنوریؒ کی وفات کے بعد بندہ نے خواب دیکھا کہ حضرت بنوریؒ مدینہ مسجد پشاور یونیورسٹی میں قبلہ رُخ تشریف فرما ہیں۔ انکی آنکھیں سرخ ہورہی ہیں جیسے کہ بہت زیادہ سوز وگداز اور گریہ کی حالت میں ہوتی ہیں۔ انکی بائیں جانب انکے مدرسے کے اساتذہ مع حضرت مولانا یوسف لدھیانویؒ تشریف فرما ہیں۔ حضرت مولانا اشرف صاحب اپنے مریدوں کے ساتھ حضرت بنوریؒ کے سامنے تشریف فرما ہیں۔ اس اثناء میں صوبہ سرحد کا گورنر عبدالحکیم خان قبلے کی طرف سے حضرات کی طرف آرہا ہے۔ بندہ کے دل میں فوراً خیال آیا کہ انکے استقبال کے لیے اٹھنا چاہئے لیکن ہم ایسی ہستیوں کے ہم مجلس ہیں کہ اس طرح اٹھنا سوءِ ادب ہے۔ بندہ نے حاضر خدمت ہوکر حضرت کو خواب سنایا۔ حضرت نے فوراً فرمایا کہ عبدالحکیم خان سے میری ملاقات کا بندوبست کراؤ۔ بندہ میڈیکل کالج کا ایک بے حیثیت ساڈیمانسٹریٹر تھا۔ گورنر سے ملاقات کرانے کی ترتیب کا بھی پتہ نہیں تھا، اس لیے پریشانی ہوئی۔ خیر دوسرے دن ڈیوٹی کے لیے کالج گیا۔ کالج میں ملنے کے لیے غلام حسین صاحب (پی۔ اے پرنسپل) کے پاس گیا۔ وہ ٹیلی فون پر مصروف تھے، انھوں نے اشارے سے بندہ کو خاموش بیٹھنے کو کہا۔ جب پرنسپل کی کال انھوں نے ملالی تو بندہ سے کہا کہ پرنسپل صاحب گورنر عبدالحکیم خان سے بات کر رہے ہیں۔ بندہ کو فوراً خیال آیا کہ اس ذریعے سے اگر گورنر سے رابطہ ہوسکے تو بہت آسانی رہے۔ بندہ نے یہ بات غلام حسین صاحب سے کہی۔ غلام حسین صاحب بھی حضرت مولاناؒ کے مرید تھے۔ جوں پرنسپل کی کال ختم ہوئی، گورنر کے پی۔ اے کا شکریہ ادا کرنے سے پہلے غلام حسین صاحب نے پی۔ اے سے کہا کہ حضرت مولانا اشرف صاحب گورنر صاحب سے ملاقات کا وقت مانگ رہے ہیں۔ پی۔ اے نے بات کر کے بتایا کہ گورنر صاحب کہتے ہیں کہ جب آنا چاہیں اور جتنے وقت کے لیے آنا چاہیں انھیں اجازت ہے۔ یہ ملاقات گورنر صاحب کی آمدورفت کا ذریعہ بنی جس کے نتیجے میں بفضلہٖ تعالیٰ اُن کی زندگی کا رخ مکمل دین کی طرف تبدیل ہوا۔

عالمگیر صاحب اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ انجینئر نگ سے فارغ ہونے کے بعد بیروزگار تھا۔ ماہ

رمضان تھا ہر روز حضرت مولانا کی خدمت میں حاضری ہوتی تھی۔ حضرت اکثر پوچھتے تھے روزگار ہوا یا نہیں۔ رمضان کا آخری عشرہ تھا کہ حضرت نے سب حاضرین سمیت خوب الحاح سے بندہ کے لیے دعا کی۔ اختتام دعا پر پروفیسر میر حاتم صاحب نے مجھ سے کہا کہ تمہیں پتہ ہے کہ صوبے کے گورنر فضل حق نے حکم دیا ہے کہ ساری خالی آسامیاں پر کی جائیں۔ میں نے پروفیسر صاحب سے پوچھا کہ اس کا میرے ساتھ کیا تعلق ہے؟ انھوں نے کہا کہ اپنے ڈیپارٹمنٹ جا کر پوچھو کہ کوئی اسامی خالی ہے؟ دوسرے دن میں نے جا کر پوچھا تو پتہ چلا کہ خالی آسامی موجود ہے۔ میں نے سادہ کاغذ پر درخواست لکھی۔ متعلقہ چیئرمین اور ڈین سے اس پر لکھوایا اور سیدھا سیٹھی اسماعیل صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ اتفاقاً وہاں پروفیسر مسرت صاحب بھی موجود تھے۔ انھوں نے سیٹھی صاحب سے کہا کہ یہ ہمارا اچھا برخوردار ہے۔ سیٹھی صاحب نے فوراً تعیناتی کے احکامات صادر فرمائے۔ اور میں آدھے گھنٹے میں لیکچرر انجنیئرنگ کالج کا (appointment letter) تعیناتی خط لیکر آ گیا۔

ڈاکٹر امداداللہ (ڈینٹل سرجن) نے بتایا کہ جب شام کو حضرت کے ہاں حاضر ہوتا تو جو سوالات ذہن میں ہوتے حضرت ان کا جواب بغیر پوچھے بتا دیتے یا تعلیم کے دوران وہ بات بیان ہو جاتی۔ اور دل کو ایسی تسلی ملتی جو شاید کئی کتابیں پڑھ کر نہ مل سکتی۔ انھوں نے ہی بتایا کہ فرسٹ ایئر میں باوجود اچھی پڑھائی اور تیاری کے امتحان میں پہلی پوزیشن نہ آ سکی بلکہ دوسری پوزیشن آئی۔ سیکنڈ ایئر بی۔ ڈی۔ ایس میں ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑا کہ والد صاحب بیمار ہو گئے، جس کی وجہ سے پریشانی رہی اور امتحان کے لیے اچھی تیاری نہ ہو سکی۔ اب کے حضرت سے دعا کروائی اور یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن آ گئی۔ جب بی۔ ڈی۔ ایس سے فارغ ہوا اور ہاؤس جاب مکمل ہونے لگا تو نوکری کی فکر ہوئی۔ بے روزگاری عام تھی کئی ڈاکٹر فارغ پھر رہے تھے۔ حضرت سے دعا کروائی۔ بغیر تکلیف کے سعودی ہلالِ احمر میں ملازمت مل گئی اور یوں ایک ہفتہ بھی بے روزگاری نہیں دیکھنی پڑی۔ سرکاری نوکری کے لیے پبلک سروس کمیشن میں انٹرویو تھا۔ میرٹ پر پہلا نمبر تھا لہٰذا دل کو یک گونہ تسلی تھی ساتھ دل میں یہ خیال بھی آیا کہ ہر وقت حضرت مولانا سے دنیا ہی کی دعائیں کرواتے ہیں۔ اس لیے اس دفعہ بغیر دعا کروائے ہی انٹرویو میں چلا گیا، حیرت ہوئی کہ کم نمبروں والی لیڈی ڈاکٹر سلیکٹ ہوئی اور میں رہ گیا۔ دوبارہ جب انٹرویو ہوا تو دعا کروا کے انٹرویو میں گیا تو سلیکشن ہو گئی۔

بندہ نے ایک دفعہ خواب دیکھا کہ کچھ حضرات ایک سرخ ڈولی (جس میں دلہن کو لایا جاتا ہے)

اٹھائے ہوئے آئے اورڈولی بندہ کے گھر میں چھوڑ دی۔ بندہ حضرت کے کرایہ کے مکان میں مقیم تھا جسے انہی دنوں میں بندہ نے خالی کیا تھا اور بندہ کی جگہ حاجی عبدالقدّوس انجنیئر آ گیا تھا جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ بندہ نے اپنے طور پر خواب کی تعبیر حاجی عبدالقدّوس کی اس مکان میں آمد سمجھی۔ حضرت مولاناؒ سے تذکرہ کیا ،انھوں نے چھوٹتے ہی فرمایا کہ اس کی تعبیر یہ ہے کی تمہارا بیٹا ہونے والا ہے کیونکہ ڈولی بیٹے کے ساتھ آیا کرتی ہے۔ اس دور میں پشاور میں الٹراساؤنڈ کا رواج نہیں ہوا تھا۔ بندہ نے ذبح کرنے کے لیے دو بکروں کا بندوبست کرلیا۔ ساتھی معترض بھی تھے کہ پہلے سے دو بکروں کا کیوں انتظام کیا ہے۔ لیکن بندہ کو تعبیر سے تسلی تھی ۔خواب کی تعبیر سچ ثابت ہوئی اور لڑکا ہی ہوا۔

بندہ کے رفیق کار (colleague) ڈاکٹر صاحبزادہ تیمور نے بتایا کہ حضرت مولانا حج سے واپسی پر لاہور میں تشریف فرما تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے سسر بریگیڈیئر فقیر محمد صاحب ملاقات کے لیے حاضر ہوئے اور شام کے کھانے کی دعوت کرنا چاہی۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ میرے ساتھ بہت لوگ ہیں اور آپ کو تکلیف ہوگی لیکن انھوں نے اصرار کیا جس پر دعوت قبول کرلی۔ بریگیڈیئر صاحب نے اپنی اہلیہ کو تقریباً اسی آدمیوں کی اطلاع دی۔ وہ بہت خوش ہوئیں اور انھوں نے ’۸۰‘ آدمیوں کے لیے برتن خریدے۔ اتفاقاً اس دن خانساماں چھٹی پر تھا اس لیے کھانا پکانے کا مسئلہ درپیش ہوگیا۔ بریگیڈیئر صاحب کے گھر کے سامنے ایک سیٹھ کا گھر تھا ان کا خانساماں ناراض ہوکر بریگیڈیئر صاحب کے ہاں آگیا اور بیگم صاحبہ سے کہا کہ مجھے نوکری چاہیے۔ انھوں نے فوراً رکھ لیا۔ خانساماں نے ’۸۰‘ آدمیوں کا بخوبی بندوبست کیا۔ دوسرے دن صبح خانساماں نے کہا کہ بیگم صاحبہ آپ خفا نہ ہوں میں سامنے والے سیٹھ صاحب کا بیس سال سے خانساماں ہوں، نہ جانے مجھے کل کیا ہوگیا تھا کہ میں لڑکر غصے میں وہاں سے نکل آیا تھا۔ وہ تو میرے والدین کی طرح ہیں، میں واپس جا رہا ہوں۔

یونیورسٹی کے پرفیسر صاحبان انگلینڈ، امریکہ، کینیڈا کی یونیورسٹیوں سے ایم۔ ایس، ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی وغیرہ کیے ہوئے ہوتے تھے اور انتہائی بے تکے خیالات کے حامل ہوتے تھے۔ پھر ہر کسی کا اپنے بارے میں ’’ہم چو ما دیگرے نیست‘‘ کا خیال اور یہ جذبہ کہ ان کے خیالات کو سنا جائے۔ یہ لوگ حضرت کے پاس آتے اور گھنٹوں بولتے رہتے۔ حضرت محض ان کی دلداری کے لیے سنتے رہتے۔ بیچ بیچ میں کوئی بات آپ فرمادیتے۔ بعض ان میں ایک مہینے میں جگہ پر آتے بعض دو مہینوں میں، ہمارا تو صبر کا پیمانہ لبریز

ہو جاتا تھا لیکن حضرت انتہائی تحمّل کا مظاہرہ فرماتے۔ یہی حضرات جب اپنی باتوں سے خالی ہو جاتے تھے اور آپ کی سننا شروع کر دیتے تو چند ہی مہینوں میں قابل رشک ترقی کر جاتے تھے۔ زندگی مکمل بدل جاتی تھی اور بجائے دین کی مخالفت کے دین کے محافظ اور مبلغ بن جاتے تھے۔

طلباء کی تربیت کے بارے میں حضرت کا خاص طریقہ تھا۔ چونکہ تبلیغی جماعت کے امیر بھی تھے۔ اور طلباء کو تبلیغی چلوں کے لیے بھی بھیجتے رہتے تھے۔ لیکن ایسا اعتدال برتتے تھے کہ طلباء کو ضروری دین بھی حاصل ہو جائے۔ وہ دین کی تبلیغ کا کام بھی کر لیں۔ لیکن اس اثناء میں ان کا وقت بھی ضائع نہ ہو اور جس تعلیم کے لیے انہیں والدین نے بھیجا ہے اس کا بھی نقصان نہ ہو۔ آپ کا مؤقف ہوتا تھا کہ طالب علمی کا زمانہ بہت اہم ہوتا ہے، اس میں جو چیز حاصل کرنی ہے اس کا یہی وقت ہے۔ اگر آدمی حاصل نہ کر سکا تو پھر ہمیشہ کے لیے رہ جاتا ہے۔ باقی کام کرنے کے لیے تو پوری عمر پڑی ہے۔ حضرت کا یہ موقف بھی ہوتا تھا کہ طالب علم اگر چھٹیوں کا پورا وقت جماعت میں نکل جائیں اور والدین سے ملنے بالکل نہ جائیں تو اس کا بہت منفی اثر والدین پر پڑتا ہے۔ حضرت کی یہ ترتیب یک رخے (excentric) مبلغین کو بہت ناپسند آتی تھی۔ ان کا خیال ہوتا تھا کہ حضرت مولاناؒ کام کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ یہاں یار لوگوں کا یہ طریقہ ہوتا تھا کہ طالب علم کی پڑھائی و امتحان کی کوئی پرواہ نہیں۔ پگڑی بندھوا کر اور لمبے کپڑے پہنا کر مجذوبوں کی طرح پھراتے اور دوڑاتے ہیں۔ نہ صحت کا خیال، نہ صفائی کا خیال، نہ پڑھائی کا خیال، نہ والدین کی یاد۔ بعض کی فیل ہو ہو کر شامت ہو جاتی تھی۔ اکثر کا خیال ہوتا کہ دنیا کے سارے کام فضول ہیں۔ بلکہ تبلیغ کے کام کے علاوہ باقی جو دینی کام ہیں وہ بھی لایعنی ہیں۔ خود بندہ کا یہ خیال کافی عرصہ رہا کہ ڈاکٹری تعلیم تو ایک لایعنی اور انگریز کی سازش ہے، جس میں تضیع اوقات کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہ تو بعد میں حضرت مولانا کی صحبت اور امام غزالیؒ کی احیاء العلوم پڑھنے سے پتہ چلا کہ وہ سارے کام جن کے ساتھ انسان کی بقائے شخصی و بقائے نوعی کا تعلق ہے بقدر ضرورت و سہولت ان میں لگنا فرضِ کفایہ ہے۔ چنانچہ غلہ پیدا کرنا، کپڑا بننا سینا، تعمیرات کا بندوبست کرنا، علاج معالجے کا بندوبست کرنا، امن و امان قائم کرنے کے لیے حکومت و قانون کا بندوبست کرنا، سارے کام فرضِ کفایہ ہیں۔ اور ان میں لگنا اور ترقی کرنا امت کی یکسوئی، خود کفالت اور کفار کی محتاجی سے چھوٹنے کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ آپ کے تعلق والے طلباء بہت زیادہ کامیاب اور معتدل زندگی کے حامل ہوئے اور اپنے والدین اور پورے خاندانوں کی زندگی بدلنے کی سعادت انہیں حاصل ہوئی۔ جہاں گئے ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ ورنہ

یا رلوگوں کے خاندانوں سے مخالفت اور مخاصمت جس کے نتیجے میں خاندانوں کا دین سے اور تبلیغ کے کام سے نالاں ہونا، طلاقوں کی نوبت آنا معلومات میں آتے رہے۔ جب طلباء کی دنیا پر زد آتی تو کچھ دنوں کے بعد سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہر چیز سے فارغ ہو جاتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ راولپنڈی میں اجتماع ہو رہا تھا اور حضرت جی مولانا انعام الحسن شمولیت کے لیے ہندوستان سے تشریف لائے ہوئے تھے۔ یہاں اردن کے کچھ عرب طلباء پشاور یونیورسٹی میں مختلف شعبوں میں زیر تعلیم تھے۔ یہ حضرات تبلیغی جماعت کے چار چار ماہ کا نصاب پورا کر کے داخل ہوئے تھے۔ ہر وقت تبلیغی سرگرمی میں پھرتے رہنے کا معمول تھا۔ اور بہت سے فیل ہو ہو کر تھک گئے تھے۔ حضرت جی مولانا انعام الحسنؒ نے حضرت مولاناؒ کے ہاتھوں میں ان کا ہاتھ دے کر فرمایا ''مولانا صاحب ان طلبا کو آپ نے پاس کروانا ہے''۔ پھر فرمایا ''مولانا اگر ان کی دنیا درست نہ ہوئی تو یہ دین پر پکے نہیں ہو سکیں گے''۔ حضرت مولاناؒ پشاور تشریف لائے اور راقم الحروف (اس تحریر کو لکھنے والا) کو بلا کر فرمایا کہ بیٹا ان طلباء کو پاس کروانا ہے اور یہ حضرت جی کا ارشاد ہے۔ بندہ نے عرض کیا کہ حضرت یہ کیسے پاس ہوں گے۔ زیادہ وقت تو پھرنے میں اور تبلیغی گشت کرنے میں گذار دیتے ہیں۔ شام کو واپس آتے ہیں تو متقی ہاتھ کا کھانا کھاتے ہیں (یعنی بکرے کا گوشت خود پکاتے ہیں۔) خوب کھانا کھانے کے بعد مجلس شروع ہوتی ہے۔ ایک اپنی حیدرآباد میں چلہ کی کار گذاری سنانا شروع کرتا ہے تو دوسرا فیصل آباد کی کارگذاری بیان کرتا ہے جبکہ تیسرا لاہور کے حالات سناتا ہے۔ اس طرح مجلس گرم رہتی ہے تھوڑی دیر بعد بدن بوجھل ہو کر غنودگی طاری ہو جاتی ہے اور سو جاتے ہیں۔ بندہ نے عرض کیا کہ اس ترتیب سے تو آدمی پاس نہیں ہو سکتا حضرت مولاناؒ نے پھر فرمایا پھر کیا کیا جائے تو بندہ نے عرض کیا کہ ان پر پابندی لگائیں تاکہ یہ کچھ پڑھیں اور سیکھیں تب ہی کچھ کامیابی ہو سکے گی۔ حضرت نے برخورداران کو سمجھایا۔ چنانچہ اللہ کے فضل سے وہ کامیاب ہوئے اور اب اپنے ممالک میں اہم پوسٹوں پر کام کر رہے ہیں اور دین کی ذمہ داریوں کو بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔ حضرتؒ طلباء کے دینی و دنیوی مستقبل کے بارے میں فکرمند ہوتے تھے۔ اور ایسی منصوبہ بندی فرماتے تھے کہ ہر دو جگہ طالب علم نمایاں حیثیت حاصل کر لیتا تھا۔

حاجی احمد خان صاحب ڈپٹی سیکرٹری حکومت صوبہ سرحد نے واقعہ سنایا کہ وہ حضرت مولانا کے ہاں خدمت کے لیے ٹھہرے ہوئے تھے انھوں نے حضرت کو پیٹھ پر اٹھایا اور طہارت کے لیے کموڈ پر بٹھا دیا۔ بیٹھتے

ہی حضرت مولانا نے فرمایا ''ظاہر شاہ چلا گیا''۔ حاجی احمد خان صاحب نے سوچا کہ شاید ظاہر شاہ کوئی مہمان آیا ہوگا اور چلا گیا ہوگا۔ لیکن تھوڑے عرصے میں جب ظاہر شاہ والیِ افغانستان کا تختہ الٹ گیا تو پھر خیال ہوا کہ حضرت نے جو بات فرمائی تھی وہ ظاہر شاہ والیء افغانستان کے بارے میں تھی۔

غلام ناصر صاحب صدر شعبہ فارسی پشاور یونیورسٹی نے سنایا کہ ایک مرتبہ مجلس میں بیٹھے بیٹھے حضرت پر غنودگی طاری ہوئی۔ بیدار ہونے پر فرمایا کہ مولانا رومؒ کو خواب میں دیکھا کہ فرما رہے ہیں ''مجھے یخنی پلائیں'' ۔ان ہی دنوں پشاور یونیورسٹی نے آپ سے مولانا روم پر لیکچر دینے کے لیے رابطہ کیا۔ چنانچہ آپ کا لیکچر ہوا۔ جو اس کتاب میں شامل ہے، پڑھنے والے کو اندازہ ہوگا کہ وہی اس خواب کی تعبیر ہے۔ جس کے ذریعے سے مولانا روم کا فیض یخنی بن کر ہم تک پہنچا۔

راقم الحروف حضرت کے ساتھ ۱۹۷۵ء کے حج میں حضرت کے ہمراہ تھا کہ منیٰ میں آگ لگ گئی۔ حضرت پر خوف کا غلبہ رہتا تھا چنانچہ انھوں نے فوراً ساتھیوں سے فرمایا ''مجھے جلدی باہر نکالو۔'' ایسے مواقع پر ان کو یہ فکر لاحق رہتی تھی کہ یہ سب کچھ میرے گناہوں کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ بندہ نے ساتھیوں سے کہا کوئی فکر نہ کریں ہمیں کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ اس پر ساتھیوں کو غصہ آیا ہوگا کہ حضرت تو باہر نکلنے کا فرما رہے ہیں اور یہ رکنے کا کہہ رہا ہے۔ دراصل بندہ کو یہ تسلی تھی کہ حضرت جیسی مقبول ہستی کے ہوتے ہوئے ہمیں آگ نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ چنانچہ آگ کا رخ ہم سے مخالف سمت کہ طرف مڑ گیا۔ بعد میں فقراء نے بتایا کہ یہ ایرانی روافض کی بعض کوتاہیوں کہ وجہ سے صورت عذاب تھی۔ حضرت کے تعلق والے فقراء میں سے ہی کسی نے بتایا کہ اس موقع پر حج میں موجود خاص اولیاء اللہ نے بہت دعائیں مانگیں لیکن عذاب ٹل نہیں رہا تھا۔ حضرت مولانا فقیر محمد صاحب نے دعا مانگی انھیں پیچھے سے گردن پر مُکہ لگا اور آواز آئی کہ اِن کے لیے دعا مانگ رہے ہو۔ مولانا فقیر محمد صاحب نے فرمایا کہ جب سب اولیاء اللہ بے بس ہو گئے تو روحانیت والوں نے دیکھا کہ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری ہوئی اور آپ کی برکت سے مصیبت ٹلی۔

آخری حج ۱۹۹۵ء میں پروفیسر نعمان صاحب اور تیسیر جان صاحب ساتھ تھے۔ پہیوں والی کرسی جس پر بیٹھ کر آپ چلتے پھرتے تھے کی مواجہہ شریف لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے باہر سے ہی صلوٰۃ وسلام پڑھنا ہوتا تھا۔ ایک دن آپ کے خلیفہ غازی مرجان مقیم مدینہ منوّرہ نے نعمان صاحب سے کہا کہ حضرت کی کرسی آگے لے جاؤ۔ نعمان صاحب نے کہا کہ اس کی تو اجازت نہیں ہے۔ غازی مرجان صاحب

نے بتایا کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یاد فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ آگے لے گئے اور کسی نے نہیں روکا۔ صفہ کے پاس آپ نے فرض نماز ادا فرمائی اور اس کے بعد بابِ جبریل کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدمین شریفین کی طرف حاضری کی۔ اتفاقاً آپ کی کرسی اور روضہ شریف کے درمیان ایک شخص حائل ہو گیا۔ ڈیوٹی پر موجود سعودی نے فوراً اس آدمی کو ہٹا دیا۔ اور کہا کہ شیخ کے لیے جگہ خالی کرو۔ اس کے بعد بابُ السلام کی طرف سے مواجہہ شریف کی طرف حاضر ہو کر بھی صلوٰۃ وسلام پڑھا اور واپسی کی۔ دوسرے دن پھر کرسی سمیت اندر جانے لگے تو ڈیوٹی والے نے روک دیا۔ دوسرے دروازے سے پھر تیسرے سے کوشش کی لیکن اجازت نہ ہوئی۔ نماز کھڑی ہو رہی تھی کہ ایک دروازے سے اندر ہوئے۔ پولیس والا روکنے کے لیے آ رہا تھا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی نعمان صاحب نے اور حضرت مولانا صاحب نے نماز کی نیت باندھ لی تھی۔

نماز کے بعد غازی مرجان صاحب کے ذریعے مسجد کی انتظامیہ سے ایک اجازت نامہ لیا۔ وہ لے کر داخل ہونے لگے تو پولیس والے نے اجازت نامہ اپنی جیب میں لے کر رکھ لیا اور کہا کہ اتنی بڑی گاڑی کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ نعمان صاحب کہتے ہیں کہ میں پھر مواجہہ شریف پر حاضر ہوا صلوٰۃ سلام پڑھا، رویا اور اجازت نہ ملنے کی فریاد کی۔ گھر واپس ہوئے، آرام کے لیے لیٹے تو خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوگئی۔ مصافحہ کر کے ہاتھ چوما اور عرض کیا ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اندر داخلے کی اجازت نہیں ہو رہی۔'' اس پر حضور نے فرمایا ''یہاں کے انتظام وانصرام کا احترام کرنا چاہیے۔ بہر حال اجازت ہو جائے گی۔'' حضرت مولانا صاحب کو خواب سنایا تو بہت خوش ہوئے۔ مسجد نبوی جا کر غازی مرجان صاحب سے دوبارہ پرچہ لینے کا کہا، لیکن انھوں نے کہا کہ اس دفعہ آپ خود ملیں۔ حاضر ہو کر انتظامیہ کے سربراہ سے ملاقات کی۔ وہ خود ہی حضرت سے ملنے کے لیے آ گیا۔ ملا اور آ کے پیشانی کو چوما اور پرچہ دیا اس میں لکھا ہوا تھا کہ جس دروازے سے بھی داخل ہونا چاہیں ان کو اجازت ہے۔ اس کے بعد پھر کسی نے نہیں روکا۔

اسی حج میں ایک دفعہ رات کو تیسیر صاحب نے نعمان صاحب کو جگایا اور کہا کہ مولانا صاحب کو کچھ تکلیف لاحق ہوگئی ہے۔ انھوں نے جا کر دیکھا اور تیسیر صاحب سے کہا کہ یہ کوئی تکلیف نہیں ہے بلکہ کبھی کبھی حضرت کی زبان پر بھی ذکر جاری ہو جاتا ہے اور دل بھی اچھلنے لگتا ہے۔ یہ کوئی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ آپ سوئے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب آپ جاگے تو فرمایا کہ میں نے ایک خواب دیکھا ہے جس میں نظر آیا کہ کچھ لوگ ہیں جن کی شکل وصورت حضرت شیخ کے خلیفہ حضرت مولانا عزیز الرحمٰن ہزاروی صاحب کی طرح ہے جو کالی

پگڑیاں باندھے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ دہشت گرد ہیں لیکن باقی لوگ کہہ رہے ہیں کہ یہ صالح لوگ ہیں اتنے میں بڑے بڑے چوہے بہت بڑی بڑی عمارات کو کھودنا شروع کر دیتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ امریکہ کی تباہی قریب نظر آ رہی ہے۔ واضح رہے کہ انہی دنوں میں افغانستان میں طالبان کی حکومت مستحکم ہوئی تھی۔

ایک دفعہ غازی مرجان صاحب نے پیغام بھیجا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مولانا صاحب سے کہو کہ میری امت کے لیے دعا کیا کریں۔ یہ بات پروفیسر خلجی صاحب نے بھری مجلس میں کہہ دی۔ جس پر حضرت نے ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

حسن خان صاحب نے واقعہ سنایا کہ حضرت کے آخری حج میں ایک دن غازی مرجان صاحب تشریف لائے۔ آپ کے خادم تیسیر جان صاحب سے حضرت کا پوچھا، انھوں نے بتایا کہ سوئے ہوئے ہیں۔ غازی مرجان صاحب نے کہا کہ جگائیں کیونکہ ایک ضروری پیغام دینا ہے۔ جاگنے پر غازی مرجان صاحب نے بتایا کہ انھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ فی قلبی و اشرف فی عینی" میں نے عرض کیا حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اس کا مطلب نہیں سمجھا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ سمجھ جائے گا۔ اس کی غالباً آپؒ نے یہ تعبیر لی کہ وقت وصال قریب ہے۔ چنانچہ حج سے واپسی پر آپؒ نے بات چیت کرنے سے کافی حد تک پرہیز شروع کر دی۔ یہاں تک کہ آپ کی وفات ہوئی۔

مساجد کی تعمیر:

یونیورسٹی کے اندر صرف اسلامیہ کالج کی مسجد تھی جو ایک میل علاقے کے لیے کافی سمجھی گئی تھی۔ حضرت کی فکر اور کوششوں سے بلال مسجد، مدینہ مسجد، تقویٰ مسجد اور مسجد فردوس بنیں۔ جن کے لیے حضرت کے مریدین نے خود بھی چندے دیے اور لوگوں سے اپیلیں کر کر کے چندے جمع کیے۔

تکوینی امور:

زندگی کے آخر سالوں میں اس طرح پتہ چلتا تھا کہ حکومتوں کے آنے جانے میں حضرت کی دعاؤں کا خاص اثر ہوتا تھا۔ کچھ مجذوب فقراء بھی کبھی نظر آتے تھے۔ ایک بار بندہ بیٹھا ہوا تھا کہ ایک مجذوب

بار بار دلائل دے رہے تھے کہ بھٹو کو دوبارہ حکومت ملنی چاہیے کیونکہ عالمی سیاست کے فہم والا ہے اور جرأت والا ہے۔ لیکن حضرت رد فرما رہے تھے۔ کہ اس کی وجہ سے بے دینی عام ہو رہی ہے۔ چنانچہ تھوڑا عرصہ بعد پھانسی ہو گیا۔ ایک بار بندہ مجلس میں بیٹھا تھا کہ کسی نے آ کر اطلاع دی کہ فیڈرل شریعت کورٹ نے جو سود کے خلاف فیصلہ دیا تھا اس کے خلاف نواز شریف نے سپریم کورٹ میں مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ مجلس کے فقراء میں ایک فوراً بولا اب وہ لڑکی نواز شریف کی گردن پر چڑھ جائے گی۔ چنانچہ تھوڑے عرصہ میں نواز شریف کی اسمبلی اور وزارت عظمیٰ ختم ہو گئی، نئے انتخابات ہو گئے اور عورت وزیر اعظم بن گئی۔

ایک دفعہ بندہ موجود تھا کہ مجلس میں ایک انتہائی خستہ حال فقیر نے دوسرے سے پوچھا کہ عورت کی حکومت کیوں ختم نہیں ہو رہی تو دوسرے نے کہا کہ اس کا وزیرِ داخلہ افغانستان گیا ہوا ہے اور طالبان کی منصوبہ بندی کر رہا ہے اور کام مکمل کر لے تو خاتمہ ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ ابھی وہیں پر تھا کہ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

ایک بار بندہ حاضر تھا کہ کچھ فقراء بحث کر رہے تھے کہ صوبہ سرحد میں اے۔ این۔ پی اور مسلم لیگ کی مخلوط حکومت سے لوگ تنگ آ چکے ہیں۔ اس پر ایک فقیر نے کہا کہ ہمارے سب کے ووٹ ہو چکے ہیں۔ حضرت کی طرف اشارہ کر کے کہا اس کا ووٹ باقی ہے۔ چنانچہ چند دنوں بعد حکومت ختم ہو گئی۔

آپ کی شاعری :

سوز و گداز و گریہ وصیحہ سلسلہ چشتیہ کے خاص تحائف ہیں۔ اس کے ساتھ آپ عربی و فارسی کے ایم۔ اے تھے۔ یہ ہر دو زبانیں شاعری کے اعلیٰ ذوق والی ہیں۔ اس لیے آپ کا اردو، فارسی اور عربی کے اشعار کا بہت اعلیٰ ذوق تھا۔ مولانا رومؒ اور علامہ اقبال کے کئی اشعار زبانی یاد تھے۔ بیعت کے شروع دور میں ذکر اذکار کی کیفیات سالک کے اندر زبردست سوز و گداز پیدا کرتی ہیں اور چشتیہ حضرات سے عموماً اس دور میں موزوں کلام صادر ہوتا ہے۔ چنانچہ اس دور کا آپ کا اپنا کلام بھی ہے۔ آپ نے بتایا کہ خواب میں جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ھذا سلامی انا خاتم النبیین لا نبی بعدی''۔ اس پر بے ساختہ نعتیہ کلام زبان پر جاری ہوا اور یہ نعت لکھی گئی۔

سلام بھیجا ہے ہر دم سلام کہتا ہوں — جنون و شوق کا جلتا پیام کہتا ہوں

خرد و ہوش کو لوٹا جو تو نے میرے ہے — اسی کا واسطہ دے کر سلام کہتا ہوں

جہاں میں ہوگا نہ ایسا کوئی فقیر و گدا　　صلوٰۃ و نعت تمہاری مدام کہتا ہوں
جمالِ تام کو جو بے نقاب دیکھا ہے　　حجاب جو بھی ہو اس کو حرام کہتا ہوں
فروغِ دیدہ و دل ہے ارے نظر ان کی　　یہ تاب دیکھو کہ اُن کو سلام کہتا ہوں
نظر بچا کے زمانے کی آنکھ سے اشرفؔ　　نگاہِ شوق سے ان کو پیام کہتا ہوں

ایک دوسری غزل اس طرح سے ہے

تڑپ کے نالے جو سدرہ کے پار ہونے لگے
جھلک نے اُن کی، امیدوں کے تار چھیڑ دیئے
بُھلا سکوں گا میں کیونکر نگاہِ نازاں کو
کہ نغمہ ہائے دلِ بے قرار چھیڑ دیئے
سِتم نے حسن کے، بھُولے سے جو قرار دیا
بھڑک کے سوز نے دل کے شرار چھیڑ دیئے
نظر نے تیری بھلایا خیالِ سود و زیاں
وفورِ شوق نے پیہم نگار چھیڑ دیئے
دبا رکھے تھے جو نالے جنوں نے برسوں سے
نظر ملا کے وہ سب ایک بار چھیڑ دیئے
کرم تھا یہ بھی کہ اشرفؔ عجب اشاروں سے
جہان بدلا اور لیل و نہار چھیڑ دیئے

ایک اور غزل

ہم نے دیکھے ہیں ایسے مستانے　　کوئی جانے انھیں نہ پہچانے
چند چھینٹے اڑے تھے ساغر سے　　ہوش کھو کر چلے ہیں فرزانے
ہر قدم پر جنون بڑھتا ہے　　کون بیٹھا یہاں ہے ستانے
میرے گھر کی بہار تو دیکھو　　اس پہ روتے ہیں آج ویرانے
دل کی دنیا پہ گر بہار آتی　　اجڑے ہوتے نہ آج کاشانے

حسرتوں پر جنوں کی میں رویا | چند لمحے ملے جو ستانے
دیدنے انکی، زندگی بخشی | اپنے جانیں اُسے، نہ بیگانے
زندگی ہو چکی ہے اب انکی | آپ آئے عبث ہیں سمجھانے
دیدہ ودل سے ہے لہو نکلا | ٹوٹے دیکھے جو چند پیمانے
علم حاضر نے ہوش یوں کھویا | آج اجڑے پڑے ہیں میخانے

یہ اشعار انکی بیاض نہ ملنے کی وجہ سے اصل تحریر سے نہیں لیے جاسکے بلکہ ایک ساتھی کی تحریر سے نقل کیے گئے ہیں۔

اپنے دور کے علماء ومشائخ سے آپ کے تعلقات:

اہل حق علماء ومشائخ کی یہ علامت ہوتی ہے کہ ان کے اپنے دور کے اہل حق کے ساتھ خیر خواہانہ و دوستانہ روابط ضرور ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کی تعلیمات اور ترتیب میں سقم ہو یا بدعات کی آمیزش کر چکے ہوں وہ عموماً ہم عصر اہل حق سے کتراتے رہتے ہیں۔ یا وہ لوگ جو رضائے الٰہی سے ہٹ کر مفادات کے لیے کام کر رہے ہوں ان کے لیے بھی ہم عصر اہل حق کی تائید کرنا مشکل ہوتا ہے۔ بفضلہٖ تعالیٰ حضرت کو ساری عمر اپنے دور کے محققین مشائخ وعلماء کی پوری تائید حاصل رہی اور آپ بھی دل کھول کر سب کی تائید فرماتے رہے۔ کچھ حضرات کا تذکرہ تو گذشتہ اوراق میں آگیا ہے بقیہ حضرات کا تذکرہ فائدہ سے خالی نہیں ہوگا۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ: تبلیغی تحریک کے سلسلے میں آپ کی بستی نظام الدین دہلی آمد ورفت رہتی تھی انہی اسفار میں آپ وقت نکال کر حضرت مدنیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ فرمایا کہ حضرت مدنیؒ نے پوچھا کہ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ حضرت کے رفیقِ سفر حاجی تاج نے فوراً عرض کر دیا کہ پاکستان سے۔ حضرت نے فرمایا کہ حاجی تاج جلدی نہ کرتے تو میں بجائے پاکستان کے پشاور کہتا تا کہ نئی نئی تقسیم ہونے کی وجہ سے جو مسلمانوں کا کشت وخون ہوا اور مسلمان بے گھر و بے در ہوئے نیز عصمتیں لٹیں حضرت مدنیؒ کا وہ دکھ تازہ نہ ہو جائے۔ حضرت مدنیؒ نے جواباً فرمایا ''پاکستان سے ہم ناپاکوں کے پاس آئے ہو''۔ پھر حضرت مدنیؒ نے کھانا کھانے کے لیے اصرار فرمایا۔ حاجی تاج صاحب عمر میں بڑے تھے سیدھے سادے تاجر آدمی تھے فوراً بول پڑے حضرت ہمارے سفر کا حرج ہو رہا ہے۔ حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ ساری عمر اس کا افسوس رہا کہ حضرت مدنیؒ کے تبرک سے محرومی رہی۔

حضرت مولانا عزیر گلؒ صاحب: موصوف حضرت شیخ الہندؒ کے خاص شاگرد اور مالٹا کی قید کے ساتھی تھے۔ آخری عمر سخا کوٹ (صوبہ سرحد) میں گذری۔ حضرت مولاناؒ باوجود سخت معذوری کی حالت کے بارہا آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ فرماتے تھے "تمہارا اس معذوری کی حالت میں آنا بندہ کو بہت گراں گذرتا ہے"۔

حضرت عبدالقادر رائے پوریؒ: برصغیر میں رائے پور کی خانقاہ سے سلسلہ قادریہ کا خاص فیض تقسیم ہوا۔ حضرت عبدالقادر رائے پوریؒ دورے کے لیے پاکستان بھی تشریف لایا کرتے تھے۔ چنانچہ انکی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ میں نے حضرت سے سوال کیا "حضرت پڑھنے لکھنے کی توفیق تو ہوئی ہے عمل کی توفیق ہونے کی کیا صورت ہوگی؟" حضرت رائے پوریؒ اس وقت قہوہ نوش فرمارہے تھے فرمایا "برخوردار اپنی قہوہ پینے کی عادت نہیں ہے لیکن قہوہ والوں کے ماحول میں آیا تو پینا پڑا۔ یہ صحبت کا اثر ہے۔ ایسے ہی اعمال والوں کی صحبت اعمال کی توفیق کا ذریعہ بنے گی۔"

حضرت جی ثانی مولانا محمد یوسفؒ: جس دور میں حضرت مولانا اشرف صاحب نے تبلیغی تحریک میں شمولیت اختیار کی حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی وفات ہو چکی تھی اور ان کے صاحبزادے حضرت مولانا محمد یوسفؒ عالمی امیر تھے۔ حضرت مولانا کی استعداد اور قربانیوں کی بناء پر حضرت جیؒ کا آپ کے ساتھ خاص تعلق ہوا، جس پر آپ کا وہ مضمون گواہ ہے جو حضرت جیؒ کی وفات پر آپ نے لکھا۔ حضرت جیؒ کی حیات میں بارہا تبلیغی مرکز بستی نظام الدّین دہلی کی طرف آپ کے سفر ہوئے اور کافی کافی وقت حضرت جی کے ساتھ آپ کا قیام ہوا۔ آپ نے حضرت جی کے بیانات بھی لکھے ہوئے تھے۔ ایک دفعہ حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ میں بستی نظام الدّین میں حضرت جی کا صبح کا بیان لکھ رہا تھا کہ ایک ساتھی نے بجلی بجھادی دوران بیان ہی حضرت جی نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے اس آدمی سے فرمایا "دیکھتے نہیں ہو کہ بھائی اشرف لکھ رہے ہیں"۔ حالانکہ حضرت جیؒ ہر کسی کو بیان لکھنے کی اجازت نہیں دیتے تھے لیکن وہ لوگ جو مضمون کو صحیح سمجھ کر لکھنے کا حق ادا کرسکتے ہوں ان کے لکھنے پر آپ کو اعتراض نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت مولانا شاہد سہارنپوری (نواسہ حضرت شیخؒ) نے حضرت جی اول، ثانی وثالث کی سوانح عمری میں دو جگہ حضرت مولانا اشرف صاحب کا ذکرِ خیر کیا ہے۔

حاجی محمد امین صاحبؒ: حاجی صاحب صوبہ سرحد کے مشہور قادریہ بزرگ گذرے ہیں۔ اپنی عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈوبی ہوئی پشتو نعتوں کی وجہ سے پٹھانوں میں عبدالرّحمان بابا کے بعد ان کا خوب چرچا ہے۔ کشمیر

کے جہاد کی وجہ سے آپ فخرِ کشمیر اور فاتح کشمیر کے خطابات سے نوازے گئے ہیں۔ ۱۹۵۰ء میں حاجی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اس دور میں تبلیغ والے حضرات کا یہ طریقہ کار تھا کہ مشائخ اور علماء کی خدمت میں انکی زیارت کرنے، ان کی مجلس کے فیوض و برکات سمیٹنے، ان کے ملفوظات سے کوئی ایسی بات سمجھ آجائے جس پر عمل کی توفیق ہو جائے، دعا لینے نیز ان کی کوئی ایسی خدمت معلوم ہو جائے جس کے لیے وہ پیشکش قبول کرلیں کے لیے حاضری دیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں پاکستان کے امیر شفیع قریشی صاحب پشاور آئے اور حضرت مولانا کو ساتھ لے کر حاجی صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان حضرات کی واپسی پر حاجی صاحبؒ نے قریشی صاحب کو خط لکھا کہ آپ کے ساتھ جو نوجوان آئے تھے بہت صالح نوجوان تھے لیکن انھوں نے کانوں کے گرد خط بنایا ہوا تھا۔ ان کو اطلاع دی جائے کہ اس طرح خط نہ بنایا کریں۔ دراصل حضرت مولانا نے موٹی مشین سے سر کے بال منڈوائے تو حجام نے خود ہی خط بنا دیا تھا۔ اس کے بعد حضرت مولانا ہمیشہ استرے سے مکمل سر صاف کروالیا کرتے تھے۔ اس طرح کی ملاقاتوں سے آجکل بے نیازی ہوگئی ہے۔

مفتیٔ اعظم حضرت مولانا محمد شفیع صاحب: کراچی کے سفر میں آپ مفتی صاحب کے پاس ضرور حاضر ہوا کرتے تھے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ مفتی صاحب کے پاس حاضری ہوئی۔ ان کو جب گھر پر اطلاع ملی تو اس قدر شفقت فرمائی اور محبت کا اظہار کیا کہ ننگے پاؤں ہی ملنے کے لیے باہر تشریف لے آئے۔ اس واقعے کو حضرت نے بہت خوشی کے ساتھ ہمیں سنایا۔

حضرت مولانا شمس الحق افغانیؒ: حضرت افغانیؒ، ترنگزئی علاقہ چارسدہ کے نامی گرامی بزرگ گذرے ہیں، ابنائے دیوبند میں آپ کا خاص مقام ہے۔ آپ ریاست قلات کے قاضی القضاۃ رہے۔ ریاست ختم ہونے کے بعد بہاولپور اسلامی یونیورسٹی کے شیخ التفسیر رہے۔ موصوف تصوّف کے سلاسل میں صاحبِ نسبت شخصیت تھے۔ حضرت مولاناؒ کے ساتھ خاص تعلق اور محبت تھی۔ آپ کی دعوت پر حضرت افغانی کے پشاور یونیورسٹی میں خطابات ہوئے، جو پروفیسر و طلباء حضرات کے لیے بہت مفید ثابت ہوئے۔

ڈاکٹر عبدالحئی صاحبؒ عارفی:

حضرت عارفی حضرت تھانویؒ کے خلفاء میں سے تھے اور ان کی کتابیں اسوہ رسول اکرم، بصائرِ حکیم الامت، مآثر حکیم الامت نیز ان کا شاعرانہ کلام، ان کی عظمت اور روحانی مقام کا بولتا ہوا شاہکار ہیں۔ ان کے ساتھ حضرت مولانا کا خصوصی تعلق رہا۔ موصوف بھی بہت شفقت اور محبت فرماتے تھے۔ بقول شیر حسن

صاحب ساتویں حج کے سفر میں کراچی سے گذرتے ہوئے حضرت کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ حضرت نے مغرب تا عشاء شرف مصاحبت بخشا اور رخصتی کے وقت آپ کو مع سب ساتھیوں کے اپنی کتاب اسوہ رسول اکرم ھدیہ میں عطا فرمائی۔

آپ کی وفات:

گذشتہ اوراق میں آپ کی بیماریوں کا تذکرہ گذرا۔ جن کے لیے تقریباً اکتالیس (۴۱) سال آپ زیرِ علاج رہے۔ ان بیماریوں سے روز بروز ضعف بڑھتا گیا۔ فالج (progressive muscular distrophey) کی وجہ سے وہ پٹھے (muscles) متاثر ہوگئے جن پر سانس لینے کا دارومدار ہے۔ بار بار نمونیہ ہونے سے پھیپھڑوں کی گنجائش انتہائی کم ہوگئی۔ اسی حال میں ۱۴۱۵ھ بمطابق ۱۹۹۵ء آپ کا آخری حج ہوا۔ حج سے واپسی پر کمزوری بہت بڑھ گئی اور اکثر وقت استغراق وغنودگی میں گذرنے لگا۔ نماز کے لیے بیدار کیا جاتا تھا، بعض اوقات دوران نماز یہ کیفیت ہوجاتی تھی جس کی وجہ سے آپ کو بیدار کر کے نئے سرے سے تیمّم کرا کے نماز پڑھائی جاتی تھی۔ باتیں کرنے والے کی بات تو سن لیتے تھے لیکن جواب نہیں دیتے تھے۔ ایسے محسوس ہورہا تھا کہ اب آپ مکمل رجوع الی اللہ کو چھوڑ کر دنیائے فانی کی کسی چیز کی طرف متوجہ ہونا نہیں چاہتے۔ آپ کے معالج خاص ڈاکٹر مسعود الرحمٰن صاحب (پروفیسر میڈیسن لیڈی ریڈنگ ہسپتال) نے معائنہ کیا ٹیسٹ کیے اور بتایا کہ سانس کی تکلیف اور پھیپھڑوں کی کمزوری کی وجہ سے خون میں آکسیجن کی مقدار بہت کم ہوگئی ہے۔ اس تکلیف کا ڈاکٹروں کے پاس کوئی مستقل حل نہیں تھا۔ خاندان والے اچھے سے اچھا علاج کروانا چاہتے تھے اور جتنا پیسہ بھی خرچ ہو، کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے (PIMS) پاکستان انسٹیٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز اسلام آباد لے جانے کا پروگرام بنایا۔ بندہ کو اور ڈاکٹر مسعود الرحمٰن صاحب کو اس کا کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آرہا تھا لیکن خاندان والوں کی رائے کے خلاف کرنے سے انکے جذبات مجروح ہونے کا خطرہ تھا۔ کیونکہ انکو حسرت رہتی کہ بہتر سے بہتر علاج نہیں کروایا گیا۔ PIMS میں ہی وقت موعود آگیا اور ۷ ستمبر ۱۹۹۵ء کو آپ کا وصال ہوگیا۔ انّا لِلّٰہِ و انّا الیہ راجعون ۔ دو بجے دن آپ کو پشاور پہنچایا گیا اور اسی روز شام سات بجے آپ کا جنازہ مقرر ہوا۔ غسل میت میں بندہ اور پروفیسر نعمان کے ساتھ کئی آدمیوں نے شمولیت کی سعادت حاصل کی۔ اُن کپڑوں میں کفن دیا گیا جو بار بار حرمین کی حاضری میں استعمال ہوئے

تھے۔آبِ زمزم میں ڈبوئے ہوئے تھے اور خاک مدینہ سے گردآلود تھے۔

خاکِ طیبہ از دو عالم خوش تر است
خرم آنجائے کہ آنجا دلبر است

ترجمہ: طیبہ (مدینہ منورہ) کی خاک دونوں جہان سے اچھی ہے، کیا ہی اچھی ہے وہ جگہ جہاں دوست ہے۔

کفن پر دربار رسالت کی عطا کردہ عطر ڈالی گئی۔اس شعر کی یاد تازہ ہوئی جو آپ نے اپنی زندگی میں اس عطر کی شیشی کی زیارت کراتے وقت پڑھا تھا،

چند تصویر بتاں ، چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ ساماں نکلا

جنازے کے بارے میں آپ کے وُرثاء اور سسرال والوں کے ساتھ مشورہ ہوا۔طے ہوا کہ آپ کی نماز جنازہ دارالعلوم سرحد کے بانی اور جمیعۃ العلماء اسلام کے صوبائی صدر حضرت مولانا ایوب جان بنوری صاحب پڑھائیں۔اگر وہ نہ پہنچ سکیں تو حضرت مولانا زکریا صاحب کے خلیفہ حضرت مولانا عزیز الرحمٰن ہزاروی صاحب پڑھائیں۔اگر دونوں موجود نہ ہوئے تو آپ کے خلیفہ مولوی یوسف صاحب یا راقم الحروف میں سے کوئی ایک پڑھادے۔مولانا ایوب جان بنوریؒ صاحب بروقت پہنچ گئے۔چنانچہ نماز جنازہ انھوں نے ہی پڑھائی۔

اشرف وہ شخص تھا ہمہ داں، جس کے فیض سے
ہم سے ہزار، ہیچ مداں ،نامور ہوئے

زہد و ورع ،صدق وصفا اور علم وفہم
چھ لفظ اسکے جاتے ہی بے پاوسر ہوئے

(نواب مصطفٰی خان شیفتہ کے اشعار میں تبدیلی کے ساتھ)

آپؒ کے بعد آپ کا سلسلہ:۔

اہل حق اور اہل باطل کے سلاسل میں یہ فرق ہوتا ہے کہ مشائخ کے اٹھ جانے کے بعد خاندان اور خلفاء کے درمیان نیز خلفاء کے اپنے درمیان چپقلش اور آویزش شروع ہوجاتی ہے۔اس کی وجہ حسد کا وفور اور

اخلاص کا فقدان ہوتا ہے۔ ہر کوئی گدی کو اور اس کے ساتھ وابستہ مادی وسائل وفوائد کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے۔ جبکہ اہل حق کے سلاسل میں یہ سارے طبقات قربانی دے کر صرف سلسلے کا پھیلنا اور حضرات کی تعلیمات کے باقی رہنے کو ہی مقصد گردانتا ہے۔ چنانچہ حضرت کے خاندان خصوصاً اہلیہ، برادران نسبتی اور حضرت کے بہن بھائیوں نے اس کا پورا ثبوت دیا۔ حضرت کا لاکھوں روپے کا کتب خانہ عام فائدے کے لیے وقف کر دیا۔ اپنی زمین دے کر حضرت کی یاد میں مسجد تعمیر کروائی اور خلفاء کو کام کرنے کے لیے مستقل جگہ فراہم کی۔

خلفاء نے مجلس مشاورت قائم کر کے ترتیب اور تنظیم کے ساتھ کام کرنا شروع کیا اور ایک دوسرے کی سرگرمیوں کی تائید کو اپنایا۔ متفقہ طور پر حاجی عبدالرحمٰن صاحب کو مدرسہ امدادلعلوم کا مہتمم بنایا گیا۔ چنانچہ مدرسہ جس سکون اور کامیابی کے ساتھ آپ کی زندگی میں چل رہا تھا اسی طرح اب بھی چل رہا ہے۔

سالانہ دستار بندی کے موقع پر جب بندہ کی حاضری ہوتی ہے اور سینکڑوں حفاظ ودورہ حدیث کے طلباء کی دستار بندی ہوتی ہے تو بے ساختہ زبان پر سعدیؒ کا یہ شعر آتا ہے

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدہء عالم دوامِ ما

ترجمہ: وہ ہرگز نہیں مرتا جس کا دل عشق سے زندہ ہوا۔ صفحہ ہستی پر ہمارا ہمیشہ کے لیے باقی رہنا لکھا ہوا ہے۔

****

حضرت مولانا اشرف خان صاحب سلیمانی رحؒ

کی اصلاحی تقاریر

اسلام کا نظریۂ عدل وسزا

کیا اسلام میں وحشیانہ سزائیں ہیں؟

(از مولانا محمد اشرف ایم۔اے صدر شعبہ عربی اسلامیہ کالج پشاور)

وسط جون ۱۹۶۸ء میں ایک دینی مدرسہ کے سالانہ جلسہ کے سلسلہ میں مظفر آباد (آزاد کشمیر) کا سفر جناب مولانا عبد القدوس صاحب صدر شعبہ اسلامیات پشاور یونیورسٹی کی رفاقت میں پیش آیا۔ مظفر آباد میں داعیانِ جلسہ جناب مولانا مفتی عبد القدوس صاحب اور جناب مولانا مظفر حسین شاہ صاحب ندوی کی عنایت سے کئی مجالس کو خطاب کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس سفر میں ''حلقہ فکر ودانش'' مظفر آباد نے وہاں کے دانشوروں اور تعلیم یافتہ حضرات کی ایک مجلس میں فقیر سے اسلامی نظریہ عدل وقانون کے بارے میں استفسارات کرتے ہوئے یہ سوال کیا کہ ''اسلام کا نظریۂ عدل وسزا کیا ہے؟ اور اسلام میں وحشیانہ، بہیمانہ اور ظالمانہ (جیسا کہ معترضین کہتے ہیں) سزائیں کیوں ہیں؟'' ہیچمدان نے فی البدیہہ (extempore) جو گذارشات پیش کیں، انھیں رفیق سفر عزیزی شیر حسن خان صاحب (لیکچرر ایگریکلچرل کالج پشاور) نے اسی وقت قلمبند کر لیا تھا۔ (عزیز موصوف کی اس عنایت کا ممنون ہوں)۔ تقریر بحمد اللہ تعالیٰ پسند کی گئی اور اس کو دک ناداں قانون وفقہ سے نابلد کی بات کو سراہا گیا اور اشاعت کی خواہش کی گئی۔ جس سے اپنی کم سوادی کو منظر عام پر لانے کی جرأت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اسے ہم سب کے لیے نافع بنائے۔ آمین۔ نظر ثانی میں حوالوں کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

(محمد اشرف)

نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّی عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡم

ہر قانون کی چند بنیادیں ہوتی ہیں:

جس موضوع پر مجھ جیسے ناقص العلم کو بولنے کے لیے کہا گیا ہے، وہ جس علم وبصیرت اور فکر ونظر کی بالیدگی اور قانونی مطالعہ کی وسعت کو چاہتا ہے، بندہ اس سے یکسر کورا ہے۔ تاہم آپ حضرات کی ذرہ نوازی کا شکر گذار ہے۔ اور آپ کے ارشاد کی تعمیل میں یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ ہر قانون کی اساس وبناء قائم ہوتی ہے اور قانون کے جملہ برگ وبار انہی جڑوں سے فروغ پکڑتے ہیں۔ قانون کا پورا ڈھانچہ انہی پر استوار ہوتا ہے۔ ان اصولی بنیادوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو کسی ملک وقوم یا دین کے قانون کو نہیں سمجھا جا سکتا۔

قانون کا منبع اللہ کی ذات ہے:

ہمارے نزدیک جو قومیں خدا کو مانتی ہیں اور آسمانی مذاہب کی قائل ہیں، ان میں اکثر قانون کا منبع خدا کی ذات کو سمجھتی ہیں۔ دوسرے ادیان سے اس وقت بحث نہیں اور نہ ہی ان کے متعلق کسی بات کی اس مختصر نشست میں ضرورت وگنجائش ہے۔ تاہم اسلام جو بیک وقت دین ودنیا کا جامع اور ظاہر وباطن کی اصلاح کا کفیل ہے، نظامِ اخلاق ومعاشرت، معیشت واقتصاد، سیاست مُدن وتدبیر منزل کے اعلیٰ اصولوں پر حاوی اور عدل وانصاف کی ''الٰہی ترازو'' کو قائم رکھے ہوئے ہے، اس کا نظریہ یہ ہے کہ قانون کا واحد منبع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی قانون بنا سکتا ہے نہ دے سکتا ہے اور نہ اس میں تغیر وتبدل کا مجاز ہے۔ جس طرح سروری (soverinity) صرف ایک ذات واحد کو زیبا ہے

؎ سروری زیبا فقط ایک ذات بے ہمتا کو ہے (اقبال)

اسی طرح قانون ساز (legislator, law giver) بھی صرف ایک اللہ کی ذات ہے۔ یہاں شروع میں ہی یہ بات ضمناً عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلام کے خدا کا قانون بھی تفصیلاً اسی پر متوجہ اور لاگو ہوگا جو اسلام کے خدا کو مانتا اور اسلام کو برحق جانتا اور اپنے کو مسلمان سمجھتا ہے۔

غیر مسلموں پر خدائی قانون کا اجراء تفصیلاً نہیں ہوگا:

چنانچہ اسلام کے سب سے بڑے فقیہ و مجتہد و قانون دان امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے کہ اسلام کے تفصیلی احکام انھیں اشخاص پر جاری ہوں گے جو مسلمان ہیں۔ جیسے آپ کسی غیر ملکی (alien) پر اپنے ملک کے قانون کا اجراء کلیۃً وکماحقہٗ نہیں کر سکتے، اسی طرح جو مملکت الٰہیہ کا اپنے آپ کو شہری (citizen) نہیں سمجھتا اور اس دنیا کی خدائی مملکت میں وہ شرعاً اجنبی کی حیثیت رکھتا ہے اس پر خدا کے شرعی تفصیلی قانون کا اجراء نہیں ہوگا۔ جیسے آپ اپنا قانون اپنے شہری ہی پر لاگو کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا قانون اس طبقہ پر جاری و اثر انداز ہوگا جو خدا کو مسلمان کی حیثیت سے مانتا ہے۔

ہر قانون اپنے ماحول اور فضاء ہی میں سمجھا جا سکتا ہے:

بات یہ ہے کہ خدا کے قانون کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس قانون کے ماحول، فضا، اساس ، منشاء، مقاصد و غایات اور اصول و مبادیات کو سمجھیں۔ جو قانون ایک خاص مقصد و منشاء اور ایک خاص ماحول و فضاء کے لیے بنایا جاتا ہے، جب ہم اسے اس کے ماحول سے علیحدہ کر دیتے ہیں اور اس کے مقاصد و غایات سے خالی الذہن ہو کر ایک خلاء (vaccume) میں سوچتے ہیں تو اس کے متعلق ہم صحیح، متوازن اور مخلصانہ رائے قائم نہیں کر سکتے اور شک و شبہ میں مبتلاء ہو جاتے ہیں۔

خدا کے متعلق اسلام کا نظریہ اور قانون الٰہی:

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ اسلام میں قانون کا منبع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اب خدا کو اسلامی قانون کا منبع سمجھنے کے لیے ہمیں خدا کو بھی اسی صورت سے ماننا ہوگا جو خدا کے متعلق اسلام کا نظریہ ہے۔ یہ نہیں ہوگا کہ خدا کے متعلق جو دیگر ادیان و مذاہب واقوام و ملل کے نظریات ہیں ہم انھیں ''اسلام کے خدا'' کے متعلق بھی قائم کر لیں۔ اسلام میں صفاتِ الٰہیہ کا نظریہ دوررس، نتیجہ خیز، مؤثر اور عمیق و ہمہ گیر نتائج کا حامل ہے۔

اسلام کا خدا خالق بھی ہے اور آمر بھی ہے۔

اَلا لَہُ الْخَلْقُ وَلَا مْرُ تَبارَكَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ة (اعراف۔۵۴)

ترجمہ: سن لو اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور حکم فرمانا۔

وہ مالک بھی ہے تمام مخلوق بشمول انسان کے اس کی ملک ہے اور اسے اس پر تکویناً و تشریعاً ہر قسم کا تصرّف و اختیار حاصل ہے۔

وَ رَبُّكَ يَخلُقُ مَايَشَآءُ وَ يَخُتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الُخِيَرَةُ (القصص۔۶۸)

ترجمہ: اور تیرا رب پیدا کرتا ہے جو چاہے، اور پسند کرے جس کو چاہے۔ انکے ہاتھ میں نہیں پسند کرنا۔

خدا حاکم اعلیٰ ہے، مقنّن حقیقی ہے۔ احکام کا جاری کرنا اور قانون بنانا اسی کو زیب دیتا ہے۔

اِنِ الُحُکُمُ اِلَّا لِلّٰهِ (انعام۔۵۷)

ترجمہ: حکم کسی کا نہیں سوا اللہ کے

فَالُحُكُمُ لِلّٰهِ الُعَلِيِّ الُكَبِيُرِ (المؤمن۔۱۲)

ترجمہ: اب حکم وہی جو کرے اللہ سب سے اوپر بڑا

اس لیے اس نے ہی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے قانون وشریعت سے سرفراز فرمایا اور پھر آپ کو اس کے مطابق حکم و فیصلہ کرنے کا امر فرمایا۔ ارشاد ربّانی ہے،

ثُمَّ جَعَلُنٰكَ عَلٰى شَرِيُعَةٍمِّنَ الُاَ مُرِ فَا تَّبِعُهَا وَلَا تَتَّبِعُ اَهُوَآ ءَ الَّذِيُنَ لَا يَعُلَمُوُنَ (الجاثیہ۔۶)

ترجمہ: پھر تجھ کو رکھا ہم نے ایک رستہ پر دین کے کام کے سو تو اسی پر چل اور مت چل خواہشوں پر نادانوں کی۔

فَاحُكُمُ بَيُنَهُم بِمَآ اَنُزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُ اَهُوَآءَ هُمُ عَمَّا جَآءَ كَ مِنَ الُحَقِّ لِكُلٍّ جَعَلُنَا مِنُكُمُ شِرُعَةً وَّ مِنُهَا جًا (المائدہ۔۴۸)

ترجمہ: سو تو حکم کر ان میں موافق اس کے جو کہ اتارا اللہ نے اور ان کی خوشی پر مت چل چھوڑ کر سیدھا راستہ جو تیرے پاس آیا، ہر ایک کو تم میں سے دیا ہم نے ایک دستور اور راہ۔

وَ اَنِ احُكُمُ بَيُنَهُمُ بِمَآ اَنُزَلَ ا للّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُ اَهُوَآ ءَ هُمُ وَحُذَرُ هُمُ اَنُ يَّفُتِنُوُكَ عَنُ بَعُضِ مَآ اَنُزَلَ اللّٰهُ اِلَيُكَ (المائدہ۔۴۹)

ترجمہ: اور یہ فرمایا کہ حکم کر ان میں موافق اس کے جو کہ اتارا اللہ نے اور مت چل ان کی خوشی پر اور بچتا رہ ان سے کہ تجھ کو بہکا نہ دیں کسی ایسے حکم سے جو اللہ نے اتارا تجھ پر

قانون بنانا صرف خدا کا حق ہے:

غرض قانون بنانا صرف خدا کا حق ہے۔ انسان خدا کے نائب اور خلیفہ کی حیثیت سے قانون کا

اجراء تو کرسکتا ہے، قانون بنا نہیں سکتا۔ قانون کی تجویز، اس میں تغیر و تبدل، کسی چیز کو حلال و حرام اور جائز و ناجائز قرار دینا اور اوامر و نواہی کو قائم کرنا صرف خدا تعالیٰ کا حق ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس سلسلے میں خدا سے قانون لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر قانون کھولتا ہے اور وہ خدا سے لے کر انسانوں کو بتاتا اور سکھاتا ہے نیز اس کا اجراء کرتا ہے۔ وہ حدود کے اندر اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نبوی بصیرت و فراست سے اس کی تشریح کرتا ہے۔ وہ قانون الٰہی کا شارح ہوتا ہے، شارع نہیں ہوتا۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب کو جو انبیاء یا پیشوایان مذہبی کو تحلیل و تحریم کا مجاز سمجھتے تھے ایک معنیٰ میں مشرک قرار دیا۔ جب آیہ کریمہ

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَ رُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا (توبہ۔۵)

ترجمہ: ٹھرالیا اپنے عالموں اور درویشوں کو خدا، اللہ کو چھوڑ کر

اتری تو حضرت عدی بن حاتمؓ (جو پہلے عیسائی تھے) نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ ہم اپنے پیشوایانِ مذہبی کو اپنا رب تو نہیں سمجھتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم لوگوں کا یہ اعتقاد نہ تھا کہ یہ لوگ جس چیز کو چاہیں حلال اور جس کو چاہیں حرام کر دیں؟ عرض کی ''ہاں''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہی رب بنانا ہے۔ (سیرت النبیؐ ص ۴۲۹ بحوالہ جامع ترمذی و ابن کثیر) (سیوطی نے درمنثور ص ۲۳۰ ج ۳ میں مختلف کتب حدیث سے عدی بن حاتم اور خذیفہ وغیرہ کی اس قسم کی روایتیں نقل کی ہیں)

عدلیہ قانون بدلنے کی مجاز نہیں:

قانون دان حضرات جانتے ہیں کہ دنیا کے کسی ملک کی کوئی چھوٹی بڑی عدالت قانون میں ردوبدل کی مجاز نہیں ہوتی۔ وہ قانون کے مطابق فیصلہ تو کرسکتی ہے، قانون کی وضاحت (intrpetation) اور پیشکش اس انداز میں تو کرسکتی ہے کہ جس سے قانون کے معنیٰ میں توسیع پیدا ہو جائے، لیکن میرے نزدیک دنیا کی بڑی سی بڑی عدالت بھی قانون کو رد یا اس میں تغیر و تبدل یا اس کے مطلب و منشاء کے خلاف اس کی ترجمانی نہیں کرسکتی۔ اس مثال سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ اسلام میں قانون ساز و مقنن حقیقی تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور وہ قانون کو انبیاء علیہم السلام پر کھولتا ہے اور سب سے آخر میں اس نے ہمیشہ کے لیے اپنے دائمی قانون کو خاتم النبیّین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کھولا۔ آپؐ کی حیثیت قانون کو خدا سے لے کر پیش کرنے والے اور اس کے اجراء و تشریح کرنے والے کی ہے۔ مطلقاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم شارع

نہیں بلکہ نائب حق کی حیثیت سے قانون خداوندی کے کھولنے والے ہیں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے آخری قانون کو انتہائی تکمیل، تمیم اور سبوغ کے ساتھ کھولا اور فرما دیا،

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِ سْلَامَ دِیْنًا ۔ (المائدہ۔۳)

ترجمہ: آج میں پورا کر چکا تمہارے لیے دین تمہارا، اور پورا کیا تم پر میں نے احسان اپنا، اور پسند کیا میں نے تمہارے واسطے اسلام کو دین۔

وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (الانعام۔۱۱۵)

ترجمہ: اور تیرے رب کی بات پوری سچی ہے اور انصاف کی، کوئی بدلنے والا نہیں اس کی بات کو، اور وہی ہے سننے والا جاننے والا۔

وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاھِرَۃً وَّ بَاطِنَۃً (لقمٰن۔۲۰)

ترجمہ: اور پوری کر دیں تم پر اپنی نعمتیں کھلی اور چھپی

یہ قانون اللہ تعالیٰ نے صحیفہ قرآنی اور سنت نبویہ کی صورت میں دیا۔ قرآن اصولی قانون اسلامی ہے اور سنت اس کی تبیین وتشریح، بیان وتوضیح اور تفصیل ہے۔ جو سب عطاء وموہبت رب ہے۔ ایک وحی متلو ہے اور ایک وحی غیر متلو، دونوں کا سوتا اور منبع ایک ہے۔ ایک میں الفاظ ومعنی سب کلیۃً اللہ تعالیٰ کے ہیں، دوسرے میں مطالب ومعنی، حقائق ومنشاء ربّانی ہے اور الفاظ واعمال، تشکیل وپیشکش گو نبوی ہے لیکن اللہ کے احکام کے مطابق منشائے الٰہیہ کا ظہور اور توفیق الٰہی اور ارادت رحمانی کا ثمرہ اور نتیجہ ہے۔ اس لیے ارشاد ہے

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (النساء۔۸۰)

ترجمہ: جس نے حکم مانا رسول کا اس نے حکم مانا اللہ کا

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ؕ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (النجم۔۳،۴)

ترجمہ: اور نہیں بولتا اپنے نفس کی خواہش سے، یہ تو حکم ہے بھیجا ہوا۔

سنت:

جو قانون قرآن میں واضح طور پر دکھائی نہیں دیتا، اس کو ہم سنت سے معلوم کریں گے۔ اگر سنت

میں نہیں ہے تو اسے قرآن وسنت کے انتہائی محتاط اور منشائے ربّانی کے مطابق تدبر و تفکر سے قرآن وحدیث سے مستنبط کرنے کی سعی بلیغ اور اجتہاد (deduce) کریں گے۔ اگر یہ سعی وکوشش اجتماعی ہوئی اور اس پر اہل علم کا پورا طبقہ متفق ہو گیا ہو تو وہ اجماع کہلائے گا، ورنہ اسے قیاس کہیں گے۔

اسلامی قانون کے چار مآخذ:

اسلامی قانون کے یہ چار بنیادی مآخذ ہیں، جن کی تتمیم وتوسیع دیگر مآخذوں سے کی گئی ہے۔ جو سب انہی کا شاخسانہ اور نتائج ہیں۔ قرآن کی ایک آیت اس سلسلے میں بیان کرنا غالباً اس مختصر نشست میں کافی ہو گا۔

وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡہِمۡ وَ لَعَلَّہُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ (النحل۔۴۴)

ترجمہ: یہ یادداشت کہ تو کھول دے لوگوں کے سامنے وہ چیز جو اتری ان کے واسطے، اور وہ تاکہ وہ غور کریں۔

ہیچمدان سمجھتا ہے کہ اس آیہءِ کریمہ میں اسلامی قوانین کے چاروں مآخذوں کا بیان ہے۔ الذّکر سے مراد قرآن کریم لتبین لِلنّاس سے مراد سنت نبوی اور یتفکرون سے ''شرعی اجتہاد'' کے دیگر مظاہر اجماع و قیاس وغیرہ ہیں۔ اس آیت میں ادنیٰ تامل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سنت اور اجتہاد (اجماع وقیاس) کا آخری مرجع بھی، الذّکر یعنی کتاب حکیم ہے۔ تفصیل آپ اصول فقہ کی کتابوں میں دیکھ سکتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت:

غرض قانون اسلامی بنانے والی اصلاً صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ نبی قانون الٰہی کا ترجمان، داعی، مظہر اور نمونہ بن کر آتا ہے۔ جس کی ذات میں قولاً وعملاً اللہ جلّ ذکرہُ کی قانونی منشاء کا ظہور رہتا ہے۔ اس میں احکام الٰہیہ اور قرآنی اوامر عملاً مجسد ومتشکل ہو جاتے ہیں۔ اس کے دل میں یقین اور حقائق ربّانیہ متحقق ہو کر اسے ربانی معرفت وللّٰہیت کا مخزن ومنبع بنا دیتے ہیں۔ اس کے جسم سے ہر حالت میں ایسے اعمال کا صدور ہوتا رہتا ہے جو بتوفیق الٰہی طاعت خداوندی اور امتثالِ اوامر ربّانیہ کا انتہائی کامل نمونہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے سے نہیں کہتا بلکہ جو بھی کہتا ہے خدا سے سن کر کہتا ہے۔ جو بھی امر و نہی دیتا ہے خدا سے سن کر دیتا ہے۔ پس نبی اصلاً شارع وقانون ساز نہیں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے قانون کا پہنچانے والا ہے۔ نافذ وجاری کرنے والا اور اسے عملاً

پیش کرنے والا اور قولاً وضاحت کرنے والا ہے۔اس کی یہ حیثیت بھی مطاع و پیشوا کی ہے،اس کی ہر بات مانی جائے گی اوراس کے ہر عمل کا اتباع کیا جائے گا۔

اسلام میں خدا کا تصور:

ان گذارشات سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ اسلامی قانون کا منبعِ اصلی و ماخذ حقیقی اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات ہے۔اس حقیقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے اسلام میں خدا کا جو جامع تصور ہے اسے مستحضر فرمائیں۔میں اس وقت دیگر ادیان کے ''تصوّرِ خدا'' کے متعلق جو نظریات ہیں ان کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ان کا اپنے خدا کے متعلق جو بھی نظریہ ہو،اسلام کا اپنے ''خدا'' کے متعلق جو نظریہ ہے وہ اپنی جامعیت میں اپنی مثال آپ ہے۔اسلام کا خدا وہ واجب الوجود ذات ہے جو جملہ صفاتِ کمال و جمال،جلال ونوال سے متصف تمام اسمائے حسنیٰ کا جامع اور ہمہ خوبی و محبوبی،قدرت وعظمت اور ہر حمد و ثنا کا اصلاً سزاوار ہے۔جو کچھ خوبی اور کمال ہے اُس میں ہے اور جہاں بھی ہے اسی سے ہے،کسی کا ذاتی نہیں۔صرف وہی کبیر و متعال ذات ہر صفت حسنہ سے موصوف اور ہر خیر کا مبداء و منتہا ہے۔اسلام کا خدا جملہ مخلوق کا خالق بھی ہے،مالک بھی ہے، حاکم بھی ہے اور حکیم بھی۔وہ ایسا عالم و علیم ہے کہ کون و مکان اور موجودات و کائنات کی کوئی چیز اس سے کسی بھی وقت او جھل و پوشیدہ نہ تھی اور نہ ہوگی۔وہ پوری مخلوق اور تمام انسانیت کے احوال ظاہرہ و باطنہ کا ازل سے ابد تک جاننے والا ہے۔کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا نہ آئندہ آئے گا جس کا علم اس علیم و خبیر خالق کو ازل ہی میں نہ ہو۔وہ اپنی ذات سے علیم ہے،علم اور جاننا اس سے ہی قائم ہے۔ازمنہ (زمانے) وامکنہ (ممکنات) کے جملہ دوائر،ان میں پیش ہونے والے حوادث واحوال،ان میں پیدا ہونے والی جملہ خلائق مخلوقات اس کے سامنے ہمیشہ سے عیاں اور مشاہد ہیں۔وہ ان کے ظاہر و باطن کو جانتا ہے۔وہ عالم جن کو ہم جانتے ہیں یا نہیں جانتے، وہ اشیاء جن کا ہمیں علم ہے یا نہیں،علم انسانی کے ادراک سے باہر کے مکان وزمان یا دائرہ زمان و مکان سے بیرون کے احوال وظروف سب اس پر روشن و ہویدا و آشکارا ہیں۔وہ ازل سے جانتا تھا کہ چودھویں صدی ہجری (یا بیسویں صدی عیسوی) میں کیا ہوگا۔اللہ تعالیٰ پر یہ بات پوشیدہ نہیں تھی کہ دور خلاء وصنعت (age of tech -nology and space) یا جوہری زمانہ (atomic age) آنے والا ہے۔وہ اس دور کے انسانوں ان کے ماحول،ان کی ضرورتوں،ان کی حاجتوں،ان کے علم و دانش،فکر و کاوش،ان کی صنعت

وحرفت، ان کی مادی ترقیات، ان کی روحانی کم مائیگی ہر چیز کو ازل سے ہی جانتا ہے۔ قرآن کہتا ہے

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنْکُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِیْنَ (الحجر۔۲۴)

ہم تمہارے اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور ہم تمہارے پچھلوں کو بھی جانتے ہیں۔

وہ یہ بھی جانتا تھا کہ رسل ورسائل کی آسانیوں سے دنیا کے فاصلے کم ہو کر پوری دنیا ایک بڑے گھرانے کی حیثیت اختیار کر لے گی۔ خدا تعالیٰ دیکھتا تھا کہ ازل میں کیا تھا اور ابد میں کیا ہونے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو قرآن کے نزول کے وقت موجودہ زمانے کے حالات کا علم تھا:

جس وقت اللہ تعالیٰ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے قانون کو نازل فرما رہے تھے اور اسے ان پر کھول رہے تھے اور ان سے اس کی عملی تشکیل کروا رہے تھے اور انعامات خداوندی کی تکمیل، احکام الٰہیہ اور قانون ربّانیہ کی نزول وتشکیل وتعمیل ہو رہی تھی اور انسانیت پر نعمائے الٰہی کی تتمیم وسبوغ کا اعلان کیا جا رہا تھا اور خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حیطہ نبوت (jurisdiction of prophethood) کو ابد تک مستمر (چھپے ہوئے) فرما کر قیامت تک کے انسانوں کو ان کے لائے ہوئے احکامات وقوانین کا پابند بنایا جا رہا تھا۔ اور دین کی ابدی تکمیل اور صحیفہ اسلامی یا مجموعہ قوانین اسلامی کی دائمی حفاظت الٰہی کی علیٰ رؤس الشہاد (واضح اور اونچی) آواز لگائی جا رہی تھی، اس وقت اللہ کو خوب علم تھا کہ بیسویں صدی یا اس کے مابعد کیا ہو گا۔ انسانیت کو اس زمانہ میں عدل وانصاف کی ترازو کو قائم رکھنے اور اپنی انفرادی واجتماعی، اقتصادی وسیاسی، معاشی وعمرانی، قومی وملکی، بین الاقوامی وعالمی اور دینی ودنیاوی معاملات کو باحسن الوجوہ انجام دینے کے لیے کن قوانین ونوامیس اور احکام ودساتیر کی ضرورت ہو گی۔

قرآن مصالح دینی ودنیوی کا کفیل ہے:

اسلام کے علیم وخبیر خدا نے ہر زمانے کے جملہ حالات کو سامنے رکھ کر فطرت انسانی کو خالق کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے اور ہر طبقہ، ہر قوم، اور ہر نسل کے اجتماعی وانفرادی فوائد کو دیکھتے ہوئے، ہمیشہ کے لیے قرآن اور اسلامی قوانین کی صورت میں انسانی فلاح واصلاح کا وہ جامع ومانع دستور دے دیا جو ابد تک انسان کی معاش ومعاد کی ضرورتوں پر حاوی اور ان کے دینی ودنیاوی مصالح وفوائد کا واحد وتنہا ضامن وکفیل ہے۔ جس میں کوئی کجی نہیں۔ کسی طبقہ یا گروہ، نسل یا قوم کی خاص رعایت نہیں، جو سب کا ہے اور سب کے لیے ہے۔ اللہ

تعالیٰ کا ارشاد ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْکِتَابَ وَ لَمْ یَجْعَلْ لَّه عِوَجًا ٥ قَیِّمًا (الکھف۔۱)

ترجمہ: تمام خوبیاں اللہ کے لیے ثابت ہیں جس نے اپنے خاص بندے پر یہ کتاب نازل فرمائی اور اس میں ذرا بھی کجی نہیں رکھی اور اسے بالکل استقامت کے ساتھ موصوف (اور معاش و معاد کے منافع کا کفیل اور سنبھالنے والا) بنایا۔

اللہ تعالیٰ کا یہ قانون عدل و صدق کی ربّانی کسوٹی اور انصاف و دادرسی کا وہ سیدھا و معیاری ترازو ہے، جس نے انسان کی انسانی خودساختہ قوانین کی بندشوں، نسل و لون (رنگ) کی رعایتوں، ملک و وطن کے مفاد پرست شکنجوں، باطل ادیان کے ظلم و جور، برہمنیت و پاپائیت کے طغیان اور ہر زمانے کے اکاسرہ و قیاسرہ، جبابرہ و فراعنہ کی تعدی و سرکشی (ظلم و زیادتی) سے انسانوں کو نجات بخشی اور اللہ نے اپنے عدل و احسان کو اسلامی قانون کی صورت میں بندوں پر کامل کر دیا۔

اسلام کا خدا جابر و ظالم نہیں:

یہاں یہ بات بھی واضح کر دینی ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلام کا خدا جابر و ظالم نہیں۔ اس نے ظلم کو اپنے پر حرام کیا ہے۔ جیسا کہ قرآن و احادیث کی نصوص کثیرہ سے ثابت ہے، اسلام کا خدا انتہائی مہربان و کریم ہے، وہ رحمان و رحیم ہے، اسی طرح اس کے قانون کا جزو کل اس کی رحمانی و رحیمی شان کا مظہر ہے۔ جس کو ہم غضب سمجھتے ہیں اور العیاذ باللہ "ظلم و جبر" قرار دیتے ہیں وہ بھی حقیقتاً اس کی رحمانی شان کا ہی ظہور ہوتا ہے۔ اور اس کی رحمت اس کے ہر قانون میں رچی بسی ہوتی ہے۔ گو ہماری کج فہمی اور بے بسی ہماری نگاہوں میں "اسباب مستوری" کو پیدا کر دے۔ اس کا اعلان عام ہے

کَتَبَ رَبُّکُمْ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (الانعام۔۵۴)

ترجمہ: تمہارے پروردگار نے رحمت فرمانا اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ (الاعراف۔۱۵۶)

ترجمہ: اور میری رحمت ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے۔

رحمتی سبقت غضبی (بخاری)

ترجمہ: میرے غضب سے میری رحمت آگے بڑھ گئی۔

سبق رحمت بر غضب ہست اے فنا

لطف غالب بود بر وصف خدا (رومیؒ)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کے غضب پر اس کی رحمت کو سبقت حاصل ہے۔ لطف وکرم اللہ تعالیٰ کی غالب ترین صفت ہے۔

ہمارے خدا کی شان یہ ہے کہ وہ جو بھی قانون بنائے گا اس پر رحمت کا پہلو غالب ہوگا۔ جو ظاہراً سختی وغضب دکھائی دے گا وہ جبر وقہر بھی ہزار ہا عطا ومہر کا حامل اور بے شمار ظاہر وپوشیدہ حکمتوں سے مملو ہوگا۔ پس اللہ تعالیٰ کا قانون سراپا حکمت ورحمت اور خیر وبرکت ہی ہے۔

اسلام کی نظر میں سب انسان برابر ہیں:

ایک اور نکتہ نظر سے غور کیجئے تو یہ بات واضح ہوگی کہ اسلام کے خدا کی نگاہ میں تمام انسان برابر ہیں۔ اس نے انسانوں کو رنگ ونسل، مال ودولت، مرز وبوم کی وجہ سے ایک دوسرے پر ترجیح نہیں دی۔ اس نے بنی آدم کو گورے اور کالے، زرد وسرخ، زنگی وفرنگی میں تقسیم نہیں کیا۔ اس نے موجودہ دور کی ''انتہائی مہذب'' امریکی ویورپی اقوام کی طرح حبشیوں پر زندگی کی آسائشوں کے دائرے تنگ کر کے انھیں ''گھٹیا مخلوق'' قرار نہیں دیا۔ جس کے مظاہر آپ روزانہ جنوبی افریقہ اور امریکہ اور مہذب برطانیہ میں دیکھتے ہیں۔ اس نے برہمن وشودر، مختون وغیر مختون، ملکی وغیر ملکی کی تمیز روا نہیں رکھی۔ اس نے ''آریہ ورت'' کے سپوتوں یا ''آریہ مہر'' یا سورج دیوتا کی اولاد یا نسل اسرائیل یا کسی قوم وقبیلہ کی برتری کو جائز قرار نہیں دیا۔ اس نے بنی آدم کو وطنیت وقومیت اور رنگ ونسل کے محدود دائروں میں نہیں بانٹا اور نہ اسے عزت وذلت، اونچ نیچ اور شرافت ورذالت کا پیمانہ قرار دیا۔ وہ پوری انسانیت کا خدا ہے۔ امریکی، افریقی، عربی وعجمی، چینی وجاپانی، گورے اور کالے اس کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔

پیش قرآن بندہ و مولا یکے است

بوریا و مسند، دیبا یکے است

ترجمہ: قرآن کریم کی نظر میں غلام اور آقا ایک جیسے ہیں۔ (غلام کے زیر استعمال) بوریا (جو کم قیمت ہوتی

ہے)اور(آقا کے زیر استعمال)ریشم(کے بنے ہوئے گدے)ایک جیسے ہیں۔

معیار فضیلت تقویٰ ہے:

ارشاد ہے

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَ جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ۔ (حجرات۔۱۳)

ترجمہ: اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے۔اور تم کو مختلف قومیں اور خاندان بنادیا، تاکہ ایک دوسرے کی شناخت کرسکو۔اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہی ہے جو سب سے بڑا پرہیزگار ہے۔بے شک اللہ خوب جاننے والا ہے، پورا خبردار ہے۔

حدیث شریف میں ہے

لا فضل لعربیّ علیٰ عجمی و لا لا حمرا علیٰ اسود، کلکم بنو آدم و آدم من تراب (از ابونصر تابعی)

ترجمہ: نہ عربی کو عجمی پر فضیلت ہے اور نہ سرخ کو کالے پر۔سب آدم کے بیٹے ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔

قانون الٰہی میں وحدت ومساوات:

نگاہ ربّانی میں نسل انسانی کی اس برابری کا منطقی نتیجہ قانون میں مساوات و وحدت ہے۔اس لیے اسلامی عدل وانصاف کے ترازو میں امیر وغریب، شاہ وگدا، آقا وغلام کالے اور گورے، عربی وعجمی، ایرانی وچینی ،ترکی وہندی، یورپی وافریقی سب برابر ہیں۔اب اللہ تعالیٰ کی نظر میں اچھائی وبرائی کا پیمانہ اور عزت وذلت، قرب وبُعد کا معیار اس کے قانون کی پابندی اور عدم پابندی ہے۔جو اس کے قانون کا زیادہ پابند ہوگا خواہ کسی خاندان، کسی رنگ اور کسی قوم ووطن سے ہو وہ اس کا عزیز وقریب ہوگا۔حدیث میں ہے

ان اولی الناس بی المتقون من کانو و حیث لی کا نوا۔ (کنز الاعمال بحوالہ مسند احمد ص۳۴۳۔ج۲)

ترجمہ: مجھ سے زیادہ اقرب لوگ وہ ہیں جو متقی ہوں، جو بھی ہوں جہاں بھی ہوں۔

اور جو اس کے قانون کو توڑے گا اور اس کی پابندی نہیں کرے گا وہ اس کی نگاہ میں حقیر و ذلیل ہوگا۔ گویا نسل انسانی کی عزت و ذلت، اسلام میں انسانی و جاہلی رنگ و نسل و قومی و وطنی خود ساختہ وجوہ سے نہیں بلکہ قانون الٰہی انسان کی عزت و ذلّت کا معیار ہے۔ جس نے اسے پس پشت ڈالا وہ کوئی ہو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ادنیٰ و پست ہے۔ حدیث میں آیت بالا کی تفسیر کرتے ہوئے اس مفہوم کو ان لفظوں میں ادا کیا گیا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

یا ایھاالنّاس ان الناس رجلان برّ و تقیّ کریم علی اللّٰہ و فا جر شقی ھین علی اللّٰہ ثم تلی یا ایھا الناس ان خلقنکم من ذکر وا نثی

ترجمہ: اے لوگو! لوگ دو طرح کے ہیں، نیک و متقی (یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند) اللہ تعالیٰ کے نزدیک معزز ہے یا بدکار (اللہ تعالیٰ کا حکم توڑنے والا) کم بخت اللہ تعالیٰ کے نزدیک ذلیل۔ پھر دلیل میں یہ آیت پڑھی اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد و عورت سے پیدا کیا الخ

اور یہ تمیز بد و نیک بھی ان کی عنداللہ جاہ اور عزت کے بارے میں ہے ورنہ عدل و انصاف کے ترازو میں سب برابر ہیں۔ قانون کا جب اجراء ہوگا بر و فاجر، اچھے و برے کے اس خاص عمل کی خوبی و برائی کو دیکھا جائے گا۔ کسی کو نیک سمجھ کر جرم سے ''غلطی'' کی حالت میں بری نہیں قرار دیا جائے گا۔ اور ''بد'' کو ''برا'' ہونے کی بنا پر ''عدم گناہ'' پر تعزیر و سزا نہیں دی جائے گی۔

اسلامی عدل میں دوست و دشمن کی تمیز نہیں:

اس بارے میں الٰہی قانون کی وسعت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ اس میں دوست و دشمن، اپنے و پرائے کی تفریق بھی گوارا نہیں کی گئی۔ عدل میں نہ دشمن کی دشمنی حائل ہو اور نہ دوست کی دوستی ناجائز رعایت پر مائل کرے۔ ارشاد ربّانی ہے

وَلَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شَنَاٰنُ قَومٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعۡدِلُوۡ اِعۡدِلُوۡا ھُوَاَقۡرَبُ لِتَّقۡوٰی (مائدہ۔۸)

ترجمہ: اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو، عدل کرو یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے

وَاِذَاقُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَاقُرْبٰى (انعام۔۱۵۲)

ترجمہ؛اور جب بات کہو تو حق کی کہو، اگر چہ وہ اپنا قریب ہی ہو۔

قانون برائے عدل:

قانون کا بڑا مصرف یہ ہوتا ہے کہ عدل کو قائم کرے۔ عدل وہاں ختم ہو گا جہاں آپ اپنے تعلقات یا ظاہر و پوشیدہ مفادات کی بناء پر ناجائز رعایت کریں۔ یا کسی حاضر یا مستقبل میں آنے والے خوف واندیشہ سے غلط فیصلہ لکھ دیں۔ رعایت جج کے قدم کو ڈگمگا دیتی ہے یا خوف اس کے قدموں میں لرزہ پیدا کر دیتا ہے۔

ناانصافی کے اسباب:

اور یہ ’’ناانصافی‘‘ عموماً دو طرح کی ہوتی ہے۔ یا خاص طبقات واشخاص کو خاص قانونی مراعات اور قانون سے بالا دستی سے نواز دیا جاتا ہے اور ’’عام قانونی سزا‘‘ سے انھیں بری اور مامون قرار دے دیا جاتا ہے۔ یا قانون تو وہی ہوتا ہے لیکن کار پردازان قانون بڑوں کی ہیبت یا اپنے مفادات خاصہ کی بناء پر عدل کی ترازو کو مستقیم نہیں رکھ سکتے۔ پہلی شق کے بارے میں آج ان مہذب ممالک کے آئین وقانون کو دیکھئے جن کی چکا چوند نے ہمیں اپنے سے بیگانہ اور الٰہی قانون سے ناآشنا و بیزار کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ ہماری حالت ان کی تقلید میں وہ ہو چکی ہے کہ اقبال کو کہنا پڑا ؎

ارجمندی از شعارش می بری

من نه دانم تو توئی یا دیگری

ترجمہ: (اے مسلمان!) تو یہ سمجھتا ہے کہ اس (یعنی اہل مغرب) کے شعار اپنا کر قیمتی بن سکتا ہے؟ (یہ تمہاری غلط رائے ہے) میں نہیں جانتا کہ تو ’’تو‘‘ ہے یا تو کوئی دوسرا ہے۔ یعنی تو نے ابھی تک اپنے آپ کو نہیں پہچانا۔

مغربی قانون میں عدم عدل و عدم مساوات:

ایک دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ ملکہ برطانیہ اگر برطانیہ عظمیٰ کے وزیر اعظم کو گولی سے مار دے تو اس کے ملک کی کوئی عدالت اس کو مجرم قرار نہیں دے سکتی۔ کیونکہ قانون نے اسے مامون قرار دے دیا ہے۔

امریکہ اور روڈیشیا میں ساؤتھ افریقہ کی ''ترقی یافتہ'' سفید فام حکومتوں نے ''کالے اور گورے'' کے قوانین میں جو تمیز روا رکھی ہے وہ انصاف کے چہرے کا کریہہ و بھیانک سیاہ داغ ہے۔ انگریز دور کے عروج میں برکوچک میں مقامی (native) ''صاحب بہادر'' کے مقابلے میں کیا برابر کی دادرسی پاتا تھا؟

انسانی قانون عادلانہ نہیں ہوسکتا:

بلکہ مجھے کھل کر کہنے دیجئے کہ انسان کا بنایا ہوا قانون کبھی ''عدل'' ہو ہی نہیں سکتا۔ نہ وہ انصاف کے تقاضوں کو کما حقہٗ پورا کرسکتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہر شخص اور ہر انسانی جمیعت وطبقہ کے مخصوص رجحانات، میلانات، تقاضے اور مفادات ہوتے ہیں۔ جن سے وہ انسان ہونے کی حیثیت سے کلیۃً کبھی مبرّا نہیں ہوسکتے۔ وہ کچھ چیزیں ورثہ میں پاتے ہیں، کچھ باتیں انھیں ان کا ماحول، معاشرہ اور مخصوص تعلیم وتربیت دیتی ہے۔ کچھ خیالات وافکار ان کی طبعی افتاد ہوتے ہیں۔ انسان ''انسان'' سے بالا اور فطری کمزوریوں سے مبرّا ہوکر سوچ ہی نہیں سکتا۔

انسان کا ناقص علم ومشاہدہ:

انسان کا مستقبل کے حوادث وواقعات سے قطعاً ناواقف ونارسا علم اپنے قانون کی اساس وبنیاد ماضی کے کچھ محدود تجارب، فطرت وضروریات انسانی کا محدود فہم اور اپنے رجحانات خاصہ کے شعوری یالاشعوری پیچاک (الجھن) میں الجھی ہوئی سمجھ پر رکھتا ہے۔ اس لیے کوئی انسانی قانون دائمی طور پر کوتاہیوں سے پاک اور ''معیاری عدل'' کا نمونہ نہیں ہوسکتا۔

ناقص قانون ظلم ہے:

''نارسا علم'' کا حتمی نتیجہ ''ناقص قانون'' ہوگا۔ اور قانون کا نقص حقیقتاً ناانصافی وظلم ہے۔ گو اس کے بنانے والے عمداً اس کے مرتکب نہ ہوتے ہوں۔ لیکن قانون کی نگاہ میں ''عدل'' اتنا بلند اور اعلیٰ مقام رکھتا ہے کہ عمد وسہو کی قربان گاہ پر اسے بھینٹ نہیں چڑھایا جاسکتا۔ قانون ساز اداروں اور مجالس مقنّنہ کی روزانہ کی کاروائیاں انسان کی اس بارے میں کوتاہ رسی پر شاہد عدل ہیں۔ ایک ملک کی قومی اسمبلی یا پارلیمنٹ ایک قانون بناتی ہے اور وہ طبقہ جس کا وہاں غلبہ اور اکثریت ہوتی ہے قانون سازی میں اپنے مفادات پر نگاہ رکھتا ہے، اگر

انصاف ان کی راہ میں حائل ہوتا ہے تو تاویلات کے پردوں میں اسے چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

آمریت اور فاشزم میں شخص واحد کی انانیت قانونِ قومی کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔ اگر بعض لوگ سرمایہ دار کی بے جا حفاظت کرتے ہیں تو کیمونسٹ، مزدور کی حد سے بڑھ کر رعایت کرتا ہے۔ قانون تو وہی عادلانہ ہوگا جس میں کسی کی رعایت نہ ہو، خوف نہ ہو، ملکی رجحان نہ ہو، نسلی میلان نہ ہو، لونی (رنگ) پاس نہ ہو، علاقائی لحاظ نہ ہو، وطنی مفاد نہ ہو، طبقاتی عصبیت نہ ہو، غیر سے مخاصمت نہ ہو، اپنے کی بے جا حمایت نہ ہو، کنبہ پروری نہ ہو، دوست نوازی نہ ہو ''مفادات خاصہ'' کی بے جا نگرانی نہ ہو۔ قانون سازی میں مال وجاہ کی طلب نہ ہو، مدح وذم کی پرواہ نہ ہو۔

ہر قسم کے میلان سے پاک ہو کر قانون بنانا انسان کے بس میں نہیں:

غرض تمام مفادات سے بالا ہو کر اور ہر رجحان سے تہی دل وخالی دماغ ہو کر محض عدل وانصاف کی بقاء کے لیے قانون بنائے، یہ انسان کے بس کی بات نہیں۔ بلکہ یہ تو اس ذات کا کام ہے جو سب تعلقات سے بری ہو وہ نہ کسی کا بیٹا ہو، نہ کسی کا باپ اور نہ کسی کا رشتہ دار۔ وہ ہر انفعال سے منزہ، ہر خوف ورعایت سے مبرّا اور تمام نسلی ولونی اور ملکی ووطنی بندشوں سے پاک ہو۔ اور وہ ذات فطرت انسانی کے غوامض واندرون، اس کی جملہ ضروریاتِ انفرادی واجتماعی سے کلیۃً واقف، عالم السرائر اور مستقبل کے جملہ کوائف وواقعات اور حوادث وضروریات کو جاننے والی ہو۔ اور وہ صرف ایک اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ جس کی صفت ہی یہ ہے؛

لَمْ یَلِدْ وَ لَمْ یُوْلَدْ (الاخلاص۔۳)

ترجمہ۔ نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ کسی سے جنا گیا

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًاوَّ لَمْ یَکُنْ لَّہٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ وَ لَمْ یَکُنْ لَّہٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ کَبِّرْہُ تَکْبِیْرًا (بنی اسرائیل۔۱۱۱)

ترجمہ: سب تعریفیں اللہ کو جو نہیں رکھتا اولاد اور نہ کوئی اس کا ساجھی سلطنت میں اور نہ کوئی اس کا مددگار کمزوری کی وجہ سے، اور اس کی بڑائی کر بڑا جان کر۔

وَمَا یَنْبَغِیْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ یَّتَّخِذَ وَلَدًا۔ اِنْ کُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ لْاَ رْضِ اِلَّا اٰتِی الرَّحْمٰنُ عَبْدًا (مریم۔۹۲،۹۳)

اور یہ بات اللہ کی شان کے لائق نہیں کہ وہ اولاد اختیار کرے۔ (کیونکہ) جتنے بھی کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہیں سب خدا تعالیٰ کے روبرو غلام (بندہ) بن کر حاضر ہوتے ہیں۔

خدائی قانون پوری انسانیت کے لیے ہے:

خدا جو قانون دے گا وہ سب انسانیت بلکہ پوری مخلوق کو سامنے رکھ کر اور مستقبل کے وقائع و احوال کو جان کر دے گا۔ جس میں کسی کی رعایت نہیں ہوگی اور نہ کسی کا خوف، عدل میں مانع ہوگا۔ وہ ذاتی مفاد سے خالی ہو کر محض مخلوق پروری اور انسانیت کی دادرسی کے لیے دیا جائے گا۔ بقول رومیؒ:۔

من نہ کردم خلق تا سودے کنم بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

ترجمہ: میں نے تخلیق اس لیے نہیں کی کہ کچھ فائدہ حاصل کروں، بلکہ اس لیے کی کہ بندوں کو عطا کروں۔

یا عبادی انی حرّمت الظم علی نفسی و جعلتہ بینکم محرما و لا تظالمو (صحیح مسلم)

ترجمہ: اے میرے بندو میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے۔ اس کو تمہارے درمیان بھی حرام کیا ہے۔ تو تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔

اقبال نے بھی قانون الٰہی اور قانون غیر کے متعلق خوب کہا ہے

وحی حق بینندۂ سود ہمہ
در نگاہش سود و بہبود ہمہ
عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف
وصل و فصلش لا یرعیٰ لا یخاف
عقل خود بیں غافل از بہبود غیر
سود خود بیند نہ بیند سود غیر
غیر حق چو ناہی و آمر شود
زور بر ناتواں قاہر شود
حاصل آئین و دستور ملوک
دہ خدایاں فربہ و دہقاں چوں روک

ترجمہ: ا۔وحی حق (یعنی قرآن) سب کے فائدے اور مفاد کو دیکھتا ہے۔وحی حق پر مبنی نظام الٰہی میں تمام مخلوقات کے مفادات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔

۲۔وحی حق صلح اور جنگ دونوں حالتوں میں عدل کے دامن کو تھامے رکھتا ہے۔نہ تو دوستی میں ناجائز رعایت کا روادار ہوتا ہے اور نہ دشمنی میں کسی غیر اللہ سے خوفزدہ ہوتا ہے۔

۳۔خود بین عقل اپنے علاوہ کسی دوسرے کے مفاد کا خیال نہیں رکھتی، وہ صرف اپنے فائدے کو پیش نظر رکھتی ہے نہ کہ کسی دوسرے کا۔

۴۔جب غیر حق نظام کا علمبردار، حکمران بن جاتا ہے (تو اس کی حکمرانی میں) طاقتور کمزور پر غالب رہتا ہے۔

۵۔نظام ملوکیت کے آئین کا خلاصہ یہ ہے کہ سرمایہ دار، جاگیردار موٹا اور طاقتور ہوتا ہے جبکہ دہقان، کسان، مزدور تکلے کی طرح کمزور، نحیف اور ناتواں ہوتا ہے۔

قانون الٰہی میں ظلم کے چور دروازے نہیں:

غرض قانون الٰہی میں کسی خاص طبقہ، گروہ، جماعت یا فرد کے لیے قانونی مراعات وتحفظات کے نام سے ظلم وجور کا کوئی دروازہ کھلا نہیں رکھا گیا۔سب قانون کی نگاہ میں ایک ہیں۔اور سب پر ایک ہی قانون کی سیادت قائم ہے۔عدل وانصاف کا خدائی ترازو سب کے لیے یکساں ہے۔

قانون الٰہی نافذ نہ کرنے والے کون ہیں:

خدائی عدل ورحمت کی جو قدردانی نہیں کرتے، نہ اسے مانتے اور تسلیم کرتے ہیں اور نہ ہی اسے نافذ کرتے ہیں، ایسے ناشکر گذار قرآن کی نگاہ میں ''کافر'' ہیں، کہ وہ حقیقتاً خدائے بزرگ وبرتر کی حاکمیت و بادشاہی کے منکر ہیں۔جو عقیدۃً مان کر ان قوانین کا اجراء ونفاذ نہیں کرتے ان سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا۔عدل کے تقاضوں اور قانون عدل کی موجودگی کے علی الرغم وہ حق وانصاف کا برمحل استعمال نہیں کرتے۔اور عقیدۃً جو ماننے کے باوجود اپنی شہوات ونفسانی تقاضوں ومفادات خاصہ کی بناء پر اسکا اجراء ونفاذ نہیں کرتے وہ خدا تعالیٰ کی نگاہ میں بدکار وفاسق ہیں۔کہ قانون الٰہی کا عدم نفاذ مختلف نوعیّتوں اور مختلف صورتوں میں شناعت (برائی) کے مختلف مدارج رکھتا ہے۔کبھی وہ کفر صریح بن جاتا ہے۔کبھی وہ فسق وعصیان ہے۔اور کبھی اس میں دو یا تین شناعتیں (برائیاں) مجتمع ہو جاتی ہیں۔قرآن کریم نے مختلف آیتوں میں ان لوگوں کو جو قانون الٰہی کے مطابق

فیصلہ نہیں کرتے کافر، ظالم اور فاسق قرار دیا ہے۔ چنانچہ سورہ مائدہ کی مختلف آیتوں میں وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ (اور جو شخص اللہ کے نازل کیے ہوئے حکم کے مطابق حکم نہ کرے)
فرما کر مختلف جگہوں پر فرمایا:۔

فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (آیت۔۴۴) سو ایسے لوگ بالکل کافر ہیں۔

فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (آیت۔۴۵) سو ایسے لوگ بالکل ظالم ہیں۔

فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ (آیت۔۴۷) ایسے لوگ بالکل بے حکمی کرنے والے (گنہگار) ہیں۔

ان گذارشات سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ اسلام کے خدا نے اگر ایک طرف ایسا قانون دیا ہے جو ہر خلاء وسقم سے پاک اور ہر طبقہ کے لیے عدل وانصاف کا کفیل ہے، وہاں وہ پوری الٰہی قوت سے اس کے نفاذ کا طالب بھی ہے۔ اور جو اسے نافذ نہیں کرتے انھیں وہ قرآنی لغت کے انتہائی سخت الفاظ سے تہدید کرتے ہوئے کافر و ظالم و فاسق قرار دیتا ہے۔ کہ عادلانہ قانون کا انتہائی اعلیٰ دستور ہونے کے باوجود جو اسے نافذ نہیں کرتا اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا۔

قانون کا معیاری نفاذ:

میں عرض کر چکا ہوں کہ قانون جتنا بھی عادلانہ ہوگا اگر اس کا نفاذ انصاف سے نہ کیا جائے تو قانون کا منشاء فوت ہو جاتا ہے۔ اس لیے اسلام نے کارپردازان عدل کو عدل کی انتہائی حدود کی پابندی کا حکم دیا ہے اور ہر قسم کے ناجائز دباؤ، جھکاؤ اور رعایت کو حرام قرار دیا ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قاضی (جج) تین قسم کے ہیں۔ ایک ان میں سے جنت میں ہوگا اور دو، دوزخ میں۔ جنت میں وہ ہے جو حق کو پہچانے اور اس کے مطابق فیصلہ کرے۔ اور ایک وہ ہے جو حق کو جاننے کے باوجود فیصلہ میں ظلم اور زیادتی کرے، وہ دوزخ میں ہے۔ (ابوداؤد، جمع الفوائد۔ص۲۸۲۔ج۱)

اسی طرح فرمایا اللہ تعالیٰ قاضی کے ساتھ ہوتا ہے جب تک وہ ظلم نہ کرے، اور جب وہ ظلم کرتا ہے، اللہ (کی مدد) اسے چھوڑ دیتا ہے۔ اور شیطان اس کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ (جمع الفوائد۔ص۶۸۳۔ج۱ بحوالہ ترمذی)

حدود کے اجراء میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نمونہ پیش کیا وہ قانون کی بالادستی کا شاہکار

ہے اور اسلامی عدل کا روشن مینار ہے۔

قانون کے اجراء میں رواداری اور نرمی کی اجازت نہیں:

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین اور فطرتاً و طبعاً انتہائی شفیق و کریم، رؤف و رحیم تھے۔ آپ امت کے گنہگاروں اور چوروں تک کے لیے روئے ہیں، لیکن حدود کے اجراء کے لیے آپؐ کسی کوتاہی کے روادار نہ تھے۔ قانون کی یہ پاسداری اور شفقت و رأفت کا یہ اجتماع حقیقت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دوگونہ شان جلال و جمال کا ظہور تھا جو اللہ تبارک و تعالیٰ کی صفات کا پرتو ہے اور جس پر قانون اسلامی کی بنیاد ہے۔ اسلام کا خدا عین رحمت ہے لیکن مصالح عامہ کے لیے اس کی حکمت مقتضی ہے کہ قانون کو ایسا بنایا جائے جس سے فاسد طبائع سرکشی نہ کرسکیں اور قوم و افراد ان کی وجہ سے نقصان نہ اٹھائیں۔

حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک چور لایا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ چور کا ہاتھ کٹتے دیکھ کر آپ کا چہرہ رنج و غم سے متغیر ہوگیا صحابہؓ نے کہا یا رسول اللہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ہاتھ کاٹنے کو ناپسند کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کون سی چیز مجھے اس سے مانع ہے کہ میں مجرم کے ہاتھ کٹنے پر رنجیدہ نہ ہوں۔ دیکھو! اپنے بھائی کے مقابلے میں شیطان کے مددگار نہ بنو۔ (کہ امام کے پاس معاملہ پہنچنے سے پہلے اسے معاف نہ کرو اور اسے توبہ کا موقع نہ دو)۔ کہ جب امام (حاکم) تک معاملہ پہنچ جائے تو حاکم کو یہ ہرگز جائز نہیں کہ وہ حد (اللہ کی مقرر کی ہوئی سزا) کو قائم نہ کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور عفو و درگذر کو پسند کرتا ہے۔ (تو تم بھی حاکم کے پاس معاملہ پہنچانے سے بیشتر میں معاف اور درگذر کردیا کرو۔) کیا تمھیں پسند نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمھیں بھی معاف کرے اور وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ (مستدرک حاکم، ص ۳۸۶ ج ۲ قال الحاکم هذا حديث صيح السنادولم يخرجا قال الذهبى صحيح)

قال تعا فو الحدود بينكم فما بلغنى من حدفقد وجب (مستدرک حاکم ص ۳۸۳ ج ۳ قال حاكم صحيح السناد و لم يخرجا ه وقا ل ذهبى صحيح)

ترجمہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آپس میں (جرموں) کو معاف کردیا کرو۔ پس جو (قابل سزا) معاملہ مجھ تک پہنچا تو اس کی خدائی سزا واجب ہوگئی۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مخزومی قبیلہ کی اونچے گھرانے کی ایک عورت نے جس کا نام فاطمہ تھا، چوری کی۔ قریش نے اس کی خاندانی شرافت ومقام کی وجہ سے یہ سمجھا کہ اگر اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا تو اس کی شان کے مناسب بھی نہیں ہوگا اور اثرات بھی اچھے نہیں ہوں گے (کہ اس میں پورے قبیلہ قریش کی بدنامی ہے)۔ معاملہ عدالت نبوت میں پہنچ چکا تھا۔ قریش نے یہ تدبیر کی کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آپؐ کے چہیتے حضرت اسامہ بن زید رضی اللّٰہ عنہ کو سفارش کے لیے بھیجا۔ جب حضرت اسامہؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ مبارک غصّہ سے متغیر ہو گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ اتشفع حد من حدو داللّٰہ (ترجمہ: کیا اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود (احکام) کے بارے میں تم سفارش کرتے ہو)۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو خطاب کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے اور ارشاد فرمایا کہ تم سے پہلی قومیں اسی لیے ہلاک ہو گئیں کہ جب ان میں سے کوئی شریف چوری کرتا تھا تو اسے چھوڑ دیا جاتا تھا اور جب کوئی ضعیف چوری کرتا تھا تو اسے سزا دی جاتی تھی۔

و اللّٰہ لو انّ فاطمہ بنت محمد سرقتُ لقطعت یدھا۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی)

خدا کی قسم اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی فاطمہ رضی اللّٰہ عنہا بھی چوری کرتی (معاذ اللہ) تو اس کا بھی ہاتھ کاٹ ڈالتا۔

باہمی معافی عدالت میں معاملہ پہنچنے سے پہلے پسندیدہ ہے:

تعافو الحدود بینکم فما بلغنی من حد فقد وجب (جمع الفوائد ص ۲۰۷ ابوداؤد، نسائی)

اپنے درمیان ایسے جرموں کو معاف کر دیا کرو جن پر حدود قائم ہوتی ہیں۔ مجھ تک جو بھی معاملہ پہنچا جس میں حد (سزائے الٰہی) مقرر ہے تو وہ واجب ہو جائے گی۔ (یعنی یقیناً و لازماً جاری کر دی جائے گی)۔

حاکم عدالت تک پہنچنے سے پہلے عفو درگذر کی حوصلہ مندی و ترغیب دی گئی ہے۔ لیکن عدالت کے کٹہرے میں پہنچنے کے بعد کوئی سفارش و رعایت قبول نہیں کی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ برا حاکم ہے جو خدا کی حدود کو جاری نہ کرے۔ شفقت سے قطع ید پر روتے ہوئے ہچکی بندھ جاتی تھی۔ لیکن حدود کے نفاذ میں ذرا برابر کوتاہی برداشت نہیں کی جاتی اور عدل و انصاف کے ترازو کو ہر حال میں سیدھا اور قائم رکھا جاتا ہے۔ اور عدل کرنے والوں کو مژدہ سنایا جاتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ (المائدہ۔۴۲)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

گناہ و جرم ایک ہیں:

ایک نکتہ اور بھی سمجھ لیا جائے تو بہتر ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یورپ والوں کے نزدیک جرم (crime) اور گناہ (sin) الگ الگ ہیں۔ ہمارے ہاں بیک وقت جرم و گناہ ایک ہیں۔ ہمارے ہاں دین و دنیا کی دوئی نہیں ہے۔ ہم نے عیسائیوں کی طرح اللہ تعالیٰ کی بادشاہی کو قیصر و خدا میں تقسیم نہیں کر دیا۔ کہ دین کا قانون اور ہو اور دنیا کا قانون اور۔ ایک کی سزا دنیا میں دی جائے اور ایک کی آخرت میں دی جائے۔ ہمارے ہاں قانون کُل کی حیثیت سے عمل کرتا ہے، وہ دین و دنیا کا جامع ہے۔ ہمارا نظریہ یہ ہے کہ اگر دنیا میں کوئی شخص کسی طرح خدا کے قانون کی گرفت میں نہ آ سکا، اس نے چرب زبانی یا کسی حیلہ بہانے سے اپنے حق میں فیصلہ کروا لیا تو آخرت میں اسے اس کی پوری پاداش ملے گی۔

جرم کی پاداش سے بچا نہیں جا سکتا:

صحاح میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں انسان (بشر) ہوں۔ میرے پاس مقدمہ میں مقابل (فریق) آتے ہیں۔ ممکن ہے تم میں سے ایک شخص دوسرے سے زیادہ (چرب زبان) بلیغ ہو اور اس کی چرب زبانی یا ظاہری دلائل کیوجہ سے میں یوں سمجھوں کہ وہ سچا ہے اور اس کے حق میں فیصلہ کر دوں۔ پس اگر میں ظاہری دلائل کی بناء پر اسے کسی دوسرے مسلمان کا حق فیصلہ میں دلا دوں تو وہ سمجھ لے کہ یہ دوسرے کا حق آگ کا ایک ٹکڑا ہے، پس چاہے تو اسے لے جائے اور چاہے تو چھوڑ دے۔ (جمع الفوائد۔ ۶۸۵۔ ج۱)

آخرت کی سزا:

گویا ناجائز طور پر کسی کا حق لینا آگ کو قبول کرنا ہے، جس کی سزا آخرت میں ملے گی۔ اسی طرح جسے اس دنیا میں اپنے کیے کی سزا مل گئی وہ آخرت کی سزا سے بچ جائے گا۔ صحابہؓ کو اس بات کا ایسا یقین تھا کہ وہ اپنے پر سنگساری جیسی سزاؤں کا اجراء اس لیے کروا لیتے تھے کہ دوزخ اور آخرت کی سزا سے بچ جائیں۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس شخص سے ایسا فعل سرزد ہوا جس پر حد لازم ہوتی ہے اور اس کی سزا دنیا میں مل گئی تو اللہ تعالیٰ اتنا عادل ہے کہ اپنے بندہ کو (اس گناہ یا جرم پر) آخرت میں دوبارہ سزا نہیں دے گا۔ اور

جس سے ایسا قابل حد (وسزا) فعل سرزد ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی پردہ پوشی کی اور اسے اپنی رحمت یا اس کی توبہ کی وجہ سے بخش دے تو اس کی کریمی شان، اسے اس جرم پر پھر نہیں پکڑے گی جسے اس نے معاف کر دیا ہے۔ (ترمذی۔جمع الفوائد ص ۲۱۷)

تصوّرِ آخرت وعدل پروری:

مسلمانوں کے معاشرہ میں اسلامی عدل کا اجراء اس ذہنی پس منظر میں زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ اور آخرت کی جزاوسزا کا تصور حاکم ومحکوم اور مدعی ومدعا علیہ دونوں کو حق کوش وعدل پرور بنا دیتا ہے۔ اسلامی عدل وانصاف کے جملہ پہلوؤں اور اس کے تمام فضائل، مزایا، خوبیوں اور کمالات کو اس مختصر نشست میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں وقت کی تنگی عدل اسلامی کے حسن وجمال کی نقاب کشائی میں حائل ہے۔ وہاں بندہ کی فن ناآشنائی اور کوتاہ دامنی مزید زنجیر پا ہے۔ تاہم امید کرتا ہوں کہ اسلامی عدل کے بعض زاویے آپ کے سامنے آ گئے ہوں گے۔ اور خدائی قانون اور اسلامی عدل کی چند مخصوص وبنیادی باتوں کی وضاحت ہوگئی ہے۔ اور اس کی امتیازی شان اور دیگر قوانین پر برتری ایک حد تک بیان ہوگئی ہے۔

آپ کے سوال کے دوسرے جز ''اسلام میں وحشیانہ اور بہیمانہ اور ظالمانہ سزائیں کیوں ہیں'' کا اجمالی جواب تو میری گذارشات پر غور کرنے سے آپ کو خود بخود مل جائے گا۔ کہ ایسے عادلانہ اور خدائی قانون کے متعلق ایسا گمان کرنا ہی غلط ہے۔ اور ایسی بات کہنا انتہائی دیدہ دلیری اور دریدہ دہنی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سوال اٹھایا جا رہا ہے اور ناواقفوں کو بہکایا جا رہا ہے اس لیے کچھ باتیں اس ضمن میں بھی عرض کر دیتا ہوں۔

وحشت وبہیمیت کیا ہے:

اولاً تو ظالمانہ، وحشیانہ اور بہیمانہ کے الفاظ سب ہماری خود ساختہ اضافی اصطلاحیں (relative terms) ہیں۔ پہلے یہ طے کیجئے کہ وحشت وبہیمیت اور ظلم کا ٹھیک ٹھیک مفہوم کیا ہے۔ اس کی حدود کہاں سے شروع ہوتی ہیں اور اس کا اطلاق کن پر ہوتا ہے۔ اپنے ذہن کو صاف کیجئے اور غیر جانبدار شخص کی حیثیت سے فیصلہ کیجئے کہ اسلام پر یہ الزام دہرانے والے خود کس شیشے کے مکان میں کھڑے ہیں۔ کیا یہ وحشت نہیں کہ برطانیہ کی پارلیمنٹ تلذذ بالمثل (homo sexuality) کے تحفظ کے لیے قانون بنا دیتی ہے۔ وہ فعل جس سے فطرت سلیمہ خود بخود اِباء (انکار) کرتی ہے اور عقل ودانش ان کے کرنے پر لعنت بھیجتے اور ماتم کرتے ہیں،

اسے دنیا کی ''مہذب ترین'' قوم اور ''قدیم ترین'' پارلیمنٹ جواز وتحسین کا پروانہ دے دیتی ہے۔عورت ومرد کے لیے میلان جنسی کی بناپر تو شاید کوئی گنجائش بے دین دانشمندوں کے ہاں تو نکل آتی۔لیکن تلذذ بالمثل (لذت ہم جنسی) کے لیے بربادشدہ سدوم والوں نے بھی جواز کا ایسا جدید (modren) طریقہ وطرز اختیار نہیں کیا ہوگا۔سچ ہے وحشت وبربریت اور تہذیب وترقی کے ڈانڈے مل جاتے ہیں۔انسانی قانونی ادارے جب چاہیں اور جس بہیمیت ووحشت کو چاہیں تہذیب وترقی کی قانونی سند دے دیں۔کہیں نسل کشی، کہیں اسقاط حمل اور کہیں نلکی زادگی (test tube baby) کو نہ صرف قانونی جواز دیدیں بلکہ حسن وکمال قرار دے دیں۔شہوات میں ڈوبی ہوئی نسل انسانی کی مجالس قانون ساز سے اور توقع کیا رکھی جاسکتی ہے۔

جو گناہ کیجئے ثواب ہے آج کی رات

''بزدل انسان'' اور دل کا آپریشن:

پرسوں ہی کے ایک اخبار (جنگ) میں ایک سرخی پڑھی۔''دنیا کا پہلا بزدل انسان''۔حیرت ہوئی کہ ''شیر دلوں'' کی دنیا میں یہ پہلا بزدل کہاں سے آگیا؟ دیکھا تو تفصیل سمجھ میں آئی کہ ایک دل کے مریض کا دل کاٹ کر مہربان اور شفیق ڈاکٹر نے وہاں بھیڑ کا دل لگا دیا اور اس طرح حقیقتاً پہلا بزدل (بھیڑ کے دل والا) انسان وجود میں آیا ہے۔ابھی تو ایک بزدل کا ظہور ہوا ہے۔دیکھتے جایئے کب ''سوردلوں'' اور ''بندردلوں'' کی فوج ظفر موج انسانی دل والوں کو حیوانیت کے میدان میں ہمیشہ کے لیے ختم کر کے انسانیت کا کامل جنازہ نکال دیتی ہے۔ابھی تو صرف قلوب خنازیر اور قلوب قردہ (بندر) کے بینک قائم کیے جارہے ہین۔آہ! رومی کس عالم میں کہہ گئے۔

دل فراز عرش باشد نے زپست

ترجمہ: دل (کا تعلق) عرش کی بلندی سے ہے نہ کہ (زمین کی) پستی سے۔

دل کا کاٹنا قانوناً درست نہیں:

بات دوسری طرف نکل گئی۔میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ کیا زندہ شخص کا دل کاٹ لینا، اس گمان پر کہ وہ مر جائے گا ظلم، وحشت، بربریت اور بہیمیت نہیں؟ ڈاکٹر کا گمان غالب ہے کہ فلاں شخص کا دل اسے زیادہ دیر تک زندہ نہیں رکھ سکتا، اس لیے اس کا دل کاٹ دیا جائے۔اور اس کی جگہ دوسرا دل پیوست کر دیا جائے تاکہ وہ کچھ

دن اور جی سکے۔ خواہ یہ نیا دل کچھ ہی دن بعد کام کرنا چھوڑ دے۔ لیکن آپ قانون دان ہیں۔ میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ قانونی نکتہ نظر سے کیا جہاں یقین نہ ہو، گمان غالب پر کسی کو قتل کی یعنی قطع قلب کی سزا بطور آزمائش ہی دی جاسکتی ہے۔ یہاں تو قانون کا فتویٰ یہ ہے کہ قانون میں سو وجوہ سے اگر ایک وجہ بھی مجرم کے حق میں جاتی ہے تو اس کا فائدہ مجرم کو پہنچے گا۔ مغرب میں کوئی ڈاکٹر لوگوں کے دلوں کو اپنے ظن غالب کی بنا پر انکی جان بچانے کے لیے کاٹ دے تو نہ یہ جرم ہے، نہ وحشت ہے، نہ بربریت، نہ بہیمیت، نہ ظلم، نہ عدوان۔ لیکن اسلام اگر پورے معاشرہ کی زندگی کے لیے فرد واحد کا ہاتھ کاٹ دے تو یہ بربریت وظلم ہے۔ سچ ہے۔

جو تیری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی وہ تیرگی جو میرے نامہ سیاہ میں ہے

قانون کا منشاء:

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ اور الزامی جواب تھا۔ اس مسئلہ کی طرف آیئے۔ آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں جو قانون بنائے جاتے ہیں ان کا منشاء سوسائٹی کی اعلیٰ اقدار کا تحفظ، مفادات عامہ کی حفاظت، امن وامان کی بقاء اور ایک دوسرے کے جان ومال وآبرو کا بچانا ہوتا ہے۔ مغرب نے انسان کو ایک ''بڑھیا حیوان'' قرار دیا ہے۔ انگریزی کا ایک مشہور قول ہے (man is a social animal) ''انسان ایک معاشرہ پسند حیوان ہے''۔ سوسائٹی کے اس بڑھیا حیوان کو tame (سدھانے) کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور اس طرح قوانین وجود میں آئے۔ یا یوں کہیے کہ انسان معاشرے میں رہتا ہے، سوسائٹی میں افراد کے روابط ایک دوسرے سے قائم ہوتے ہیں اگر ان روابط کو ضوابط کا پابند نہ کیا جائے تو انسانی زندگی اور جنگل کی زندگی میں فرق نہ رہے۔

قانون کب وجود میں آتا ہے:

باہمی ملاپ حقوق وفرائض کو پیدا کرتا ہے۔ کہ باہمی مفادات جب ٹکراتے ہیں تو حقوق کی نشاندہی کرنا پڑتی ہے۔ جب حقوق آتے ہیں تو فرائض آتے ہیں۔ ''حقوق وفرائض'' عادلانہ قوانین کی تشریح وتنفیذ چاہتے ہیں۔ پس فرد وجماعت کے مفادات کی نگہداشت، سوسائٹی کے اعلی حقوق کی حفاظت اور نظم وضبط کی بقاء کے لیے قوانین بنائے جاتے ہیں۔ سولن (solon) سے لیکر موجودہ دور کے سب مقنّن اس پر متفق ہیں کہ اگر انسانی معاشرہ کو نزاع (anarchy) اور وحشت وبہیمیت سے بچانا ہے تو مجموعہ کے مفاد پر فرد کا مفاد قربان

کیا جائے گا، جو مفاد عامہ سے ٹکراتا ہے اور اسے نقصان پہنچاتا ہے اور ضائع کرتا ہے۔

قانون سوسائٹی کے مفادات عامہ کی حفاظت کرتا ہے:

خصوصاً وہ فرد یا گروہ جو اپنے مفادات خاصہ کے لیے سوسائٹی کے حقوق کو ضائع اور پامال کرتا ہے، جماعت کے امن وامان کو برباد کرتا ہے اور ان کی عزت و جان و مال کے درپے ہوتا ہے، وہ سوسائٹی کا من حیث القوم مجرم ہے۔ معاشرے کا فرض ہے کہ ایسے ظالموں اور وحشیوں کو ان کے اس برے کام سے روکے ورنہ پوری سوسائٹی اس سے نقصان اٹھائے گی اور ممکن ہے اس کا یہ ''فعل قبیح'' پوری سوسائٹی کو لے ڈوبے۔ انسانیت کو سب سے بڑا عادلانہ قانون دینے والے اور نفسیات انسانی کے سب سے بڑے ماہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو ایک تمثیل میں پیش کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

''اس کی مثال جو اللہ کی حدود (احکام الٰہی) کا قائم کرنے والا ہے اور اس شخص کی مثال جو اللہ تعالیٰ کے احکام کو توڑنے والا ہے ایک ایسی قوم کی ہے، جنھوں نے ایک دو منزلہ جہاز میں قرعہ اندازی سے اپنی جگہیں مقرر کیں۔ بعض اوپر کی منزل میں اور بعض نچلی منزل میں ٹھرے ہوں۔ وہ لوگ جو نچلی منزل میں ہیں، جب انھیں پانی کی ضرورت پڑتی ہے، وہ پانی کے لیے اوپر کی منزل پر جاتے ہیں۔ پس اگر وہ یوں کہیں کہ ہم اپنے حصہء جہاز میں سوراخ کر لیتے ہیں اور اوپر والوں کو اذیت نہیں دیتے۔ پس اگر اوپر والے نیچے والوں کو ان کے ارادے کے مطابق سوراخ کر لینے دیں تو سب کے سب ہلاک ہوں اور اگر وہ نیچے والوں کا ہاتھ پکڑ کر ان کو روک دیں تو وہ بھی بچ جائیں اور باقی بھی سب بچ جائیں گے۔''

(الترغیب والترہیب منذری ص۔ ۲۴۸ ج۔ ۴ بحوالہ بخاری وترمذی)

قانون کا اجراء وحشت کا انسداد ہے:

غرض ایسے مجرم فرد و گروہ سے نمٹنے کے لیے اور اس کے شر سے سوسائٹی کو بچانے کے لیے اور سوسائٹی کے دیگر افراد کو افعال قبیحہ سے روکنے کے لیے ہر وہ قدم درست اور مناسب ہوگا، جو اس فعل قبیحہ کے مرتکب، سوسائٹی کے دشمن ''وحشی'' کو کیفر کردار تک پہنچا سکے۔ اور آئندہ کے لیے اسے خود بھی اس عمل سے روک دے۔ اور سوسائٹی کے دیگر افراد بھی اس سزا کو دیکھ کر ایسے اعمال سے بچ جائیں۔ گویا آج کے قانون کی اصطلاح میں سزا کا بڑا مقصد (deterent punishment) ہے۔ یعنی وہ سزا جس کا مدعا افعال قبیحہ

سے مجرم اور دیگر افراد کو روکنا ہے۔ سزا کا دوسرا اصلاحی (reformative) نظریہ جس میں ''روک'' سے بالکل اغماض برتا جائے اور جس کے تحت میں مجرم سے نرمی اور ہمدردی کارفرما ہو، وہ انسانی نفسیات کے مجرمانہ پہلو پر نگاہ نہیں رکھتا۔

قانون کو جرم کے انسداد کے قابل ہونا چاہئے:

ایسے قانون میں ہمیشہ ایسا رخنہ (loop hole) رہ جاتا ہے، جو سزا کے مقصد ہی کو فوت کر دیتا ہے۔ مجرم کے ساتھ نرمی و ناجائز ہمدردی غیر مجرموں کے ساتھ ظلم و زیادتی کے مترادف ہے۔ اس لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انصر اخاك الظالم اوِ المظلوم

ترجمہ: اپنے بھائی کی مدد کرو۔ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

اور لوگوں کے سوال پر ظالم کی مدد کا یہ مطلب بتایا کہ اسے ظلم سے روک دو۔ یہی اس کی اصل مدد ہے۔

(الترغیب والترہیب منذری ص ۱۶۱۔ ج ۳)

نرم قانون جرم کو نہیں روک سکتا:

آج امریکہ اور یورپ میں جہاں قوانین کی تشکیل میں یہ ہمدردانہ نظریہ کارفرما ہے، عدل وانصاف کے اصل تقاضے پامال ہو رہے ہیں اور جرائم کی رفتار روز افزوں ہے۔ بلکہ جرم کا عمومی رجحان بڑوں کے علاوہ چھوٹوں میں بھی پیدا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ قتل، ڈکیتی، چوری، زنا بالجبر اور طرح طرح کے ''جدید مہذب'' جرائم کی رفتار بڑھتی جا رہی ہے۔ جس پر وہاں کی مستند جرائم کی تفتیش کی رپورٹیں شاہد ہیں۔ آج یورپ و امریکہ (جن پر ہم اپنی متاع دین و دانش قربان کر چکے ہیں) اپنے ہاں جرموں کو بند کرنے پر قادر نہ ہو سکے تو ایک نئی فرنگیانہ ٹیکنیک استعمال کی، جسے اس سے پہلے ہمیشہ یہودی استعمال کرتے آئے ہیں کہ ہر جرم کو جرائم کی فہرست سے نکالنا شروع کر دیا، یا اس کی شناعت کو ہلکا بتانا شروع کر دیا، یا گناہ کو ہی نیکی بنا دیا۔ امریکہ اور یورپ کے قوانین کی تاریخ پر نگاہ رکھنے والے ہمارے اس دعوے کی یقیناً تائید کریں گے کہ وہاں جب جرم پر قابو نہیں پایا جا سکتا تو اسے قانونی نرمی سے ہمکنار کر دیا جاتا ہے۔ بلکہ اسے ''قانونی حفاظت'' میں دے دیا جاتا ہے۔ کلیسا پہلے چلاّتا ہے، پھر وہ بھی اپنے کو بے بس پا کر ہمنوا ہو جاتا ہے۔ وہ قانون جس میں مجرم کے ساتھ

دلی ہمدردی اور قانونی رعایت ہوگی، وہاں نہ تو جرائم رک سکتے ہیں اور نہ صحیح عدل قائم ہوسکتا ہے۔اس لیے اسلام نے قانون کے اجراء میں مجرمین پر نرمی کو پسند نہیں کیا۔اور کہا:

وَّلَا تَاْ خُذْكُم بِهِمَا رَاْفَة فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُم تُوْمِنُوْنَ بِااللّٰهِوَالْیَوْمِ الْاٰ خِرِ (النور۔۲)

ترجمہ: اور تم لوگوں کو ان دونوں (زنا کے مجرموں) پر اللہ تعالیٰ کے احکام کے بارے میں ذرا رحم نہ آنا چاہیئے۔اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔

اسلامی قانون میں معاشرہ کی حفاظت:

اسلام کا خدائی قانون جو فرد و معاشرہ دونوں کے حقوق کا واحد عادل نگران ہے، گو فرد کی سود و بہبود اس کی نگاہ میں ہے، مگر وہ معاشرہ کو فرد پر قربان نہیں کرتا۔اس کا نظریہ یہ ہے کہ اگر بیک وقت ایک بھی ڈوب رہا ہو اور دوسرے بھی ڈوب رہے ہوں تو ان کے بچانے میں اگر ایک ڈوبے تو ڈوبنے دو۔وہ یہ نہیں کہتا کہ مجرم کو اپنے جرائم میں ایسی رعایت دیدو کہ وہ پورے معاشرے کو یہ کہتا ہوا لے ڈوبے۔

ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے

قومیں وہی نجات و ترقی پاتی ہیں جو فرد کو ملت پر قربان کر دیتی ہیں۔وہ قومیں کبھی پنپ نہیں سکتیں جو افراد و مخصوص طبقات کے مفادات کو قوم و ملت، معاشرہ و سوسائٹی کے عمومی مفاد پر ترجیح دیتی ہوں۔

عبرت انگیز سزائیں:

اس لیے اسلام نے اپنے نکتہ نظر میں قانون میں اس بات کو پیش نظر رکھا ہے کہ مجرم کو ایسی سزا دی جائے، جس سے اس کے مادہء جرم کا استیصال ہو جائے۔اور یہ سزا ایسی عبرت انگیز ہو کہ دوسرے اسے دیکھ کر ہمیشہ اس عمل سے رک جائیں اور سوسائٹی ہمیشہ کے لیے اس روگ اور ناسور سے پاک ہوجائے۔اس لیے قرآن کریم نے جرم و سزا میں

جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَا لًا مِّنَ اللّٰهِ (المائدہ۔۳۸)

ترجمہ: سزا بدلے اس کے جو کمایا انھوں نے، اور عبرت خدا کی طرف سے۔

کا نظریہ پیش کیا ہے

اسلام کا نظریہ سزا:

قرآن کریم کے ان الفاظ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کا نظریہ سزا میں ۱۔ مکافات عمل (بدکرداری کا بدلہ) ۲۔ عبرت انگیزی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس سزا میں چونکہ مجرم اور معاشرہ دونوں کی بہبود پیش نظر ہے۔ اس لیے اگر مجرم کا جرم آشکارا ہو گیا ہے اور جماعت و معاشرہ نے اس برے فعل کو جان لیا ہے تو سزا بھی ایسی ہونی چاہئے، جو بیک وقت مجرم کو آئندہ کے لیے اس جرم سے روک دے۔ اور معاشرہ کے لیے بھی ایسی عبرت کا سامان مہیا کرے کہ اس معاشرہ کا کوئی بدفطرت خود بھی ایسے فعل قبیح کے اقدام کی جرأت نہ کر سکے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب مجرم کو قرار واقعی سزا دی جائے اور مجمع کے لیے اس کو درس عبرت بنا دیا جائے کہ وہ بزبان حال پکارتا پھرے۔

دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو

عبرت پذیری کے لیے ضروری ہے کہ چوری چھپے سزا نہ ہو۔ کہ اس سے عبرت پذیری کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا، اور عدل وانصاف اور اصلاح معاشرہ کا حق ادا نہ ہو سکے گا۔ اس لیے ایک اور مقام پر زنا کی سزا کے متعلق صاف الفاظ میں حکم دیا ہے

وَ لْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (النور۔۱)

اور دونوں کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت کو حاضر رہنا چاہئے۔

اسلامی نظریہ سزا کی ان چند بنیادوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اسلام کی سزاؤں پر نظر کیجئے۔ اس نشست میں تمام سزاؤں پر گفتگو کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے صرف دو سزاؤں چوری اور زنا کی سزا کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

چوری وحشت ہے، انسداد چوری کے لیے ہاتھ کاٹنا وحشت نہیں:

اسلام نے چور کی سزا ہاتھ کاٹنا مقرر کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وحشیانہ سزا ہے، چور پر ظلم ہے۔ میں یہ عرض کرتا ہوں کہ کیا چوری خود وحشیانہ عمل نہیں اور کیا وحشی کا ہاتھ کاٹنا وحشت ہے؟ معاشرہ کے لیے اگر اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے تو کیا حرج ہے؟ ایک کا ہاتھ کٹتا ہے، صدہا کے ہاتھ کی کمائی محفوظ ہو جاتی ہے۔ ہزاروں کی تجوریاں بچتی ہیں۔

قطع ید کے فوائد:

سعودی عرب میں جہاں آج سے پچاس سال پہلے لوٹ مار کے قصے مشہور تھے۔ آج ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ لاکھوں اور ہزاروں روپے کا مال دکان میں پڑا ہے۔ دکاندار نماز کے لیے کعبۃ اللہ جاتا ہے، آدھا گھنٹہ وہاں گذار کر آتا ہے، دریں اثناء دکان کھلی ہے لیکن کوئی آنکھ اٹھا کر بھی اس کے مال کی طرف نہیں دیکھتا، نہ ایک تنکا چوری ہوتا ہے۔ یہ سب اس سزا کی برکت ہے کہ چند لوگوں کے شروع میں ہاتھ کٹ گئے، آج کوئی ہاتھ چوری کرنے کے لیے نہیں بڑھتا۔ اگر ایک ہاتھ کٹ جائے، ہزاروں کو عبرت ہوگی۔ یہ مستقل سزا اور سامان عبرت ہے کہ ایک شخص کٹے ہوئے ہاتھ کے ساتھ پھر رہا ہے۔ لیکن اس کا یہ مدعا نہیں کہ جہاں یہ عبرتناک عادلانہ سزائیں نافذ ہوتی ہیں وہاں سب طرف ہاتھ کٹے ہوئے پھر رہے ہوتے ہیں۔ چند کا ہاتھ کٹا اور ہمیشہ کے لیے اس فتنہ کا سد باب ہو گیا۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ ساڑھے تین مہینے کے حجاز کے قیام میں ایک ہاتھ کٹے شخص کو نہیں دیکھا۔ نہ کسی کا ہاتھ کٹتے دیکھا۔ سزا کا تصور ہی اتنا ہیبت ناک ہے کہ کسی کو جرم کی ہمت ہی نہیں پڑتی۔ بقول سعدیؒ اگر ایک جگہ سے پانی پھوٹتا ہے تو اس کو سرمہ کی سلائی سے بند کر دو، ورنہ بعد میں ہاتھی بھی اسے بند نہیں کر سکے گا۔

آج اسلامی معاشرہ ہماری نگاہ سے اوجھل ہے۔ ورنہ جیسا کہ ڈاکٹر کے مشورہ پر ایک زہر رسیدہ ہاتھ (septic hand) کو جسم کے بچانے کے لیے کاٹ دیتے ہیں، اور اس میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے، اسی طرح سوسائٹی کو بچانے کے لیے چور کے ہاتھ کاٹنے پر ہم اعتراض نہ کرتے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ وہ شفیق ترین ماں جو بچے کے ہاتھ میں کانٹا تک چبھنا گوارا نہیں کرتی، اگر اس کے بیٹے کے ہاتھ میں پیپ پڑ جائے اور اسے ڈاکٹر کہے کہ بیٹے کا ہاتھ کٹوا دے ورنہ پورا جسم یا تمام بازو خراب ہو جائے گا۔ تو ماں اپنے تمام پیار و محبت کے باوجود ڈاکٹر کی نصیحت کو مانے گی اور بیٹے سے کہے گی کہ بیٹا! ہاتھ کٹوا لے کہ تیرا باقی جسم بچ جائے۔ اسی طرح رحیم و شفیق اللہ تعالیٰ کانٹا نہیں چاہتے لیکن معاشرہ کی جان، یعنی اس کے اخلاق اور اعلیٰ قدروں کو بچانے کے لیے اور اس کے حقوق اور مال و متاع کی حفاظت کے لیے فرد کا ہاتھ کٹا دیتے ہیں کہ بسا اوقات چوری جان لیوا تک ثابت ہو جاتی ہے۔ ہم سادہ دل روتے ہیں اور اعتراض کرتے ہیں، لیکن حکمت ربّانی مسکراتی ہے اور کہتی ہے، ذرا سوچو تو سہی، یہ سختی کتنوں پر نرمی کا سبب اور یہ ہاتھ کاٹنا کتنوں کی گردنوں کے بچاؤ کا ذریعہ بن گیا۔ یہ ''قہر خاص'' برائے ''لطف عام'' ہے۔ اور یہ قطع ید برائے حفاظت جسم و جان ہے۔ رومیؒ

فرماتے ہیں ۔

قهر خاصے از برائے لطف عام — شرع می دارد روا بگذار کام
گر نه دیدے سود او در قهر او — کے شدے آن لطف مطلق قهر جو
طفل می لرزوزینش احتجام — مادر مشفق در آں غم شاد کام
تو قیاس از ضویش میگریو لیك — دوردور افتاده بنگر تو نیك

ترجمہ: وہ خاص قہر جو عمومی فائدہ دے شریعت نے اس کو جائز رکھا ہے۔ اگر اپنے قہر میں فائدہ نہ دیکھتا تو وہ جو سراپا لطف ہے قہر کو کیوں اختیار کرتا۔ بچہ تو علاج کے لیے چبوئی جانے والی سوئی سے کانپتا ہے، لیکن اس کی مہربان ماں اس تکلیف سے خوش ہے۔ تو اپنے سے قیاس کرتا ہے، لیکن تو بہت دور جا پڑا ہے، ذرا صحیح دیکھ تو سہی۔

قطع ید کی سزا ظالمانہ نہیں حکیمانہ ہے:

غالباً ان معروضات سے یہ بات کھل کر سامنے آ گئی ہوگی کہ قطع ید کی سزا وحشیانہ نہیں بلکہ عین حکیمانہ ہے۔

زنا کی سزا:

زنا کی سزا کے متعلق کچھ کہنے سے بیشتر چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ مغرب، جس کی تقلید میں آج ہمیں اپنے قوانین کی قدر نہیں رہی اور ان کی سنی سنا رہے ہیں۔ اپنا ذہن مفلوج ہو گیا ہے، اپنی رائے باقی نہیں رہی۔ جسے یورپ اچھا کہتا ہے اسے ہم اچھا سمجھتے ہیں، جسے وہ بُرا قرار دیتا ہے اسے ہم برا تسلیم کر لیتے ہیں۔ ہم جیسوں کے لیے اقبال نے کیا خوب فرمایا تھا۔

ایں غلام ابن غلام ابن غلام — حریت اندیشه او را حرام
بر زبانت گفتگو ہا مستعار — در دلت اند آرزو ہا مستعار
قمریا نت را نوا ہا خواسته — سود ہانت را قبا ہا خواسته
ارجمندی از شعارش می بری — من نه دانم تو توئی یا دیگری

ترجمہ: ا۔ اس غلام قوم کے افراد پشت در پشت غلامی کا شکار رہے ہیں، ان کی فکر کے لیے آزادانہ سوچ

حرام سمجھا گیا ہے۔

۲۔اے غلام (قوم کے فرزند)! تیری زبان پر ہونے والی گفتگو بھی دوسروں کی ہے (تیری اپنی آزادانہ سوچ پر مبنی گفتگو نہیں)۔ تیرے دل کے اندر اٹھنے والی آرزو بھی (اپنی نہیں) بلکہ غیروں سے مستعار لی ہوئی ہے۔

۳۔تیری قمریوں یعنی خوش آواز گلوکاروں کی لے (اپنی نہیں بلکہ غیروں سے) بھیک مانگ کر حاصل کردہ ہے، اور تیرے سرو قد نوجوانوں کی قبائیں بھی غیروں کی تقلید میں بنائی گئی ہیں۔ (یعنی لباس کی ساخت میں بھی قومی اور ملی ثقافت کا خیال نہیں رکھا جاتا۔)

۴۔تو غیروں کے شعائر (یعنی ان کی تہذیب وثقافت) میں حسن، پاکیزگی اور تقدس سمجھتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تو ''تو'' ہے یا ''غیر'' ہے۔ یعنی اپنی مرضی کا خود مالک ہے یا دوسروں کے اشاروں پر ناچ رہا ہے۔

آج کسی مسئلہ پر بات کرنے سے بیشتر ہمیں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ مغرب کا اس بارے میں کیا رویہ ہے ۔اگر وہاں سے سند جواز مل گئی تو پھر کسی تحقیق کی ضرورت نہیں۔ اور اگر وہاں سے کسی بات کے غلط و ناجائز ہونے کا فتویٰ صادر ہو گیا تو ہماری زبانیں گنگ ہو گئیں، ہمارے دلوں پر تالے پڑ گئے اور ہمارے دماغوں کے سوتے خشک ہو گئے۔ ''مرعوبیت'' کی اس دنیا میں قلندرانہ جرأت، مؤمنانہ فراست، فقیہانہ دانش و حکمت، داعیانہ بیباکی و ہمت کے بغیر ایک قدم بھی آگے بڑھنا مشکل ہے۔

چیتے کا جگر چاہیئے، شاہیں کا تجسس
جی سکتے ہیں بے روشنی دانش و فرہنگ

جس شخص یا قوم کے پاس قرآن جیسی کتاب اور سید الانبیاء فخر رسل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسی ذات عالی موجود ہو، اسے یورپ کا ''سحر سامری'' پھسلا نہیں سکتا۔ اور وہ اپنے مسائل کے لیے عدل و حکمت سے تہی دامن غریب یورپ کی دریوزہ گری (بھیک مانگنا) نہیں کر سکتا۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

بہر حال میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ یورپ کے عیّارانہ استدلال اور ساحرانہ علم و فن سے

یکسو ہوکر اگر کسی مسئلہ پر سوچیں گے، تب اس کا اسلامی حل سمجھ میں آئے گا۔

عائلی احکام پر اعتراضات کے وجوہ:

اسلامی عائلی احکام پر اعتراضات مغرب اپنے خاص ذہن کی اور اپنی خاص تہذیب وتمدن وفضاء پروردہ عقل کی بناء پر کرتا ہے۔ آپ یہ جانتے ہیں کہ یورپ کا اپنا ایک خاص مزاج وکلچر، تمدن وتہذیب ہے۔ جس کا قوام یونانی ورومن ثقافتی ورثہ اور علم لالصنام اور باربیرین اور قرون مظلمہ کی تہذیبوں اور بگڑی ہوئی عیسائیت سے بنا ہے۔ عیسائیت کو بندہ ''سالوسیت'' کہا کرتا ہے، کہ حقیقتاً بیچارہ یورپ خدائی دین عیسائیت سے کبھی بہرہ مند ہوا ہی نہیں۔

یورپ کو نام نہاد عیسائیت سینٹ پال کے ذریعے پہنچی، جو اصلاً ''سال'' یا سالوس نامی یہودی تھا۔ جس نے عیسائیت کو بگاڑنے کے لیے عیسائیت کا جامہ اوڑھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کو مسخ کرکے رکھ دیا۔ کہنے کا مدعا یہ ہے کہ یورپ کا تمدن اپنے اندر یونانی، رومن، باربیرین اور مسخ شدہ عیسائیت کے اجزاء کو لیے ہوئے ہے۔ بے حیائی اور عریانی یونان وروما کی میراث ہے اور وحشت وظلم باربیرین اور ازمنہ وسطیٰ کا نتیجہ ہے۔

عمومی تجرد ناممکن العمل ہے:

موجودہ عیسائیت میں تجرد کمال کی بات ہے۔ جرمنی میں مجھ سے کسی شخص نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی کے متعلق سوال کیا اور ضمناً تجرّد کے عیسائی نظریہ کی فوقیت کو ثابت کرنا چاہا۔ بندہ نے عرض کیا کہ اگر تمام دنیا عیسائی ہوجائے اور ساٹھ ستر سال تک مجرد رہے اور تجرد کے تمام قوانین کی مکمل پابندی کرے، اور ''گرجوں کے تہہ خانوں'' اور کلبوں کی زندگی کے پاس نہ پھٹکے تو یقیناً ستر سال کے بعد نسل انسانی عیسائیت کے اس ''مسیحانہ اقدام'' ونظریہ کی وجہ سے ختم ہوکر رہ جائے گی۔ انسانیت کے لیے تجرد کی زندگی نہ کمال وخوبی ہے اور نہ حقیقتاً ممکن العمل ہے۔ اگر نکاح کے جذبات نہیں ہوں گے، نکاح نہیں ہوگا۔ فرائض ازدواجی کی ادئیگی نہیں ہوگی اور نسل انسانی ختم ہوجائے گی۔

اسلامی نکاح کے قوانین عین مطابق فطرت ہیں:

حکمت الٰہی نے نسل انسانی کی بقاء کے لیے جذبات رکھے، نکاح کو جائز قرار دیا۔ اور مرد وعورت کے فطرتی اور طبعی جنسی رجحان کو دیکھتے ہوئے نکاح کے دائرہ کو مردوں کے لیے چار تک کی وسعت دے دی۔ تا کہ خواہشات کا ناجائز استعمال نہ ہو سکے۔ عورت فطرتاً ایک سے زیادہ خاوندوں کے نکاح میں نہیں آسکتی کیونکہ میراث ونسل وغیرہ کے قانون اور طبعی رقابت وغیرہ کے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ جو خطرناک نتائج تک منتہی ہو سکتے ہیں۔

حدود الٰہی کی پابندی نہ ہو تو عائلی زندگی برباد ہو جائے گی:

جو اقوام عائلی معاملات میں حدود الٰہی کی پابندی نہیں کرتیں وہ انسانی فطرت ونفسیات سے کماحقہٗ واقف نہ ہونے کی بناء پر افراط وتفریط میں مبتلا ہو جاتی ہیں، جیسا کہ آج کل یورپ کا حال ہے۔

فسق نواز مغرب:

ہم بغیر کسی خوفِ تردید کے ببانگ دہل یہ کہتے ہیں کہ مغرب کا معاشرہ فسق نواز ہے، عفت نواز نہیں۔ جن لوگوں نے مغرب کی نفسیات جنس کی وہ کتابیں پڑھی ہیں جن میں جنسی تجارب کی تاریخ بیان کی گئی ہے وہ میری اس بات کی سو فیصد تصدیق کریں گے کہ آج مغرب جنسی بے راہ روی کی اس جہنم میں گر چکا ہے، جس کا تصوّر بھی اقوام ماقبل یا بے چارہ مشرق نہیں کر سکتا اور جس کا عفت وپاکیزگی کی طرف لوٹنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

اس درازنفسی کا مقصد یہ ہے کہ مغرب کا ''محرم دل ودماغ'' اپنی فسق نوازی، بے حیائی اور فواحش پروری کی بنا پر اسلام کے پاکیزہ، عفت مآب، حیا پرور اور پاک دامن معاشرہ کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

یورپ اسلام کے نظام عفت کو نہیں سمجھ سکتا:

جس معاشرہ کی لغت میں ''حیا'' نامی لفظ کا عملاً وجود ہی نہ ہو، ''عفت'' کا تلاش پر بھی نشان نہ ملے اور کنواری مریم (virgin mary) کی نام نہاد نام لیوائیں اپنی بکارت کے شیشوں کو بلوغ سے پہلے ہی جنسی تجارب میں توڑ چکی ہوں۔ اور "Jeasus Christ" (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کے تجرد کا کلمہ پڑھنے والے تجرد کے دائروں کو بچپن ہی میں پھاند چکے ہوں، وہ کیا جانیں کہ اسلام کا نظام عفت کیا ہے اور ازدواجی

بندھنوں کے بغیر کسی کے دامن عفت کو تار تار کرنا کتنا گھناؤنا اور وحشیانہ فعل ہے۔

زنا عقلاً و اخلاقاً و قانوناً گھناؤنا جرم ہے:

غور کیجئے کہ اگر کوئی شخص شادی اور ازدواجی بندھن کے قانونی دائرہ میں نہیں رہتا اور اللہ تعالیٰ کے حدود کو پھاند کر کسی غیر عورت کے ساتھ متعلق ہو جاتا ہے، فرض کیجئے حمل ٹھہر جاتا ہے۔ کیا اس کا یہ فعل قانوناً، عقلاً، اخلاقاً درست ہوگا؟ ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک شخص کی زمین ہے جس کا کوئی دوسرا شخص قانوناً مالک نہیں اور نہ کسی اخلاقی ضابطہ سے اس کا اس زمین میں کوئی حق ہے۔ اگر یہ شخص پہلے شخص کی زمین میں ہل چلاتا ہے، بیج ڈالتا ہے اور فصل پیدا ہو جاتی ہے۔ تو کیا اس فصل پر اس شخص کا جو دوسرے کی زمین استعمال کرتا ہے قانوناً کوئی حق ہے؟ یہ فصل اِس کی نہیں ہوگی، اِس نے تو اپنے بیج ہی کو ضائع کر دیا، فصل زمین والے کی ہوگی اور اِسے بیج کے ضائع کرنے کی سزا دی جائے گی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الولدُ للفراش و للعاهر الحجر (بخاری)

ترجمہ: بیٹا اس کا ہوگا جس کی منکوحہ کے گھر پیدا ہوگا۔ اور زانی کو اس جرم پر سنگسار کیا جائے گا (اگر وہ محصن ''شادی شدہ'' ہو)۔

زنا تخم انسانی کا ضیاع ہے:

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب انسان اپنا بیج بے محل اور غیر مملوکہ اور دوسرے کی زمین میں ڈالتا ہے تو وہ اپنے بیج کو ضائع کرتا ہے۔ ممکن ہے یہ بیج اگر اپنے محل اور اپنی کھیتی میں ڈالا جاتا تو اس سے محمد علی جناح یا اقبال یا محمد علی جوہرؒ جیسے ممتاز رجال پیدا ہو جاتے۔ لیکن اس ظالم وحشی نے اپنے نفسانی جذبات میں ڈوب کر اپنے جسم کو ایک آنی و فانی لذت دنیئہ (گھٹیا لذت) کے لیے ایسے وقیع مادہ کو ضائع کیا۔ گویا وہ قتل خفی کا مرتکب ہوا۔ اس لیے علماء اور بعض مفسرین نے استمناء بالید (masturbation) اور دیگر اس قسم کے فواحش جس سے انسان کا مادہ منویہ ضائع ہوتا ہے ناجائز اور ''الموٴدۃ الخفیہ'' قرار دیا ہے۔ یعنی اپنی اولاد کو نامعلوم اور پوشیدہ طریقہ سے زندہ درگور کر دینا۔ جاہلی عرب اپنی اولاد کو پیدائش کے بعد زندہ گاڑھ دیتے تھے۔ ہم پیدائش سے نو مہینے پہلے گاڑھ دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے مجرموں کو جو انسانیت کے بیج کو ضائع کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں قتل خفی کا مرتکب گردانتا ہے۔ اور بڑی مصیبت یہ ہے کہ یہ کریہہ عادت اگر ایک دفعہ پڑ جائے تو تادم آخر

بمشکل چھوٹتی ہے۔

بدکار معاشرہ کا ناسور:

مزید برآں اس کا مرتکب معاشرہ کا ایسا ناسور ہے جو پورے معاشرہ کو متاثر کرتا ہے۔ اور وہ جو بچہ پیدا کرتا ہے اس پر میراث اور نسب کے قوانین کا کماحقہٗ اجراء نہیں ہوسکتا۔ پوری سوسائٹی فسق وفجور کی ہواؤں سے مسموم ہو جاتی ہے۔ اس لیے قرآن نے فواحش کے شیوع پر دردناک عذاب کی تہدید فرمائی ہے۔

بدکاری اور بیماریاں یا عذاب حاضر:

زنا اور حرام کاری سے جو گندگی اور خطرناک ومہلک بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، ان کے اثرات نسلاً بعد نسل متعدی اور سوسائٹی میں دور دور تک پھیلتے ہیں۔ آپ اگر یورپ اور امریکہ کی جنسی بیماریوں کے اعداد وشمار اور ان کے گیراؤ اور وسعت کو ان کی اپنی اور اقوام متحدہ کی مرتب کردہ رپورٹوں اور جائزوں میں پڑھیں تو آپ کو قرآنی تہدید (warning) کا یقین ہو جائے گا۔ کہ مغرب کا اکثر طبقہ ان گھناؤنی بیماریوں (آتشک syphlis، سوزاک gonnoria، ایڈز aids) کے ذریعے کیسے عذاب الیم میں مبتلا ہو چکا ہے۔ ان بیماریوں کے تصور سے بھی دل لرز اٹھتا ہے۔ یہ عذاب حاضر ہے جو ان اقوام پر مسلط کر دیا گیا، جنھوں نے حدود الٰہی کی ناقدری کی اور اس کا تمسخر اڑایا ؎

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

بدکاری کی سزا نہ دینا معاشرہ کو برباد کرنا ہے:

اگر آپ خدائی سزا کو مجرم پر لاگو کر کے اس کے ناپاک وجود سے انسانیت کو نجات نہیں بخشیں گے تو یہ آگ جس کا چھپا ہوا مادہ ہر نفس میں موجود ہے، جب پھیلے گی تو تمام معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

کوڑے کی سزا:

اس لیے اسلام اس شخص کو جسے اپنی خواہش کے پورا کرنے کے مواقع کسی عذر صحیح کی وجہ سے حاصل نہیں، سو کوڑے کی سزا دیتا ہے۔ ''خبیث جسم'' جس نے اپنی خباثت نفس کی تسکین کے لیے معاشرہ کے ''عفیف جسم'' کو ناپاک کیا اپنی حرکت پر شرمندہ ہو کر آئندہ کے لیے اس سے بچ جائے۔ یا یہ ''نا مسعود جسم''

انسانیت کو آئندہ گندگیوں میں ملوث کرنے کے لیے باقی نہ رہے۔

رجم کی سزا:

اگر ایک شخص کی بیوی موجود ہے، وہ اپنی جنسی لذت و بھوک کی تسکین جائز ذرائع سے کرسکتا ہے۔ مگر وہ اپنی خواہش کو اپنے محل سے پورا نہیں کرتا اور اپنے ذوق جنسی کی تسکین بے محل کرتا ہے، جنسی چور بازاری کا مرتکب ہوتا ہے۔ خدا ایسے ظالم کو معاشرہ کے لیے قاتل سے بھی زیادہ خطرناک سمجھتا ہے اور وہ اسے دردناک اور عبرتناک سزا دیتا ہے۔ یہ ایسا حکم ہے کہ احادیث متواترہ سے ثابت ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس پر عمل ہوا، خلفائے راشدین کے زمانہ میں اس کا اجراء ہوتا رہا۔ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ نے تو یہاں تک فرما دیا:

رجم النّبی صلی اللہُ علیہ وسلم و رجم ابو بکر و رجمت و لو لا انی اکراہ ان ازید فی کتاب اللہ لکتبتہُ فی المصحف فانی قد خشیت ان یجی اقوام لا یجدون فی کتا فیکفرون بہ (جمع الفوائد بحوالہ ترمذی فقال حسن صحیح ص ۲۷۴ ج ۱)

ترجمہ: حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کی سزا دی اور ابو بکرؓ نے رجم کیا اور میں نے رجم کیا۔ اور اگر میں اس بات کو ناپسند نہ کرتا کہ کتاب اللہ میں زیادتی کردوں تو اس حکم (کے موثق اور یقینی ہونے کی وجہ سے) میں اسے ضرور مصحف میں لکھ لیتا۔ اور میں ڈرتا ہوں کہ ایسے لوگ آئیں گے کہ اسے کتاب اللہ میں صریحاً نہیں پائیں گے تو اس حکم کا انکار کردیں گے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہُ نے قرآن کی ایک آیت سے استدلال کرتے ہوئے کہا

من کفر بالرجم فقد کفر بالقرآن

ترجمہ: جس نے رجم کا انکار کیا اس نے قرآن کا انکار کیا

غرض یہ حکم ایسے شواہد قویّہ اور نصوص ثابتہ سے ثابت ہے کہ اسلامی قانون پر نگاہ رکھنے والے اس کے حق ہونے پر شک نہیں کرسکتے۔

شہادت میں دشواری:

ایسی عبرتناک سزا کے نفاذ و اجراء کے لیے اسلام کے عدل و انصاف نے اس فعل خاص کے

ارتکاب کے لیے شہادت بھی اتنی قوی اور مضبوط رکھی ہے، جس کا تحقق وثبوت بمشکل ہوتا ہے۔ اولاً اسلامی اصول شہادت اور گواہوں کی صفائی معیار سے جو لوگ آگاہ ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اسلام کا قانون شہادت جملہ اقوام کے قانون شہادت سے کس قدر ارفع واعلیٰ ہے۔ اب زنا کے لیے دو گواہوں کی شہادت کافی نہیں قرار دی گئی۔ بلکہ خلاف معمول چار ثقہ گواہوں کی عینی شہادت لازمی قرار دی گئی۔

زنا کی شہادت کی نوعیت:

اور ادائے شہادت کی نوعیت یہ ہے کہ ''میں نے اس فعل خاص کا ارتکاب کرتے ہوئے ان مجرموں کو اس صورت سے دیکھا ہے۔'' آپ کتب فقہ میں تصریحات پڑھ سکتے ہیں، اس مجمع میں حیا وضاحت سے مانع ہے۔ اب سوچئے کہ ''فعل خاص'' کا ارتکاب ایک محدود وقت کے لیے ہوگا۔ نری مباشرت، قربت وغیرہ کی گواہی کافی نہیں بلکہ فعل مخصوص کی ''ہیئت مخصوصہ'' کی چشم دید گواہی کے چار اشخاص کی ضرورت ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مجامع میں تو یہ فعل کوئی ماسوائے یورپ کے ننگے (nude) کلبوں کے کیا نہیں کرتا۔ اور نہ مسلم معاشرے میں اس کریہہ حیوانیت کی کوئی صورت ممکن ہے۔ اب آپ ہی بتایئے کہ ''پوشیدگی اور تنہائی'' کے اس فعل قبیح کو اگر ایک یا دو شخصوں نے دیکھ بھی لیا تو تیسرا اور چوتھا گواہ کہاں سے آئے گا؟ اور اگر وہ گواہ لانے کے لیے جائیں گے تو یہاں کام ہو چکا ہوگا۔ اس لیے اگر آپ اسلامی سزا ''حدود'' کی تاریخ پر نگاہ ڈالیے تو آپ کو شاذ ہی ایسے واقعات ملیں گے، جہاں شہادت کی بناء پر یہ سزا دی گئی ہو۔ مزید برآں اگر گواہ جھوٹی گواہی (جسے اسلامی قانونی اصطلاح میں بہتان کہتے ہیں) کا مرتکب ہوگا تو اسے اسلامی تعزیرات کی زنا وقتل کے بعد کی سزاؤں میں سخت ترین سزا ''اسی کوڑے'' دی جائے گی۔ اس وجہ سے کوئی شخص بہتان تراشی اور جھوٹی گواہی کا مرتکب ہی نہ ہو سکے گا۔

ضمیر کی زندگی:

اسلام نے ضمیر انسانی کو اتنا بیدار کر دیا تھا کہ مجرم اگر کبھی تقاضائے نفس سے مغلوب ہو کر اس برے فعل کا ارتکاب کر بیٹھا، تو جب تک اس نے خود کو سزا دلوا کر پاک نہ کروالیا، اسے چین نہ آیا۔ اور یہ اسلامی قانون سزا کا وہ روشن باب ہے جسے دنیا کی کوئی قوم وملک پیش نہیں کر سکتا۔ غامد قبیلہ کی ایک عورت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتی ہے اور کہتی ہے کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے یہ فعل بد سرزد ہو گیا۔ مجھے

پاک کر دیجئے۔ حضور پاکؐ اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتے ہیں۔ پھر دوسری طرف سے آ کر وہی بات کہتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پھر چہرہ اقدس دوسری طرف کر لیتے ہیں۔ تیسری طرف سے آ کر پھر یہی کہتی ہے، حضورؐ اعراض برتتے ہیں۔ چوتھی طرف پھر آ کر وہی الفاظ دہراتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوچھتے ہیں، یہ عورت پاگل تو نہیں؟ وہ کہتی ہے یارسول اللہ میں پاگل نہیں، مجھ سے فعل سرزد ہوا اور حمل ٹھہر گیا ہے۔ حضورؐ اجازت دیتے ہیں کہ وضع حمل کے بعد آنا۔ وہ بچے کی پیدائش کے بعد آتی ہے، ضمیر کی خلش اور دل کی بے قراری پھر وہی کہلواتی ہے کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے پاک کر دیجئے۔ رحمۃ اللعالمینؐ فرماتے ہیں بچے کا دودھ چھوٹ جائے تو پھر آنا۔ دو سال بعد پھر آتی ہے۔ بچے کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا دے کر لاتی ہے کہ ثابت ہو جائے کہ اسے میرے دودھ کی ضرورت نہیں ہے اور کہتی ہے کہ یارسول اللہ مجھے آرام نہیں آتا، مجھے پاک کر دیجئے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم حدود الٰہی کی پاسداری کرتے ہوئے سنگساری کا حکم دیتے ہین۔ سنگسار کرتے ہوئے خون کا چھینٹا حضرت خالدؓ پر آ پڑتا ہے اور وہ اسے کچھ برا کہہ بیٹھتے ہیں۔ رحمت مجسم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، اسے برا نہ کہو، اس نے وہ توبہ کی ہے کہ اگر محصول چنگی (کی ناجائز و ظلم) سے وصولی کرنے والا بھی وہ توبہ کرتا تو بخشا جاتا۔ اور بعض روایات میں آتا ہے کہ اگر تمام مدینہ پر اس کی توبہ تقسیم کر دی جائے تو سارا مدینہ بخش دیا جاتا۔ اسی طرح کا ایک واقعہ ''ماعز'' نامی ایک صحابی کا بھی دور نبوت میں پیش آیا۔ (رضی اللہ عنہ)

زندہ ضمیری اور اجرائے حدود:۔

اس زندہ ضمیری کا ثبوت ہمیں دنیا کی تاریخ کے اوراق میں اسلام کے سوا کہاں مل سکتا ہے۔ بات یہ تھی کہ اسلام کے نظریہ اخلاق نے انھیں عفت و پاکیزگی کا وہ بلند تصور دیا تھا، جس کے ادراک سے بھی ''نکویاں فرنگی'' قاصر ہے۔ آخرت کی سزا کا جو یقین تھا، وہ دنیا میں انھیں اپنے کو پاک کروا دینے پر مجبور کر دیتا تھا۔

اخلاقی انارکی سیاسی انارکی سے زیادہ کریہہ ہے:

اس جواز کے بارے میں ایک اور نکتہ نظر سے سوچئے۔ اگر ایک شخص اللہ تعالیٰ کے نام کی بلندی کے لیے میدان جنگ میں اپنی گردن کٹوا دیتا ہے، تو شہید قوم وملت کہلایا جاتا ہے۔ اور جو قوم کے نظام اخلاق کی بقا

کے لیے قتل کیا جاتا ہے اس پر اس قتل کا اجراء کس بناء پر قبیح قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص حکومت سے غداری کرتا ہے اور مملکت کے سیاسی استحکام کو تاراج کرتا ہے تو اسے مجرم قرار دے کر ہر حکومت قتل کر دیتی ہے، اور اسے جائز سمجھتی ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ دو اشخاص ملک کے شیرازہ اخلاق کو درہم برہم کرتے ہیں اور اخلاقی انارکی کے مرتکب ہو کر ایسے جرم کرتے ہیں جس سے ملکی اخلاقی استحکام کی جڑیں، جن پر سیاسی بقا کا انحصار ہے کھوکھلی ہو جاتی ہیں، کیا وہ مجرم نہیں؟ اگر مملکت سے غداری کرنے والا قتل کی سزا کا مستحق ہے تو مملکت جن اعلیٰ اقدار و اخلاق کی بقاء کے لیے قائم کی گئی ہے، اسے مٹانے والا بدرجہ اولیٰ اس کا مستحق ہے۔ جس قوم میں فواحش آتے ہیں اس کا اخلاق و کردار ختم ہو جاتا ہے۔ اور جو قوم اخلاق و کردار سے عاری ہو جاتی ہے وہ جہانداری کے خصائص سے محروم ہو جاتی ہے۔

اخلاقی یعنی زنا کا مجرم مملکت کے استحکام کا دشمن ہے:

اس لیے ایسے مجرم جو کہ مملکت کی اخلاقی بنیادوں پر کلہاڑی چلاتے ہیں وہ ملکی و ملی استحکام کے دشمن ہیں۔ اور ان کی سزا یہی ہے کہ ان کے وجود نامسعود سے زمین کو پاک کر دیا جائے۔

بے حیائی کی زندگی کے نتائج:

جو قوم حیا کی چادر اتار پھینکتی ہے، فواحش میں مبتلا ہو جاتی ہے اور عیاشی و تنعم کو اپنا وطیرہ بنا لیتی ہے ، وہ انسانی جواہر و کمالات سے محروم ہو کر ذلت و رسوائی سے آخر ہمکنار ہو جاتی ہے۔ مغرب اسلام کے نظام اخلاق سے ہمیشہ مرعوب رہا، اور اس کی کوشش رہی کہ کسی طرح اس میں رخنہ پیدا کر کے اسلام کے اس مضبوط قلعہ کو مسمار کر دے۔ امیر المؤمنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب ہماری فتوحات کا سیل رواں ایران اور روم کی حکومتوں اور ان کے تخت و تاج کو تنکوں کی طرح بہائے لیے جا رہا تھا۔ رومیوں نے جاننا چاہا کہ وہ کونسی طاقت ہے جو ان بے نوا صحرا نشینوں کو فتح و کامرانی سے ہر وقت ہمکنار کیے ہوئے ہے۔ جاسوسوں نے مطلع کیا کہ ان کی فتح کا سبب سامان حرب و ضرب نہیں بلکہ ان کی صفات، اخلاق اور اعمال کی بلندی، دنیا سے بے رغبتی اور آخرت سے محبت ہے۔ ہرقل کو کہا گیا کہ عمرؓ کے سپاہی رات کے راہب (مصلیٰ کے سوار) اور دن میں میدان جنگ کے شاہسوار ہیں۔ رومیوں کو جتنی شراب سے محبت ہے، اس سے زیادہ وہ موت سے محبت کرتے ہیں۔ رومیوں کو جتنی عورتیں محبوب ہیں وہ اس سے زیادہ جنت کے شائق ہیں۔ ان کی نگاہ نامحرم پر

نہیں پڑتی۔ وہ سونے اور جواہر کو مٹی کے ڈھیلوں کے برابر نہیں سمجھتے۔ ہرقل نے جب یہ سنا تو آہِ سرد بھر کر کہا کہ اے عمر تو میرا کلیجہ کھا گیا، اگر تیرے ایسے سپاہی ہیں تو ''یسوع مسیح'' کی قسم جو زمین میرے تخت کے نیچے ہے وہ بھی تو لے کر رہے گا۔ ایسے سپاہیوں سے لڑنا خدا سے لڑنا ہے۔

مسلمانوں کی عفت مآبی:

بہر حال اس رپوٹ کے بعد مشورہ ہوا، اور جو قوم ہمیشہ سے حیا سے عاری ہے اس نے طے کیا کہ اگر مسلمانوں کی فتوحات کو روکنا ہے تو ان کے اخلاق بگاڑنے کے لیے اپنی ناموس کو داؤ پر لگا دو۔ اور جب عمرؓ کے سپاہی بیت المقدس میں داخل ہونے لگیں تو روم کے حسن کو کمال زیبائش وعریانی سے بیت المقدس کے بازاروں، کھڑکیوں، دکانوں اور چھتوں کی منڈیروں پر زلیخائی دعوت اور ناز وادا کے ساتھ کھڑا کر دو اور طالب یا بے طلب فوج کے جوانوں پر اپنی ''متاع'' قربان کرنے کے لیے آمادہ کر دو۔ اگر ایک دفعہ یہ سپاہی ملوث ہو گئے تو خدا کی مدد سے محروم ہو جائیں گے۔ پھر مقابلہ آسان ہے۔ سپہ سالار امین الامت ابو عبیدہ بن جراحؓ نے پہلی نگاہ میں دشمن کی چال کو بھانپ لیا۔ اور حکم دیا:

قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْ فُرُوْجَهُمْ (النور۔۴)

ترجمہ: آپ مسلمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔

گویا فوجی اصطلاح میں وقت کا حکم (order of the day) یا (standing order) تھا کہ کسی فوجی کی آنکھ نہ اٹھے۔ اور اپنی عفت کی حفاظت کی جائے۔ یہ حکم ان فوجیوں کو تھا جو خدا کا لشکر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سپاہی تھے۔ اطاعت امیر کا یہ نظارہ آسمان نے کب دیکھا ہوگا کہ جب شہر سے واپس لوٹتے ہیں تو ایک دوسرے سے یہ پوچھتے ہیں کہ شہر کی عمارتیں کیسی ہیں؟ کسی عورت پر نگاہ تک نہیں پڑی، اگلی بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یورپ اس وقت اپنی چال میں ناکام رہا۔ آج وہ اسلام کے نظام اخلاق کی عمارت کو منہدم کرنے کے درپے ہے۔

قانون ''اخلاق'' کی حفاظت کا آہنی قلعہ ہے:

ہمارا قانون ہمارے اخلاق کی حفاظت کا آہنی قلعہ ہے۔ یورپ چاہتا ہے کہ شکوک واشکالات،

اعتراضات وشبہات کی یورش سے اسے تباہ کردے۔افسوس اس بات کا ہے کہ ہم اپنے قانون کی بنیادوں اور مقاصد کونہیں سمجھتے۔اور دشمن کے ہمنوا بن کرخود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارتے ہیں۔

یورپ وحشی ہے یا اسلام:

کیا وہ مغرب جو ہیروشیما، ناگاساکی، ویت نام، ایشیا اور افریقہ کے مختلف ممالک میں وحشت و بربریت کے شرمناک وہولناک مناظر قائم کر چکا ہے۔جس کا دیو استبداد و استعمار کسی اخلاقی ضابطے اور انسانی شریفانہ حدود کا پابند نہیں۔جو اپنی سیاسی اغراض کے لیے عورت و بچے، مظلوم وغیر مظلوم ہر طبقے اور ہر گروہ کے ضعیف و کمزور کی رعایت کیے بغیر آگ اور خون کی ہولی کھیلتا رہتا ہے، وحشی نہیں ہے؟ اور اسلام جو انسانیت کی اعلیٰ اقدار کی حفاظت کے لیے اور نظام اخلاق کی بقاء کے لیے کسی معاشرہ میں انارکی پھلانے، مال ومتاع لوٹنے والے یا عصمت وعفت کے شیشوں کو چکنا چور کرنے والے ظالم و وحشی کو عبرتناک سزادے، تاکہ آئندہ وہ بھی اس فعل قبیح سے بچ جائے اور معاشرہ بھی اس مہلک ناسور اور اس متعدی خطرناک مرض سے نجات پا جائے، تو وہ مجرم ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

اللہ کا قانون وحشت نہیں عدل ہے:

اللہ تعالیٰ کا قانون وحشت نہیں انصاف ہے۔ظلم نہیں عدل ہے، بہیمیت نہیں رحم ہے۔رومیؒ نے کہا ہے۔

آن کسے را کیش چنیں شاہے کشد
سوئے بخت و بہتریں جائے کشید

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد
آنکہ درو ہمت نہ آید آن دہد

ترجمہ: جس شخص کو ایسا بادشاہ قتل کرے (وہ درحقیقت اس کو قتل نہیں کرتا بلکہ نجات ابدی) کے بخت اور بلند ترین درجہ کی طرف اس کو لے جاتا ہے۔وہ آدھی جان تو لے لیتا ہے لیکن سو جانیں دے بھی دیتا ہے۔وہ ایسا کچھ

دے گا کہ وہم وخیال مین بھی نہ آئے۔

آخر میں میں اپنے معزز سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسلامی قانون کی حمایت اور غیروں کے ''جاہلی قانون'' کے بارے میں قرآن کی ایک بات عرض کر کے اپنی بات ختم کرتا ہوں اور فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (المائدہ۔۵)

یہ لوگ پھر جاہلیت کا فیصلہ (حکم وقانون) چاہتے ہیں۔اور فیصلہ کرنے میں اللہ سے کون اچھا ہو گا یقین (وایمان) رکھنے والوں کے نزدیک۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین

****

رومیؒ اور تصوّف

از پروفیسر مولانا محمد اشرف شعبہء عربی پشاور یونیورسٹی

عمومی طور پر مسلمانوں میں تصوّف کے نام سے جو طریقے رائج ہیں، ان کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) شرعی طریقہ تصوف (۲) فلسفیانہ طریقہ تصوف (۳) مبتدعیانہ سلوک

اصل اسلامی سلوک وہی ہے جس کو ہم شرعی سلوک کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اور جملہ اساطین سلوک وہی بزرگ ہیں جو شرعی تصوّف کے مقتداء ہیں۔ رومی چونکہ اسلامی تصوّف کے ایک بہت بڑے امام ہیں، اس کے حقائق و معارف کے رازدان اور رموز و اسرار کے کھولنے والے ہیں، اس لیے ان کا سلوک اسلامی تصوّف میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ رومیؒ اپنی ذات میں نہ صرف نرے صوفی ہی تھے بلکہ وہ ایک بہت بڑے عالم، فقیہ، مفتی، متکلم اور فلسفی بھی تھے۔ اس لیے ان کا کلام اپنے اندر ان تمام علوم کو اس طرح سموئے ہوئے ہے کہ رومی کی مثنوی حقائق و معارف کا گنجینہ ہے۔ تصوف علمی ہو یا عملی، فن کے لحاظ سے ایک ناپیدا کنار سمندر ہے۔ اس لیے اس مختصر وقت میں اس کے سب گوشوں پر رومی جیسے شناور کی نکتہ سنجی، راہنمائی، حقیقت کشائی طریقت کے مختلف احوال و مقامات پر بحث نہیں کر سکتے۔ صرف چند بنیادی چیزوں کو لیا جاتا ہے جو کہ ہمارے نزدیک رومی کے صوفیانہ افکار کا مغز ہیں، بلکہ اسلامی تصوف کا لب لباب ہیں۔

سلوک کا انتہائی مقصد ان عقائد و حقائق کو جنھیں شریعت لے کر آئی ہے نظری سے حالی، غیب سے شہود اور قال سے حال بنا دینا ہے۔ اسی طرح وہ تعلیمات جو کہ شریعت کا مقصود ہیں، سلوک صرف اس کے ظاہری رسوم اور خط و خال ہی کی زیبائش نہیں دیکھنا چاہتا بلکہ اس کے اندر جو حقیقت و اخلاص، للٰہیت اور جان ہے اسے پیدا کرنا چاہتا ہے۔ عقائد میں مقصد المقاصد اور سب سے اہم چیز اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذاتِ عالی ہے، جس کے کنہ اور ادراک سے عقل اور شعور عاجز رہ جاتے ہیں۔ سلوک میں خدا کی صفات، خدا کا تعلق، اس کی معرفت اور اس کے ساتھ ایسا ہمہ وقتی اور ہمہ جہتی تعلق قائم کرایا جاتا ہے کہ سالک اپنے آپ کو عرفان الٰہی کے لامتناہی مقامات میں شناوری کرتے ہوئے اپنے کو خدا ہی سے پاتا ہے، خدا ہی سے دیکھتا ہے اور خدا ہی سے جانتا ہے۔ خدا کی ذات کی معرفت انسانوں کی عقول سے باہر ہے۔ عارف کا قلب صفات الٰہیہ کی تجلیات اور انعکاس کا مرکز ہوتا ہے اور اس سلسلہ میں سالک کی ایسی کوشش ہوتی ہے کہ کوئی ایسا لحظہ اس پر نہ گذرے کہ خدا

سے غافل ہو۔ رومیؒ نے خود کہا ہے ؎

بر دل سالك ہزاراں غم بود　　　　گر زباغ دل خلالے کم بود

ترجمہ: سالک کے دل میں ہزار غم پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر دل کے باغ سے ایک تنکا بھی کم ہو جائے۔

ولایت خاصہ جسے قرآن کی اصطلاح میں " اللّٰه ولی المتقین " کے لفظوں سے ادا کیا گیا ہے۔ اور جسے عامۃ النّاس اولیاء اللہ کے نام سے یاد کرتے ہیں، ان کے ایک بہت بڑے فرد فرید، سرخیل اولیاء مولانا جلال الدّین رومیؒ اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جسے ولایت موہبت اور عطیہ کے طور پر عطا کی گئی۔ ان کی ولایت قرآن کی اصطلاح میں اجتبائی ہے، نہ کہ اکتسابی۔ گو وسیع معنی میں ہر ولایت عطاء ہوتی ہے لیکن قرآن نے اس کی دو بڑی قسمیں بیان فرمائی ہیں:

اَللّٰہُ یُجۡتَبِیۡۤ اِلَیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَھۡدِیۡۤ اِلَیۡہِ مَنۡ یُّنِیۡبُ (شوریٰ۔۱۳)

ترجمہ: اللہ چن لیتے ہیں جس کو چاہتے ہیں (اپنی ولایت خاصہ کے لیے) اور ھدایت (عامہ ہو یا خاصہ، بقدر مجاہدات اور ظرف) ان لوگوں کو عطاء کرتے ہیں جو اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

گویا ولایت کی دو بڑی قسمیں قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوئیں، ایک اجتبائی اور دوسری انابت والی اکتسابی۔ اجتبائی ولایت میں اساطین اولیاء میں سے چند نام فریدالدّین عطارؒ، حضرت یحییٰ منیریؒ، اور ایک حد تک امام غزالیؒ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ یہ تمام حضرات پہلے چنے گئے اور پھر انھوں نے سلوک کی وادیاں طے کیں۔ رومیؒ علم و دانش، فتویٰ، کلام، جملہ علوم عقلیہ اور نقلیہ کے امام تھے، خانوادہ تصوّف کا تھا، لیکن علوم ظاہری نے باطنی علوم اور استعدادوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا۔ یکا یک رحمت حق کو جوش آیا اور رومی کی اندر کی استعدادوں کی جلاء کے لیے اور ان کے اندر جو سوتے تھے ان کے اجرا کے لیے ایک شخص کو بھیجا گیا۔ جو کہ تاریخ میں شمس تبریزؒ کے نام سے مشہور ہیں۔ شمس نے رومی کے لیے وہی کام کیا جو بقول غالب ؎

پرتو خود سے ہے شبنم کو فناء کی تعلیم
ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

شمس آئے اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت باطنہ کا مظہر اور آلہ بن کر رومی کے قلب پر اس ابتدائی نسبت کا القاء کر دیا، جسے نسبت اجتبائیہ فراقیہ اگر کہا جائے تو غالباً غلط نہ ہوگا۔ اور اس نسبت کا القاء، خدا کی طرف سے

اس طور پر تھا کہ مولانا خود اس کا ایک جگہ اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

عشق اول در دل معشوق پیدا می شود

گر نہ سوزد شمع کے پروانہ شیدا می شود

ترجمہ: عشق پہلے معشوق کے دل میں ظاہر ہونے لگتا ہے، اگر شمع نہ جلے تو پروانہ کب اور کیونکر اس کے عشق میں مبتلا ہو سکتا ہے؟

یہاں معشوق کے عشق کا جو تذکرہ ہے، یہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے۔

خود خدا ست اندر تلاش آدمی

باخبر شو از مقام آدمی

ترجمہ: خدا کی ذات خود انسان کی تلاش میں ہے۔ انسان کے اس اعلیٰ مقام و مرتبے سے آگاہی حاصل کرو۔

شمس نے رومی کو پایا، اور رومی نے شمس میں تجلیات ربّانیہ کے ان مظاہر کو دیکھا جس نے ظواہر کے تمام علوم کو عشق الٰہی کی آگ میں جلا کر یا منور کر کے رکھ دیا اور وہ پکار اٹھے۔

صد کتاب وصد ورق درنار کن

قلب خود را جانب دلدار کن

ترجمہ: (علوم ظاہر کی) سینکڑوں کتابوں کو آگ میں جلا ڈالو۔ (باطنی پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے) اپنے دل کو دلدار کی طرف متوجہ کرو۔

دوسرے مقام پر فرمایا۔

قلب را تاباں کن از انوار ما

زانکہ ز آسیب ذنب شد دل سیاہ

ترجمہ: (اپنے) دل کو ہمارے انوار سے منور کر دو، کیونکہ گناہوں کے آسیب سے دل سیاہ ہو گیا ہے۔

شمس کی پہلی آمد رومی میں اشتیاق شیخ، طلب شیخ اور فراق شیخ کی آگ لگانے کے لیے تھی۔ اور یہ

آگ اس قدر شدید تھی، جس نے رومی کی انا کو ایک قدم میں شیخ کی ذات میں فنا کر دیا۔ اب رومی اپنے کو نہیں پاتا، ہر آن اپنے میں شمس کی جلوہ افروزیوں کو دیکھتا ہے، یہاں تک کہ دیوان شمس تبریز جیسا کیم وشیم دیوان رومی کا ہے جس میں بے تابانہ انداز میں مقطع میں شمس کا نام آتا ہے۔ اور رومی ''لسان شمس'' کی صورت میں جلوہ افروز ہوتے ہیں۔

رومی کہتے ہیں۔

ہم چو من شو درھوائے شمس دین

آن صبا کزوی دلم گلزار شد

شمس تبریز بما راہ حقیقت نمود

ما ز فیض قدم اوست کہ ایمان داریم

ترجمہ: میری طرح شمس دیں یعنی شمس تبریزؒ کی چاہت میں گم ہو جاؤ، شمسؒ کی مثال اس بادصبا کی ہے جس سے میرا دل پھول کی طرح کھل اٹھا۔ شمس تبریزؒ نے ہمیں حقیقت کا راستہ دکھایا، انہی کی قدم بوسی کی برکت سے ہمیں ایمان (کا نور) حاصل ہو گیا۔

کہیں کہتے ہیں۔

شمس تبریزی کہ نور مطلق است

من نہ دیدم ہم چو او اندر جہاں

ترجمہ: شمس تبریزیؒ جو نور مطلق (اپنے اندر جذب کیے ہوئے) ہیں، میں نے پوری دنیا میں اس جیسی شخصیت نہیں دیکھی۔

ایک رباعی میں کیا خوب فرماتے ہیں۔

زاہد بودم ترانہ گویم کردی   سر فتنہ بزم و بادہ جویم کردی

سجادہ نشین با وقاری بودم   بازیچہ کودکان کویم کردی

ترجمہ: ا۔ میں ایک زاہد (کی طرح دنیا و مافیہا سے بے نیاز) تھا۔ آپ (کی محبت) نے مجھے ترانہ گوئی کے شغل میں مبتلا کر دیا۔ بزم نشاط اور بادہ جوئی کا عادی بنا دیا۔

۲۔ میں ایک باوقار سجادہ نشین تھا آپ (کی محبت) نے (دیوانہ بنا کر) گلی میں کھیلنے والے بچوں کا

کھلونا بنا دیا۔

سلوک کی راہ میں سب سے سخت قدم انا کی فنا ہے۔ شمس کے سوزِ عشق نے نہ صرف رومی کی انا کو فنا کر دیا بلکہ شمس کی محبت اور فراق اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئے۔ ان کا شمس کے بارے میں یہ حال تھا، بقول مجنون عامری ؎

تمثل لی لیلیٰ بکل سبیل (مجھے ہر گلی میں لیلیٰ نظر آتی ہے)

شیخ کامل جو اپنی ذات میں فنا ہوتا ہے وہ حقیقت میں نبی انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و صفات ربّانیہ کا مظہر ہوتا ہے، جس نے اپنے آپ کو شیخ محقق کے قدموں پر پامال کر دیا، وہ رزائل سے پاک اور فضائل سے آراستہ اور کمالات و انوار رسالت کی جلوہ آرائیوں سے منور ہو جاتا ہے۔ مولوی نے اس بنا پر کہا ہے ؎

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علتہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما
اے تو افلاطون و جالنیوس ما

جسم خاک از عشق بر افلاک شد
کوہ در رقص آمد و چالاک شود

عشق جان طور آمد عاشقا
طور مست و خر موسیٰ صاعقا

ترجمہ: ۱۔ اے ہمارے خوش سودا عشق! اور اے ہماری تمام بیماریوں کے معالج، تو شاد اور خوش رہے۔

۲۔ اے عشق تو ہمارے تکبر جیسے مہلک مرض کی دوا بھی ہے اور ہمارے عزت و وقار کا محافظ بھی ہے۔ تو افلاطون اور جالنیوس جیسے فلاسفہ کی طرح ہمارے الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے والا ہے۔

۳۔ عشق کی قوت سے خاکی جسم آسمانوں تک جا پہنچا (واقعہ معراج کی طرف اشارہ ہے)، پہاڑ متحرک ہو کر اس میں بھی تیزی آ گئی۔

۴۔ عشق کی برکت سے کوہ طور میں جان پڑ گئی، کوہ طور کو عشق نے مست کر دیا جسے دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو گئے۔

پھر آگے چل کر کہتے ہیں۔

قال را بگذار ومرد حال شو

پیش مرد کا ملے پاما ل شو

ترجمہ: قیل وقال یعنی زبانی بحث میں الجھنا بند کردو اور وجدانی کیفیت حاصل کرو، جس کے لیے کسی مرد کامل کے قدموں میں اپنے کو پامال کردو۔

مرد کامل حقیقت میں، جس طرح مولانا نے کنیزک کے قصے میں تمثیلی رنگ میں بیان کیا ہے۔

دید شخص کاملے پر مایه

آفتابے در میان سایه

ترجمہ: اس نے باطنی کمالات سے بھرپور ایک شخص کو دیکھا، جیسا کہ گھنے سائے میں تیز روشنی ہو۔

یہی عشق شیخ رومیؒ کو عشق حقیقی تک پہنچا دیتا ہے اور وہ قصہ کنیزک میں پکار اٹھتے ہیں۔

عشق آں زنده گزین کو باقی است

وز شراب جانفزایت ساقیست

ترجمہ: اس زندہ و پائندہ ذات کی محبت اختیار کرلو جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے، اور جو تجھے ساقی کی طرح روح افزاء شراب پلانے والی ہے۔

شمس کا دوسری بار آنا گو رومی کی تپش اندرونی کو تو کم نہ کر سکا لیکن ظاہر میں اس کو اس اعتدال پر لے آیا جس کے بعد ان کا شغل عبادت میں اس قدر زیادہ ہو گیا، جس کا اندازہ ان کی اس نظم سے ہو سکتا ہے جس میں کہتے ہیں۔

چو وضوز اشك سازم بود آتشیں نمازم

در مسجدم بسوزد چو بدوزند اذانے

عجباً نماز مستان تو بگو درست ہست آن

که نداند او زمانے نشناسد او مکانے

در حق چگونه کوبم که دست ماند و نے دل

عجبا چه سوره خواندم چو نداشتم زبانیے

بخدا خبر نہ دارم چو نماز می گذارم

کہ تمام شد رکوعے کہ امام شد فلانے

ترجمہ: ۱۔ چونکہ (اندر کے سوز و گداز کے نتیجے میں بہنے والے) اشک کے قطروں سے وضو کرتا ہوں اس لیے میری نماز سے آگ کی تپش ہوتی ہے۔ جب (سوز و گداز سے بھرپور) اذان (کی گونج) مسجد کے دروازے سے ٹکراتی ہے تو وہ دروازہ بھی اپنی گرمی سے مجھے جلا ڈالتا ہے۔

۲۔ واہ رے (اللہ کے عشق میں) مست لوگوں کی عجیب وغریب نماز، جنھیں زمان ومکان کی خبر ہی نہیں۔

۳۔ حق تعالیٰ کا دروازہ کس طرح کھٹکھٹاؤں کہ میرے نہ تو ہاتھ میں قوت باقی رہی اور نہ دل میں طاقت۔ جب میری زبان ہی باقی نہیں رہی تو کیسی عجیب سورۃ میں نے پڑھی۔

۴۔ نماز پڑھتے وقت خدا کی قسم! مجھے کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ رکوع ختم ہوا اور فلاں نے امامت کی۔

تمام رات نماز میں کھڑے رہتے۔ قونیہ کی سردی کی بناء پر آنکھوں کے آنسو چہرے پر برف کی طرح جم جاتے تھے۔ شعلہ جوالہ تھے جس کے باطن کو برف نے چھپایا تھا۔ بقول حافظ

تو اے مردہ دل زاہد یکے در بزم رندان شو

کہ بینی خندہ بر لبہا و آتش پارہ در دل ہا

ترجمہ: اے زاہد کے مردہ دل! کچھ دیر کے لیے رندوں کی محفل میں داخل ہو جاؤ، تاکہ تجھے مشاہدہ ہو جائے کہ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے اور ان کے دلوں کے اندر سوز کی چنگاری ہے۔

اس ضمن میں فنافی الرّسول کے مقام پر پہنچنے سے پہلے ایک اشارہ دوسری طرف بھی مناسب ہوگا، کہ رومیؒ کی فنائیت کا یہ حال ہے کہ رومی سے جب کمالات شمس کا انعکاس زرکوب یا چلپی پر ہوا تو زرکوب اور چلپی کی مدح میں انھوں نے وہ اشعار کہے، جو شاید ہی کوئی پیر اپنے مرید کے بارے میں کہہ سکے۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ زرکوب یا حسام الدّین چلپیؒ رتبہ میں رومی سے بڑھ گئے تھے، بلکہ رومی اپنی ذات میں کامل فنا تھے اور جیسے شیشے سے روشنی کا انعکاس دوسری طرف ہوتا ہے، ان میں وہ شمس کی تجلیات کو دیکھتے تھے۔ زرکوب یا چلپیؒ میں وہ گویا شمس کی تعریف کر رہے ہیں۔ اپنی ذات کے بارے میں بار بار کہا۔

اوّل آخر توئی ما درمیاں

هیچ هیچ که نیاید در بیاں

فنافی الشیخ کے بعد اگر شیخ محقق اور سچ مچ کا شیخ ہے تو مشیخیت دائرہ نبوت سے باہر نہیں ہوتی۔ شیخ کامل کمالات اسی حد تک حاصل کرتا ہے کہ جس قدر فنائیت رسول (صلی اللہُ علیہ وَسلّم) اور اتباع میں اس کے قدم بڑھتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کا مزاج نبوت اور سنت کے اندر اتنا مستحکم اور مستقیم ہو جاتا ہے کہ غیر ارادی اور لاشعوری طور پر بھی اس سے صدور خلاف سنت کا نہیں ہوتا ہے۔ جیسا کہ مثلاً ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ کے ایک مریدان کے ساتھ بارہ برس تک رہے۔ جاتے ہوئے عامیانہ طرز کا ایک سوال کیا کہ آپ سے کوئی کرامت نہیں دیکھی۔ جنیدؒ نے فرمایا کہ اس بارہ سال کے عرصے میں تم نے مجھ سے خلاف سنت بھی کوئی عمل دیکھا۔ اس کے منفی جواب پر ارشاد فرمایا ”الاستقامةُ فوق الکرامة“ (استقامت کرامت سے بڑھ کر ہے) اور جنیدؒ کا یہی جملہ، جملہ صوفیاء اور مشائخ کا اجتماعی قول بن گیا۔ گویا رومیؒ کا شمسؒ میں تقلب حقیقت میں سنت کے رنگ میں رنگ جانا تھا۔ اور اب وہ شمس کی قدر و منزلت کے باوجود فنافی الرسالت کے مقام پر پہنچے اور فرمایا۔

سید و سرور محمدؐ نور جہاں

بهتر و مهتر چراغ مقبلاں

ترجمہ: ہمارے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم پورے عالم کے لیے نور ہیں، سب سے بہتر اور اللہ کے بندوں کی راہنمائی کے لیے بمنزلہ چراغ ہیں۔

یہ اشارہ ہے اس نسبت کی طرف جو ہر صاحب نسبت محمدیہؐ کو فناء فی الرسول کے مقام پر حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

با محمدؐ بود عشق پاك جفت

بهر عشق او را خدا لولاك گفت

منتهای عشق چون او بود فرد

پس مرا ورا از انبیاء تخصیص کرد

او شفیع است ایں جہاں وآں جہاں

این جہان در دین و آں جہان در جناں

ترجمہ: ا۔حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اللہ پاک کو محبت تھی، جس کی بناء پر خدا تعالیٰ نے آپؐ کو ''لولاک'' کے خطاب سے نوازا۔

۲۔چونکہ اللہ نے آپ سے انتہائی محبت کی وجہ سے آپؐ کو انفرادی اور امتیازی شان سے نوازا تھا اسی بناء پر تمام انبیاءؑ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخصوص مقام ومرتبہ پر فائز کردیا۔

رسالت پناہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ پانے کے بعد فناء فی اللہ اور بقاء باللہ جو صوفیاء کی اصطلاحات ہیں خود بخود حاصل ہوجاتی ہیں۔انسان اپنی ہوائے نفس وارادہء ذاتی سے فانی اور امر الٰہی سے تشریعاً وتکویناً قائم بامراللہ ہوجاتا ہے۔قرآن نے جس کو 'صبغت اللہ'' کہا ہے وہ حقیقت میں عبدیت محمدیہ کا رنگ ہے۔

صِبُغَةَ اللّٰہِوَ مَنُ اَحُسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبُغَةً وَّ نَحُنُ لَهُ عٰبِدُوُن (البقرہ۔۱۳۸)

ترجمہ: ہم نے قبول کرلیا رنگ اللہ کا اور کس کا رنگ بہتر ہے اللہ کے رنگ سے اور ہم اسی کی بندگی کرتے ہیں۔

رومی سالک کے لیے شرع کی پابندی ضروری سمجھتے ہیں۔چنانچہ فرماتے ہیں۔

دست کورانہ بہ حبل اللہ مزن جز بہ امرو نہی یزداں متن

چیست حبل اللہ رہا کردن ہوا کہ ایں ہوا شد صرصری مرعاد را

گر نہ کردی شرع افسون لطیف بر دریدی ہر کسے جسم حریف

شرع چون کیل و ترازو دان یقین کہ بدوخصمان رہند از جنگ وکین

گر ترازو نبود آن خصم از جدال کے رہد از وھم و حیف و احتیال

ترجمہ:

۱،۲۔حبل اللہ کیا ہے؟ خواہش کو چھوڑنا۔یعنی نفسانی خواہشات کی پیروی سے اپنے آپ کو بچانا۔کہ یہی خواہش پرستی قوم عاد کے لیے بادصرصر ثابت ہوئی۔

۳۔اگر شریعت بڑے نرم اور لطیف طریقے اور جادوگری جیسے حیران کن طور پر (انسانوں کی

راہنمائی نہ کرتی) تو ہر ایک اپنے حریف کا جسم پھاڑ دیتا۔ یعنی انسان درندگی پر اتر آتا۔

۴۔ شریعت کو یقینی طور پر ایک ترازو اور پیمانہ سمجھ لے کہ اس کے ذریعے ایک دوسرے کے دشمن جنگ سے بچ جاتے ہیں۔

۵۔ اگر ترازو نہ ہوتا تو آپس کے دشمن ظلم وجدال سے کیونکر چھٹکارا پا سکتے تھے۔

اور بدعت سے احتراز لازمی قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

از تراھب نہی فرمود آں رسولؐ
بدعتی چون در گرفتی ای فضول
جملہ شرط است و جماعت در نماز
امر معروف و زمنکر احتراز
درمیان امت مرحوم باش
سنت احمد مہل محکوم باش

ترجمہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رہبانیت سے منع فرمایا ہے۔ اے فضول! تو نے بدعت کیوں اختیار کی۔ جماعت نماز کی شرائط میں سے ہے۔ اچھے کاموں کا حکم اور برے کاموں سے منع کرو۔ امت مرحومہ کے اندر (امت کے ساتھ جوڑ رکھتے ہوئے) رہو۔ احمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو نہ چھوڑو، اس کی اتباع کرتے ہوئے اپنے کو تابع رکھو۔

مولاناؒ نے تفصیل کے ساتھ اس حدیث کو جس کو صوفیاء نے قرب بالنوافل اور قرب بالفرائض کی بنیاد بنایا ہے اپنے ان اشعار میں بیان کیا ہے۔ حدیث یہ ہے،

عن ابی ھریرہؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم قال اللّٰہ تعالٰی من عاد لی ولیا فقد اذنتہ باالحرب وما تقرب الی عبدی بشیٔیاحب الی من اداءِ ما افترضت ولا یزال عبدی یتقرب الی باالنوافل حتٰی احبہ فا اذا احببتہ کنت سمعہ الذی یسمع بہ و بصرہ الذی یبصر بہ و یدہ الذی یبطش بھا و رجلہ التی یمش بھا الحدیث۔ (اخرجہ البخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا حق تعالیٰ (حدیث قدسی میں) فرماتے ہیں کہ جو شخص میرے مقبول بندہ سے عداوت کرے میں اس کو

اشتہار جنگ دیتا ہوں۔اور میرا بندہ کسی ایسے ذریعہ سے قرب حاصل نہیں کرتا جو میرے نزدیک اداء فرض سے زیادہ محبوب ہو اور میرا بندہ برابر مجھ سے بذریعہ نوافل قرب حاصل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس کو محبوب بنالیتا ہوں۔ پھر جب اس کو محبوب بنالیتا ہوں تو میں اس کی شنوائی ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی بینائی ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ کسی چیز کو لیتا ہے اور اس کا پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے (مطلب یہ کہ اکثر ان جوارح سے کوئی کام میری رضا کے خلاف نہیں ہوتا العارض لا یدوم)

چنانچہ رومی اپنے اشعار میں فرماتے ہیں۔

گوش و دست و پایم او گرفت
من به در رفتم سرایم او گرفت

این سمع این بصر چون الات اوست
بلکه ذرات تنم مرأت اوست

گفتن او گفتن الله بود
گرچه از حلقوم عبدالله بود

ترجمہ: ا۔میرے کان، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں پر تو اسی (ذات برحق) نے قبضہ کرلیا۔میں دروازے میں داخل ہوا، پوری سرائے تو اسی نے قبضہ کرلی۔

۲۔یہ قوت سماعت اور قوت بصارت تو اسی کے (دیئے ہوئے) آلات ہیں۔بلکہ میرے بدن کے ذرّات اسی کا آئینہ ہیں۔

۳۔میرا بولنا اللہ تبارک وتعالیٰ کا بولنا ہوتا ہے۔اگرچہ (ظاہراً) اللہ کے بندے کے حلق سے آواز نکل رہی ہوتی ہے۔

یہ تعلق الٰہی خدا میں حلول واتحاد نہیں بلکہ ایک کیفیت خاصہ ہے، جس میں سالک اپنے کو اللہ تعالیٰ کے غیر مرئی ہاتھ میں آلہ پاتا ہے یا خود اس سے ہونا جانتا ہے، جسے توحید افعالی کہتے ہیں۔اس تعلق کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں۔

اتصالے بے تکیف بے قیاس

هست رب النّاس را با جان ناس

ناس مردم باشد کو مردمی

تو سر مردم ندیدستی دمی

ما رمیت اذ رمیت خواندہء

لیك جسمے در تحیر ماندہء

اتصالے که نگنجد در کلام

گفتنش تکلیف باشد والسّلام

اے خفی الذات محسوس العطاء

انت کا الماء و نحن کالرحاء

انت کا الریح و نحن کا لغبار

یختفی الریح و غبراہ جھار

ترجمہ: ۱۔اللہ تعالیٰ کے ساتھ (یہ خاص تعلق) اتصال ایسی چیز ہے، جس کی کیفیت کا اندازہ ناممکن ہے۔ایسا ہی تعلق انسانوں کے پروردگار کا انسانوں کی روح کے ساتھ ہے۔

۲۔ناس یعنی حقیقی انسان بھی تو انہی لوگوں میں سے ہوتے ہیں۔کونسے لوگ؟ تو نے تو ایک لمحے کے لیے بھی مردوں (ان حقیقی صفات، تعلق مع اللہ والے لوگوں) کو دیکھا نہیں۔

۳۔تو نے قرآنی آیات کے الفاظ کو پڑھا ہے۔لیکن (انسانی) جسم ہونے کی بناء پر حیرت میں پڑ گیا ہے۔(اس راز کو سمجھنے سے قاصر ہے)

۴۔ایک ایسا اتصال (تعلق مع اللہ) جو بیان سے باہر ہے۔اس کے بارے میں گفتگو کرنا تکلف اور غیر ضروری ہے۔والسّلام۔

۵۔اے وہ ذات جو پوشیدہ ہے لیکن اس کی عطاء محسوس ہے! آپ کی مثال پانی کی ہے اور ہماری مثال چکی کی ہے۔(پانی جو چکی کو چلا رہا ہوتا ہے نظر نہیں آتا لیکن چکی چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔)

۶۔آپ کی مثال ہوا کی ہے جبکہ ہماری مثال غبار کی ہے، ہوا چلتی ہے اور غبار کو اڑاتی ہے۔

آخر میں کہتے ہیں۔

اے برتر از خیال و قیل و قال من

خاک بر فرق من و تمثیل من

ترجمہ: اے وہ ذات برحق جو تخیل اور بحث و تمحیص سے بالاتر ہے۔ میں خاک آپ کے تعلق کی کیفیت کو مثالوں سے واضح کر سکوں گا۔

یہ شریعت کو مضبوطی سے تھامنا ہے۔ یہ مقام بقاء و فناء ہے۔ اس کے بعد جس وقت تکمیل مقامات ہو جاتی ہے تو خداوند قدّوس رومی کو شمس کی زبان کہہ لیجئے یا ترجمان حقیقت کہہ لیجئے یا مثنوی کی ''نے'' کہہ لیجئے کو علوم و حقائق کا دائمی سرچشمہ بنا دیتا ہے اور صاحب بصیرت مثنوی کے ابتدائی '۳۲' اشعار میں پوری مثنوی کا خلاصہ سمجھ جاتا ہے۔ وقت نہیں ورنہ بتایا جاتا کہ فاتحہء مثنوی میں رومیؒ نے انسان کی پیدائش، اس کی بقاء اور خدا سے تعلق اور یقین کی کن راہوں کو بتایا ہے۔

ہیچ کس را زہرہ این جوش نیست

با کہ گویم در جہان یک گوش نیست

ترجمہ: (پوری دنیا میں) کسی کے اندر اس (تعلق مع اللہ کی) کیفیت سمجھنے کی صلاحیت موجود نہیں۔ میں کس سے یہ حقیقت بیان کروں، کسی کو سننے کا حق ادا کرنے کا یارا نہیں۔

رومیؒ کے بارے میں مجھ سا بد حال و خام اس تھوڑے سے وقت میں کیا کہہ سکتا ہے۔ اس لیے اپنی بات کو انہی کے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں۔

در نیابد حال پختہ ہیچ خام

پس سخن کوتاہ باید والسّلام

ترجمہ: کوئی بھی خام (ناپختہ اور حقیقت ناآشنا) کسی پختہ اور حقیقت شناس کی حالت سے واقف نہیں، اس کی صیح کیفیت نہیں سمجھتا۔ پس یہ گفتگو مختصر کرتا ہوں۔ والسّلام۔

****

منکر حدیث پرویز

(از مولانا اشرف خان سلیمانی۔26/6/1973)

منکر حدیث پرویز کا حدیث کی حجیت کے بارے میں یہ عقیدہ ہے کہ وہ حدیث کو دلیل کے طور پر نہیں مانتا۔ جہاں کہیں بھی وہ حدیث کو دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے، وہ محض اپنے فاسد مطالب کے نکالنے کے لیے لاتا ہے اور اس وقت وہ حدیث کو تاریخ کہتا ہے۔ پرویز کے کفر کا سبب صرف انکار حدیث ہی نہیں، حقیقتاً وہ اللہ تعالیٰ کا منکر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا منکر ہے۔ نماز، روزہ، حج کی جو تشریحات شریعت میں ہیں ان سب کا منکر ہے۔ اصلاً وہ اپنے آپ کو اس قسم کا (reformer) سمجھتا ہے جو ریفارمر (مصلح) سے بڑھ کر نبوّت کی کرسی پر جا بیٹھا ہے۔ غلام احمد قادیانی لعنۃُ اللہ اور غلام احمد پرویز میں صرف اتنا فرق ہے کہ غلام احمد قادیانی نے انگریزوں کی حفاظت اور بچاؤ کی وجہ سے علی الاعلان نبوت کا دعویٰ اور اعلان کیا تھا۔ غلام احمد پرویز نے اس کے نتائج کو دیکھا کہ مسلمانوں کے ذہن اعلان نبوت کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لیے اس نے ایک سیاست چلی اور اپنے کو نبی کہنے کی بجائے اپنے لیے ایک نئی اصطلاح ''مرکز ملت'' نکالی۔ ''مرکز ملت'' حقیقت میں نبی مرسل بلکہ اس سے بڑھ کر اختیارات کا حامل ہے۔ نبی مرسل تو اللہ تعالیٰ سے احکام لیتا تھا لیکن ''مرکز ملت'' پوری شریعت کی تنسیخ، کٹاؤ، جڑاؤ کر سکتا ہے۔ (یہ باتیں میں بغیر کسی دلیل کے نہیں کہہ رہا ہوں۔ پرویز کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب میں بچّہ تھا۔ یہ شملہ میں ہماری دکان پر نماز پڑھا کرتا تھا) پرویز اپنے آپ کو مرکز ملت کے رخ سے تشریع اور قانون سازی کا حقدار سمجھتا ہے۔ گو میرے نزدیک غلام احمد قادیانی کی کوئی اخلاقی حیثیت نہیں۔ حواس باختہ و اخلاق باختہ، طالع آزما سیاسی دینی شخصیت ہے۔ جس کا یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ مرد ہے یا عورت۔ خنثیٰ مشکل ہے (وہ ہیجڑا جس کا یہ معلوم نہ ہو سکے کہ اس کی مرد کے ساتھ مشابہت زیادہ ہے یا عورت کے ساتھ) کیونکہ اس کو حیض بھی آتا ہے اور پیٹ میں حمل بھی قرار پاتا ہے اور اس سے زن وشوئی کے تعلقات بھی قائم ہو سکتے ہیں۔ (یہ باتیں خود اس نے اپنے متعلق کہی ہیں) اس بناء پر اس کی جنس کے بارے میں ہم حیران ہیں۔ باوجود ان تمام گندگیوں کے انگریزوں کی پشت پناہی کی بناء پر، سیاسی گٹھ جوڑ اور نورالدّین (جو اس کا خلیفہ تھا) کے تعاون سے آخر ش غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ لیکن غلام احمد پرویز میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں تھی، جتنی غلام احمد قادیانی میں تھی۔ العیاذ باللہ اس نے نبوت بلکہ ختم نبوت کی کرسی پر بیٹھنے کی منحوس کوشش کی۔ اور اس کرسی کا نام مرکز ملت قرار دیا اور دین کی بنیادوں کو اکھاڑ پھینکا، دینی

امور کی ایسی تاویل کر دی جو تنسیخ دین بلکہ تحریف دین سے بھی آگے ہے۔ (یہ سب کچھ ان کی کتابوں میں موجود ہے۔) اس بناء پر پاک و ہند اور عرب و عجم کے علماء نے اس پر کفر کا فتویٰ لگایا۔ صرف اس بناء پر نہیں کہ وہ حدیث کو نہیں مانتا بلکہ اس کے جملہ عقائد کی بناء پر۔

عام طور پر لوگ کہتے ہیں کہ مولوی لوگوں کو کافر بناتے ہیں۔ حالانکہ مولوی نہ کسی کو کافر بناتے ہیں اور نہ کسی پر کفر کا فتویٰ لگاتے ہیں۔ بلکہ جو شخص خود کافر ہو جاتا ہے مولوی اس کو بتاتا ہے کہ یہ کافر ہو گیا ہے۔ اگر مولوی اس کو کافر نہیں بتائے گا تو یہ اس کی دینی، اخلاقی اور معاشرتی بددیانتی ہے۔ اگر ڈاکٹر کے پاس کوئی شخص جائے اور وہ ٹی بی یا کسی اور خطرناک مرض کا مریض ہو۔ تو اگر ڈاکٹر اس کی صحیح تشخیص کے بعد اس کو یا اس کے متعلقین کو نہ بتائے کہ اس کو فلاں مرض ہے تو وہ ڈاکٹر، ڈاکٹر کہلانے کا مستحق نہیں۔ کیونکہ اس مریض کے متعدی مرض سے دوسروں کے بیمار ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس لیے ڈاکٹر کا فرض ہے کہ وہ یہ اعلان کرے کہ فلاں شخص ٹی بی کا مریض ہے۔

اسی طرح عقیدہ کے لحاظ سے جو شخص دین سے نکل جاتا ہے۔ تو جب اس شخص کا حال ان لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے جو صحیح اور غلط عقائد کو جانتے ہیں تو وہ یہ بتاتے ہیں کہ یہ عقیدہ کے لحاظ سے اس طرح بیمار ہو گیا ہے کہ اس کا یہ غلط عقیدہ متعدی ہو گیا ہے۔ حقیقت میں کافر وہ شخص خود ہی ہو جاتا ہے۔ مولوی صرف یہ کہتا ہے کہ وہ کافر ہو گیا۔ کفر کا فتویٰ لگانا آسان نہیں۔ پرویز پر صرف پاک و ہند کے علماء نے نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کے علماء نے کفر کا فتویٰ لگایا ہے۔ پرویز مارکسسٹ ہے۔ نہ صرف نظام اقتصادی کے لحاظ سے بلکہ ذہنی لحاظ سے جس طرح کارل مارکس اللہ و رسول اور آخرت کا منکر ہے اسی طرح یہ ملحد خدا، رسول اور آخرت کا منکر ہے۔ دین کا چولہ صرف لوگوں کے گمراہ کرنے کے لیے اوڑھ رکھا ہے۔ اگر اس شخص کے تاریخی پس منظر کو دیکھو تو معلوم ہو گا کہ یہ شخص اصلاً نہ تو عالم دین ہے اور نہ ہی عربی جانتا ہے۔ ۱۹۵۸ء میں لاہور میں بین الاقوامی مباحثہ ہوا تھا۔ جس میں چیدہ چیدہ علماء اور مستشرقین آئے ہوئے تھے۔ میں خود تماش بین کی حیثیت سے موجود تھا۔ آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی ہوئی بات کہہ رہا ہوں۔ پرویز نے شعوئیت (اشتراکیت) قرآن سے ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ایک مقالہ پیش کیا۔ جاہلوں کو تو جاہل بنانا آسان ہے لیکن عالم کو دھوکا دینا مشکل ہے۔

اس کے مقالے پر مصر و شام کے علماء نے یہ ردعمل ظاہر کیا تھا کہ اس شخص کو قرآن پر بات کرنے سے پہلے قرآن کی زبان سیکھنی چاہئے تھی۔ یہ بات علماء نے جن تین اشخاص کے بارے میں کہی ان میں ایک

ڈاکٹر رہبر ترکیہ کے، خلیفہ عبدالحکیم اور پرویز کے شامل تھے۔ آج جس پر نہ دین کھلا ہے اور نہ بے دینی، وہ دین اور بے دینی میں تمیز نہیں کر سکتے۔ شبلی مرحوم نے سرسید کے بارے میں ایک بات لکھی تھی کہ یہ تلمیع (ملمع) اس شخص کو تو دھوکہ دے سکتی ہے جو عربی زبان اور لغت سے ناواقف ہو۔ لیکن ایک ماہر عربی دان کو کیسے دھوکہ دے سکتی ہے؟

جس طرح کسی پروفیسر کو کوئی گدھا (donkey) کہے تو کیا اس کو غصہ نہیں آئے گا؟ تو پرویز اس سے بڑھ کر گستاخیاں کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خدائی کا انکار، نبی کی نبوت کا انکار، دین کی اساسی باتوں کا انکار۔ اور پھر بھی مسلمان! اس مباحثہ میں ایک شخص نے اس کے مقالے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اشتراکیت کو قرآن سے ثابت کرنا ایسا ہی ہے جیسے گائے کو آدمی سے پیدا کرنا۔ اس کو تعلیق بالمحال کہتے ہیں۔ جس طرح سوئی کے ناکے سے اونٹ نہیں نکل سکتا اسی طرح کسی شخص سے بیل پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور اسی طرح قرآن سے اشتراکیت ثابت کرنا ناممکن ہے۔ ورنہ قرآنی آیات کا تیسرا حصّہ منسوخ کرنا پڑے گا۔

پرویز ابتداً آڈٹ اور اکاؤنٹس سروس گورنمنٹ آف انڈیا میں ملازم تھا۔ ہندوستان کے مرکزی دفاتر سردیوں میں دہلی اور گرمیوں میں شملہ میں ہوتے تھے۔ یہ شخص عربی کا عالم نہیں تھا۔ اس کی گرائمر کی غلطیاں معمولی عربی دان نکال سکتا تھا۔ یہ اس زمانے میں صرف ایک ادیب تھا۔ اس کے ابتدائی دور میں ایک اور شخص نیاز فتح پوری ہوتے تھے، جو ایک رسالہ کانپور سے نکالتے تھے اور وہ بھی ملحد تھے۔ انھوں نے ابتداء میں حدیث کے بارے میں شکوک وشبہات پیش کیے۔ اس کے جواب میں حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ''معارف'' میں اور دیگر علماء نے بھی رد لکھے۔ اس زمانے میں پرویز نے بھی حدیث کی حمایت کے بارے میں بعض مضامین لکھے تھے۔

پرویز چونکہ آڈٹ اور اکاؤنٹ کا ملازم تھا، اس لیے اس کا زیادہ تر تعلق اقتصاد اور معاش کی کتابوں سے تھا۔ اس زمانہ میں پرویز نے معاشی مسائل کے بارے میں وہ کتابیں پڑھیں جو اشتراکیوں کی لکھی ہوئی تھیں۔ ہندوستان میں اشتراکی نظریہ کے لوگ سب سے پہلے ۱۹۳۰ء میں منظر عام پر آئے۔ اس اشتراکی لٹریچر کے مطالعہ کے نتیجہ کے طور پر یہ ذہنی طور پر کیمونسٹ اور دین سے مذبذب ہو گیا۔ تشکیک اور تذبذب کفر اور الحاد کے ابتدائی منازل ہیں۔ اس کے بہت سے رفقاء دین سے تعلق رکھتے تھے اور یہ خود علامہ اقبال سے متاثر تھا۔ اس نے ۱۹۳۴ء یا ۱۹۳۵ء میں ''طلوع اسلام'' رسالہ نکالا جس کے اوپر کے صفحہ پر اقبال کی ایک

درویشانہ تصویر آیا کرتی تھی۔ اس نے اس رسالہ کو ترجمان تعلیمات اقبال کے رخ سے پیش کیا۔ یہ سردی کے موسم میں دہلی جایا کرتا تھا۔ دہلی میں کرول باغ میں ایک جامعہ ملّیہ تھی۔ جس کے ایک استاد اسلم جیراج پوری تھے۔ ان کے والد کا نام سلامت اللہ جیراج پوری تھا، جو کہ کٹر اہل حدیث تھے۔ اسلم جیراج پوری میں ردعمل حدیث پیدا ہوا۔ منکر حدیث نہیں تھے۔ ان کی علمی ''دیانت'' کا یہ حال تھا کہ ''محاضرات حضری'' جو جامعہ ازہر مصر کے ایک استاد کے لیکچر تھے، کا ترجمہ کر کے اس کا نام تاریخ امت رکھا اور اس کتاب کو اپنی طرف منسوب کیا۔ اسی طرح ہمارے پاکستان میں ایک صاحب ہے جس کا نام احسن الاعظمی ہے۔ اس نے بھی ایک مصری کتاب کا ترجمہ کر کے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ جس میں اس نے دریائے نیل کی جگہ دریائے سندھ اور مصر کی جگہ پاکستان لکھا ہے۔

یہی اسلم جیراج پوری پرویز کے استاد تھے۔ پرویز اسلم جیراج پوری کے درس قرآن میں شریک ہوتا تھا۔ وہاں سے اس کے ذہن میں حدیث کے متعلق شکوک وشبہات پیدا ہوئے۔ تاہم اس وقت تک یہ نماز پڑھا کرتا تھا۔ اور پورا الحاد کے رخ پر نہیں آیا تھا۔ یہ حال اس کا ۱۹۳۸ء تک تھا۔ ۱۹۳۸ء میں اسلامی معاشرت کے متعلق اس کی ایک کتاب شائع ہو گئی۔ اس میں اس نے گڑبڑ نہیں کی تھی۔ ۱۹۳۸ء کے بعد رفتہ رفتہ انکار حدیث کا غلبہ ہونا شروع ہوا۔ اور اس کے اشتراکی ذہن کے آثار نمایاں ہونا شروع ہوئے۔ اس نے چاہا کہ قرآن کو بھی مارکسی صحیفہ بنائے۔ اس کا ابتداء میں معارف القرآن (مجاہل القرآن) شائع ہوا۔ اس میں بھی اتنا زیادہ الحاد اور زہر نہیں تھا۔ ۱۹۴۰ء میں اس پر استسقاء کا دورہ پڑا۔ اس استسقاء کے زمانہ میں اس میں پوری تبدیلی آئی اور یہ اسلام کے لبادے میں اشتراکیت کا پورا نمائندہ ہوا۔ مسلمانوں کا وہ طبقہ جو اباحت پسند تھا، اس اباحتی طبقہ کے لیے پرویز کا دین بہت آسان تھا۔ جس میں نہ نماز، نہ روزہ، نہ زکوٰۃ اور نہ حج تھا۔ اس نے حج، روزہ و زکوٰۃ کے وہ مفاہیم گڑھے جو غلام احمد قادیانی کی تحریفات سے بھی آگے نکل گئے۔ اسی طرح یہ اس رخ پر چلتا رہا اور پورے ارتداد پر پہنچ کر کراچی منتقل ہو گیا۔

پرویز بھی گورنمنٹ انڈیا آڈٹ میں تھا اور غلام محمد جو بعد میں گورنر جنرل پاکستان ہو گئے وہ بھی انڈیا آڈٹ اور اکاؤنٹس میں ملازم تھے۔ یہ دونوں آپس میں گہرے دوست تھے۔ غلام محمد بھی ذہنی لحاظ سے اسلام کی پیروی کا قائل نہیں تھا اور اسلام کو پریکٹیکل (یعنی عملی) دین نہیں سمجھتا تھا۔ محمد شفیع قریشی صاحبؒ امیر جماعت تبلیغ سے میں نے سنا تھا کہ غلام محمد کہتا ہے کہ تمہارا دین اور، اور ہمارا دین اور۔ غلام محمد وزیر خزانہ بن گیا۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی کوششوں سے پاکستان کے آئین میں قرارداد مقاصد پاس ہوگئی۔ اس قراردادِ مقاصد میں ایسے الفاظ پیش کیے گئے جو حقیقت میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ہی پیش کر سکتے تھے۔ انھوں نے حکومت کو چاروں طرف سے باندھ دیا تھا۔ قرارداد مقاصد میں پاکستان کے آئین میں بنیادی دفعات قرآن وحدیث کو قرار دیا۔ اگر حدیث نہ ہو تو کتاب (قرآن) کی تاویل جو چاہے جس طرح کرے۔ اس لیے آئین میں قرآن وحدیث دونوں کو بنیاد بنا کر رکھا۔ تاکہ کوئی قرآن کی من مانی تاویل نہ کر سکے۔ غلام محمد نے غلام احمد پرویز کو مہرہ کے طور پر استعمال کیا، ڈھائی لاکھ روپیہ اس کو سرکاری خزانہ سے دیے اور طلوع اسلام ماہواری کی بجائے ہفتہ واری ہوگیا۔

بہرحال قرآن اپنے قرآن ہونے میں حدیث کا محتاج ہے۔ اگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہ فرماتے کہ یہ قرآن ہے تو ہم کو کیسے معلوم ہوتا کہ واقعی یہ قرآن ہے اور اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ اس لیے پرویز اور اس کے ہمنواؤں نے حدیث کی حجیت پر تیشہ چلایا تاکہ حدیث کو درمیان سے نکال کر جس طرح چاہے پھر قرآن کی من مانی تشریح کر سکے۔ لیکن

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

****

تصحیح نیت

(مولانا اشرف خان سلیمانیؒ۔5/2/1973)

آدمی جہاں بھی جاتا ہے۔اس میں اصل بنیاد قصد اور ارادہ کی ہوتی ہے۔اگر ارادہ اچھا ہے تو عمل نیک ہے۔اگر ارادہ درست نہیں تو عمل بھی درست نہیں۔اس بات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشہور حدیث

انّما الاعمالُ باالنیّات

ترجمہ: بے شک اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

میں فرمایا ہے۔ ہر چیز کے مختلف ارادے، نیتیں اور مقاصد ہو سکتے ہیں۔لیکن جو نیت مقبول اور انسان کو دلانے والی ہے، وہ عمل کا صرف اللہ کی رضا کے لیے کرنے کی نیت ہے۔اگر اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے آپ کہیں گئے اور آپ نے اس وجہ سے قدم اٹھائے کہ میرا رب مجھ سے راضی ہو جائے اور دین کی کوئی بات سنوں یا معلوم کر لوں اور وہاں پہنچے لیکن وہ چیز نہ ہو سکی تو بھی آپ کو ثواب مل جائے گا۔حدیث شریف میں ہے کہ ہر شخص کے لیے وہ اجر ہے جس کی اس نے نیت کی۔ایک شخص نے حج کا پختہ ارادہ کیا، نیت ٹھیک ہے، وہ گھر سے نکلا۔لیکن موت واقع ہو گئی، تو اس کا حج ہو گیا، اور اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر واقع ہو گیا۔بلکہ قیامت تک جتنے حج ہوں گے ان سب کا ثواب اس کو ملے گا۔ایک شخص نے سچی نیت سے قرآن شریف حفظ کرنے کا ارادہ کیا۔ایک پارہ یاد کیا اور موت آ گئی۔تو پورے قرآن کے حفظ کا ثواب ملے گا اور قیامت کے دن حفاظ میں اٹھایا جائے گا۔

عرض کرنے کا مدعا یہ ہے کہ انسان کا قصد اور ارادہ اس کے عمل کو عمل بھی بنا دیتا ہے اور قیمتی بھی بنا دیتا ہے اور اجر و ثواب بھی دلا دیتا ہے۔اور جب نیت اور ارادہ درست نہیں ہوتا تو وہ عمل اللہ کے نزدیک عمل نہیں ہوتا۔اگر ریا کے لیے ہے تو کہ قرآن کہتا ہے

لَا تُبۡطِلُوۡ صَدَقٰتِكُمۡ بِالۡمَنِّ وَالۡاَذٰى (البقرہ۔۲۶۴)

ترجمہ: اپنے صدقات کو کسی پر احسان دھر کر یا اذیت پہنچا کر باطل نہ کرو۔

عمل باطل ہو گیا، تو ختم ہو گیا۔بغیر قصد صحیح اور نیک ارادہ کے وجود عمل بھی باقی نہیں رہتا۔اس لیے انسان کی یہ کوشش ہونی چاہئے کہ عمل کرتے ہوئے یہ سوچے کہ اے اللہ یہ عمل تیرے لیے ہے اور تیری رضا کے لیے کرتا ہوں، تو عمل کرنے والا نامراد نہیں رہتا۔جس انسان کا عمل اللہ تعالیٰ کے لیے ہو تو وہی شخص مرادمند ہے۔وجود عمل قصد اور ارادہ کی درستگی سے ہوتا ہے۔اسے جو اجر ملتا ہے وہ نیک ارادہ کی وجہ سے ہے اور اسی نیک ارادہ

سے اس کا اجر بڑھتا بھی ہے۔ جتنی نیت خالص ہوگی اتنا ہی اجر زیادہ ہوگا۔ اس لیے اپنی نیتوں کو ٹٹولنا چاہئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ عمل تو اللہ تعالیٰ کے لیے شروع کیا تھا اور پھر عمل کے دوران بیچ میں کوئی اور چیز مل گئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری تعلیم کے لیے ایک دعا ارشاد فرمائی ہے، اللّٰھم انی استغفرك من کل خیر اارد ّت۔

یعنی: اے اللہ میں مغفرت چاہتا ہوں ہر اس خیر سے جس کرنے میں ابتداً ارادہ تیری رضا کا تھا لیکن پھر بیچ میں کوئی اور چیز مل گئی۔

صوفیاء نے کہا ہے کہ نیت سے زیادہ جلدی خراب ہونے والی کوئی چیز نہیں۔ دودھ دیر سے پھٹے گا لیکن نیت جلد خراب ہو جائے گی۔ کیونکہ شیطان بہت پرانا گھاگ ہے اور تجربہ کار بھی ہے۔ وہ انسان کے عمل کی جڑ پر کلہاڑی مارتا ہے۔ شیطان جانتا ہے کہ اگر نیت خراب ہوگئی تو تمام عمل برباد ہو جائے گا۔ اس لیے وہ نیت کو خراب کرتا ہے۔ اور جڑ کو گھن لگ جاتا ہے۔ شیطان کی یہ بڑی کوشش ہوتی ہے کہ نیت کو اللہ تعالیٰ کے غیر کے لیے کردے۔ اس لیے بعض بزرگوں نے کہا ہے کہ شیطان ایسے دبے پاؤں عمل کو خراب کرنے اور ریا کو پیدا کرنے کے لیے آتا ہے کہ پہچان اتنی مشکل ہوتی ہے جیسے سیاہ رات میں سیاہ پتھر پر کالی چیونٹی چلتی ہے۔ اس لیے ہم کو کوشش کرنی چاہئے کہ ہمارا ہر عمل شیطان کے اس کاری وار سے بچ جائے۔ اس کے لیے حفاظت کا سب سے مؤثر طریقہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو یہ ہوسکتا ہے کہ انسان مخلوق کو نگاہ میں ہی نہ لائے۔ اللہ تعالیٰ کے سِوا کسی غیر پر نظر ہی نہ ڈالے۔ بقول حضرت اشرف علی تھانویؒ کے کہ جب نماز پڑھتے ہو تو کبھی تمہارے ذہن میں یہ خیال آیا ہے کہ مجھے نماز اچھی طرح پڑھنی چاہئے تاکہ مسجد کی چٹائیاں خوش ہو جائیں۔ تو جس طرح چٹائی مخلوق ہے اسی طرح شاہ و گدا، حاکم و محکوم، امیر و غریب سب مخلوق ہیں۔ شیطان اس لیے وار کرتا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ فلاں ہم کو دیکھے گا تو کہے گا کہ یہ اچھا ہے۔ اگر اچھا سمجھا تو کیا؟ اور اگر برا سمجھا تو کیا؟ اللہ تعالیٰ کے دینے سے عزت و ذلت ملتی ہے۔ کوئی شخص نہ عزت دے سکتا ہے اور نہ ذلّت دے سکتا ہے۔ اگر کوئی دل کے یقین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو مُعز اور مُذِل سمجھے گا تو وہ مخلوق کی مدح و ذم کی کسی قسم کی پرواہ نہیں کرے گا۔ نہ کسی کے اچھا کہنے سے کوئی اچھا ہوسکتا ہے اور نہ کسی کے برا کہنے سے کوئی برا ہوسکتا ہے۔ اچھا وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اچھا ہے اور برا وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک برا ہے۔ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ اگر پوری دنیا تم کو قطب و ابدال کہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں تم دال (مردود) ہو تو تمہارا کیا فائدہ؟ اور اگر تمام دنیا تم کو مردود کہے اور اللہ

تعالیٰ کے ہاں تم مقبول ہو تو کیا نقصان؟ جب لوگوں کے مدح و ذم کے پرواہ نہیں رہتی تو ریا کے پیدا ہونے کا ایک بڑا ذریعہ ختم ہو جاتا ہے۔ نگاہ میں جب ربّ بس جائے تو تمام مخلوق کی عظمت و خیال دل سے نکل جاتا ہے۔ اور جب سب نکل گئے تو پھر عمل کس کو خوش کرنے کے لیے کرے گا؟ اس بنا پر اللہ تعالیٰ کی توحید کو اپنے دل میں بسا لو۔ اللہ تعالیٰ کو فاعل حقیقی ذلت دینے والا اور عزت دینے والا سمجھو۔ جب غیر نگاہ سے اوجھل ہو جائے گا تو پھر غیر کے لیے عمل نہیں ہو گا۔ جو لوگوں سے عزت کے طالب ہوتے ہیں لوگ ان کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ لیکن ظاہر داری کرتے ہیں۔ الیکشن کے دنوں میں بڑے بڑے لیڈر، خان، نواب کس کس کی خوشامد اور چاپلوسیاں نہیں کرتے کہ ووٹ مل جائے۔ ووٹ کے ذریعے کامیاب ہو کر ممبر بن جائیں گے اور اس کے ذریعے سے سوسائٹی میں معزّز بن جائیں گے۔ حالانکہ عزت وہی ہے جو دل کے اندر ہو۔

ہر ایک کی خوشامد ہر ایک کی ثناء

اسیر بلا طالب جاہ ہے

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

وَلِلّٰہِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ (المنافقون۔۸)

ترجمہ: عزت اللہ کے لیے، اس کے رسول کے لیے اور مومنین کے لیے ہے۔

اہل دنیا کی جو عزت ہوتی ہے۔ یہ حقیقی عزت نہیں بلکہ ان کے شر سے بچنے کے لیے ظاہراً ان کی عزت کی جاتی ہے۔ جس طرح کوئی سانپ یا بھڑیا آ جائے تو تم سب کھڑے ہو جاتے ہو۔ اور وہ یہ سمجھے کہ تم اس کی عزت کے لیے کھڑے ہو گئے ہو۔ حالانکہ تم اس کی عزت کے لیے نہیں بلکہ اس کے شر سے بچنے کے لیے کھڑے ہو گئے ہو۔

جو عزت دفع مضرّت کے لیے یا جلب منفعت کے لیے ہو وہ عزت نہیں۔ عزت نام ہے اس بڑائی کا جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں میں خود بغیر ظاہری مال و جاہ کے پیدا فرماتے ہیں اور مخلوق کے دلوں میں ان کے لیے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ عزت جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہے، اگر انسان فقیر ہو یا قبر میں ہو، بوریا پر ہو یا تخت پر ہو یہ عزت قائم رہتی ہے۔ حضرت علی ہجویری داتا صاحبؒ، حضرت معین الدّین چشتی اجمیریؒ زندہ نہیں ہیں لیکن اب بھی لوگوں کے دلوں میں ان کی عظمت اور عزت ہے۔ کسی بادشاہ کی بھی اتنی عزت نہیں جتنی ان فقراء کی ہے۔ یہ وہ عزت ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے تعلق کی بناء پر لوگوں کے دلوں میں ڈال دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ جس سے پیار کرتے ہیں تو اوّلاً فرشتوں میں اعلان فرما دیتے ہیں کہ میں اس بندہ سے پیار کرتا ہوں اور پھر یہ پیار مخلوق میں ان کے لیے پیدا فرما دیتے ہیں۔

جو محبت، پیار اور عزت اغراض کی وجہ سے ہو اس محبت و پیار اور عزت میں حقیقت نہیں ہوتی۔ جب تک غرض ہے تو پیار و محبت بھی ہے اور عزت بھی ہے۔ اور جب غرض پوری ہوگئی یا ختم ہوگئی تو ساتھ ہی پیار محبت اور عزت سب رخصت ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ باقی ہے اور اللہ تعالیٰ والی محبت و عزت بھی باقی ہے۔ مخلوق فانی ہے اور مخلوق کی اغراض کے واسطے سے جو پیار و محبت ہوگی وہ بھی سب کی سب فانی ہے۔ مخلوق کے رخ کی جتنی بھی اشیاء ہیں وہ صرف فانی ہی نہیں بلکہ اس دنیا میں بھی مصیبت کا سبب اور آخرت میں بھی ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو مخلوق والی اغراض سے نکالے اور اللہ تعالیٰ والے اخلاص میں ڈال دے۔ جب اخلاص آئے گا تو اغراض دنیوی ختم ہو جائیں گی۔ اور اخلاص کا کمال اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک اللہ تعالیٰ کا یقین، محبت، دھیان اور عظمت دل میں نہیں اترتی۔ بلکہ یوں کہو کہ جب تک لاالہ الاّ اللہ محمدالرسول اللہ کی حقیقت دل میں نہیں اترتی۔ صدق اور اخلاص میسر نہیں آتا۔ صدق اور اخلاص اس وقت میسر آئے گا جب تم اللہ تعالیٰ کے لیے ہوگئے۔ اہل اللہ ذکر کی مشق کیوں کرواتے ہیں؟ تاکہ دل میں ایک اللہ بس جائے اور غیر نکل جائے۔ تو ہی تو ہو بس تو ہی تو ہو۔ اللہ بس، باقی ہوس۔ ایک اللہ اگر آجائے تو دل کی دنیا آباد ہو جائے گی۔ عشاق کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ اگر کسی راہ میں دیر بھی ہو اور اللہ تعالیٰ سے مراد بر بھی نہ آرہی ہو۔ لیکن پھر بھی وہ یہ کہتے ہیں،

ع تیرے در کو چھوڑ کر بے نوا جاؤں کہاں

حضرت تھانویؒ کے ایک محبوب اور محبّ خلیفہ حضرت مجذوبؒ تھے۔ حضرت نے ایک دفعہ اپنی مجلس سے نکال دیا تو خانقاہ کے دروازہ پر بیٹھ گئے اور یہ شعر پڑھا،

ادھر وہ در نہ کھولیں گے ادھر میں در نہ چھوڑوں گا
حکومت اپنی اپنی ہے کہیں ان کی کہیں میری

تو جو چمٹ جائے وہ چمٹے رہتے ہیں۔ اور اس چمٹنے میں بھی مزہ ہے۔ ایک اللہ تعالیٰ سے چمٹ جاؤ۔ وہ سب کچھ دے گا۔ اس کے در کے سوا کہیں بھی کچھ نہیں ملے گا۔ باقی سب چھوٹے چھوٹے سوراخ اور کھڑکیاں ہیں۔

جب تم در نہیں چھوڑو گے تو پھر وہ صدر دروازہ کو کھولیں گے۔ اللہ تعالیٰ تھوڑے دن دیکھتا ہے کہ آیا میرا ہے یا

نہیں۔ اگر میرا ہے تو میرے ساتھ لگا رہے گا۔ اصل چیز یہ ہے کہ دلوں میں ایک اللہ تعالیٰ کی محبت کو سماؤ اور جماؤ۔ ذکر میں اللہ تعالیٰ کی رضا کی نیت کے ساتھ ساتھ اس کی محبت کی بھی نیت کرو کہ اے اللہ میں تجھ سے تجھ ہی کو چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا معاملہ بندوں کے ساتھ اُن کے گمان کے مطابق ہوتا ہے۔ جب لا الہ الّا اللّٰہ کہتے ہو تو یہ تصور اور گمان کرو کہ ہر غیر دل سے نکل گیا اور اللہ تعالیٰ کی محبت و عظمت دل میں آ گئی۔ اور بقول حضرت مجذوبؒ، یہ حالت ہو جائے کہ

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی

اب تو آ جا اب تو خلوت ہو گئی

دل کی خلوت مزیدار چیز ہے، جب اس سے چوہے اور بلیاں نکل جاتے ہیں۔ ایک نشہ ہوتا ہے شراب کا اور ایک نشہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی محبت کا۔ اللہ تعالیٰ کی محبت کے نشے میں جو لذت اور سرور ہے اس کا تم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ کوئی بات تو ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں نے حکومتوں پر لات ماردی ہے۔ ابراھیم بن ادھمؒ نے کیسے حکومت پر لات ماردی تھی۔ اور جن اللہ کے بندوں نے حکومتیں چلائی ہیں ان کا یہ حال تھا کہ ہاتھوں میں تو حکومت تھی لیکن دل میں اللہ ہی اللہ تھا۔ جیسے ہم نماز پڑھتے ہیں اور دنیا دیکھتی ہے کہ ہم نماز میں مشغول ہیں۔ لیکن نماز میں سب کچھ ہوتا ہے ایک اللہ تعالیٰ نہیں ہوتے۔ ہماری نماز واٹر پروف (water proof) ہوتی ہے۔ اسی طرح جو اللہ والے ہیں وہ ظاہر میں تو دنیا میں مشغول ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ میں مشغول ہوتے ہیں۔ یہ دل کی خلوت اور فراغت جس کو نصیب ہو گئی وہ کامیاب ہو گیا۔ یہ اتنی بڑی دولت ہے کہ جس کے متعلق خاقانیؒ فرماتے ہیں،

بعد از سی سال این نکته محقق شد با خاقانی

لحظه با خدا بودن بهتر است از ملك سلیمانی

ترجمہ: تیس سال کے بعد خاقانی پر یہ نکتہ واضح ہو گیا کہ ایک لمحہ کے لیے تعلق مع اللہ کی کیفیت مل جائے، یہ ملک سلیمانی سے بہتر ہے۔

اس زمانے کے ایک عارف نے کہا ہے،

حریم دل سے باہر آ کر ڈھونڈو تو ذرا مجھ کو

تمھاری یاد کی محویتوں نے کھو دیا مجھ کو

میں تمہاری یاد میں گم ہوں۔ایک میں ہوں اور ایک تم ہواور ساری خدائی خاموش۔جب سب غیر مٹ جاتا ہے تو اخلاص خود آجاتا ہے۔

فنا کے بغیر بقا کا پتہ نہیں چلتا
خودی مٹے بغیر خدا نہیں ملتا

حافظا گر بت شکستی خوش مباش
خود پرستی کم تر از اصنام نیست

ترجمہ: اے حافظ! تو نے اگر بت توڑ ڈالے ہیں تو اس پر خوش مت ہو۔خود پرستی بت پرستی سے کم نہیں۔

بتوں کا ہے بندہ خدا کا نہیں ہے
خدا کا نہ ہو جو مسلمان ہو کر

ساری محنت دین کی،عبادت کی،ذکر کی صرف ایک مقصد کے لیے ہے کہ ہم خالصتاً ومخلصاً اللہ تعالیٰ کے لیے ہو جائیں۔وہ ہمارا ہو جائے اور ہم اس کے ہو جائیں۔وہ ہم سے راضی ہو جائے اور ہم اس سے راضی ہو جائیں رضی اللہ عنهُ و رضو عنهُ ۔يُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ (یعنی اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی۔وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں اور اللہ ان سے محبت کرتے ہیں)۔

حضرت تھانویؒ نے ایک دعا لکھی ہے اور فرماتے ہیں کہ جب دل شکستہ ہو جاتا ہے تو اس دعا کی پناہ میں آجاتا ہوں۔

اللّٰهم كن لی و جعلنی لكَ

ترجمہ: اے اللہ تو میرا ہو جا اور مجھ کو اپنا بنا لے۔

پھر جہاں بھی ہو گے اس کی طرف سے عطاء ومحبت ہوگی۔اور تمہاری طرف سے عبادت ومحبت ہوگی۔اس کی طرف سے رضا وعطا ہوگی،تم اس سے لگے ہو گے اور وہ تم سے۔گویا کہ

دونوں طرف سے آگ ہے برابر لگی ہوئی

اصل تعلق دونوں طرف سے ہوتا ہے۔بعض کا کھلا اور بعض کا چھپا ہوا ہوتا ہے۔معشوقوں کا عشق چھپا ہوا اور عاشقوں کا عشق کھلا ہوا۔جتنی محبت اللہ تعالیٰ کی کسی کے دل میں ابھرے گی وہ اللہ تعالیٰ کی چھپی ہوئی محبت کا ظہور ہوگا۔ورنہ

میری کیا طاقت کہ عشق یار کا دعویٰ کروں
تیری لطف پروری کا ہوں میں ادنیٰ غلام

اگر کسی کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ کسی نے رابعہ بصریہؒ سے پوچھا۔ (وہ ایک دن یہ دعا مانگ رہی تھیں کہ اے اللہ! اس محبت کے صدقے جو تجھ کو میرے ساتھ ہے میرا فلاں فلاں کام کر دے)۔ کسی نے کہا کہ تم اللہ تعالیٰ کو اپنی محبت کا واسطہ دو، تم کو کیا معلوم کہ وہ بھی تم کو چاہتا ہے۔ حضرت رابعہؒ نے جواب دیا کہ اگر وہ مجھ کو نہیں چاہتا تو میرے دل کو اپنی محبت میں کیوں جلایا؟ ایک دفعہ حضرت رابعہ بصریہؒ ایک ہاتھ میں آگ اور ایک ہاتھ میں پانی لیے ہوئے تھیں۔ کسی نے پوچھا کہ کیا کر رہی ہو! کہا کہ دوزخ کی آگ کو بجھانے اور جنت کو جلانے جا رہی ہوں۔ کیونکہ لوگ جنت میں داخل ہونے کے لیے اور جہنم سے بچنے کے لیے تو اعمال کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں کرتے۔ یہ صاحب حال تھیں۔ محققین کہتے ہیں کہ ہم جنت اس لیے چاہتے ہیں کہ جنت اللہ تعالیٰ کی رضا کا محل ہے اور اللہ تعالیٰ ہم کو جنت میں ملیں گے۔ اس لیے ہم جنت کو رضائے حق تعالیٰ اور نعمائے حق تعالیٰ کا محل ہونے کی وجہ سے چاہتے ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اللہ تعالیٰ سے جنت مانگی ہے۔ محبوب اگر زہر بھی دے دے تو وہ بھی شہد ہے۔

ع اگر حنظل خوری از دست خوش رو

اور دوزخ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا محل ہے اور دوزخ میں اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں ہوگا۔ بعض صوفیاء نے لکھا ہے کہ قرآن کی سب سے سخت آیت جو ہے وہ یہ ہے

عَنۡ رَّبِّهِمۡ يَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡن (المطففین۔۱۵)

کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان سے پردہ میں ہوں گے۔

اور عشاق کے لیے اس سے بڑی مصیبت کیا ہو سکتی ہے؟

از دو عالم در دو عالم ایں خوش آید مرا
روئے تو یا کوئے تو یا خوئے تو یا بوئے تو

باتو دوزخ، جنت است اے دلربا
بے تو جنت دوزخ است اے جانفزا

(تیرے بغیر جنت دوزخ اور تیرے ساتھ دوزخ بھی جنت ہے)

جہاں اللہ ہے، جہاں اس کی رضا ہے اور جہاں اس کی عطا ہے وہ جنت ہے۔ جنت اللہ تعالیٰ کی لقاء، اللہ تعالیٰ کی رضا اور اللہ تعالیٰ کی نعماء کا محل ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اللہ تعالیٰ سے جنت کو طلب فرمایا ہے۔ اللّٰھم انّی اسئلك الجنّة (اے اللہ میں تجھ سے جنت کا سوال کرتا ہوں)

جن صوفیاء سے ایسی بات منقول ہے کہ جنت کو کیا کرتے ہو۔ وہ جنت کے استخفاف کے لیے نہیں کہا۔ وہ یا تو غلبہ حال میں کہا ہے یا لوگوں کی نیتوں کو زیادہ خالص کرنے کے لیے کہا ہے۔

جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گذر بادہ و جام سے گذر

حضرت عمر رضی اللہ عنہُ ایک دعا پڑھا کرتے تھے

اللّٰھم اجعل اعمالی خالصةً لوجهكَ ولا تجعل لاحد شیئا۔

اے اللہ میرے اعمال کو خاص اپنے لیے کر دے اور ان میں کسی دوسرے کا حصہ نہ کر۔

****

(تقریر مولانا اشرف خان سلیمانیؒ۔ 7/2/1973)

مرضی کسے کہتے ہیں!

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

مومن کی مرضی اللہ تعالیٰ کی رضا کے تابع ہوتی ہے۔ جب انسان کی اپنی چاہت مٹ جاتی ہے اور انسان اپنی خواہش کو مرضیِ مولا پر قربان کر دیتا ہے۔ تو اس وقت اس کی مرضی گویا اللہ تعالیٰ کی مرضی ہو جاتی ہے۔ ایک بزرگ گذرے ہیں بہلول دانا۔ ایک مرتبہ بیٹھے ہوئے تھے اور ریت کے ذروں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ ہارون الرشید بادشاہ کا گذر ہوا، اس نے پوچھا کہ اے دیوانے کیا حال ہے؟ بہلول نے جواب دیا کہ اس شخص کا کیا حال پوچھتے ہو جس کے اشاروں پر دنیا ناچ رہی ہے۔ ہارون نے کہا کہ اللہ کے بندے سیدھی بات کر، کیا کفر بکتے ہو۔ بہلول کہنے لگے

چوں رضائے من رضائے حق شود

کہ جب میری اور اللہ تعالیٰ کی مرضی ایک ہوگئی۔ میں نے اپنی مرضی اور خواہش کو اللہ تعالیٰ کی مرضی اور خواہش پر قربان کر دیا، تو اس کی رضا اور میری رضا میں کوئی فرق نہیں۔ گویا اس کا فیصلہ میرا فیصلہ ہے۔

انسان اپنے کو مٹائے اور یہ طے کر لے کہ میں راضی بہ رضائے حق ہوں۔ پنجاب میں ایک بزرگ شاہ دولہؒ گذرے ہیں، ایک دفعہ ان کے علاقے میں دریا کا بند ٹوٹ گیا۔ لوگوں نے درخواست کہ حضرت آپ بھی ہمارے ساتھ بند باندھنے کے لیے تشریف لے چلیں تا کہ برکت ہو۔ آپ نے پھاوڑا لے کر جو حصّہ بند کا صحیح تھا اس کو بھی توڑنا شروع کیا۔ لوگوں نے کہا کہ ہم تو آپ کو بند کے باندھنے کے لیے لائے تھے، الٹا آپ بند کو توڑ رہے ہیں۔ کہا کہ جہاں مولا وہاں دولہ، کہ میں تو اللہ تعالیٰ کی پارٹی کا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی پارٹی کا کام کروں گا۔ ایک بزرگ امیر خسروؒ گذرے ہیں۔ آپ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے بہت ہی چہیتے مرید تھے اور فارسی کے اچھے شاعر بھی تھے۔ وہ فرماتے ہیں

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
کس نہ گوید بعد از آں من دیگرم تو دیگری

ترجمہ: کہ میں تو ہو جاؤں اور تو میں ہو جائے۔ میں جسم ہو جاؤں اور تو اس کی روح ہو جائے۔ تا کہ اس کے بعد

کوئی یہ نہ کہے کہ میں اور تو علیحدہ علیحدہ ہیں۔

انسان جب اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی رضا پر مٹا دیتا ہے اور اس کی اپنی خواہش رہتی ہی نہیں تو پھر وہ اپنی خواہشات کا بندہ اور غلام نہیں رہتا بلکہ اللہ تعالیٰ کہ خواہش اور مرضی کا پابندر ہتا ہے۔ خواہش کا ایک درجہ تو وہ ہے جس کو ہم نفسانی خواہش کہتے ہیں جب انسان نفس کی خواہش کا غلام بن کر چلتا ہے اپنے لیے بھی مشکلات پیدا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو بھی ناراض کر دیتا ہے۔ اور جب خواہش کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت کر دیتا ہے تو انسان نفسانی سے ربّانی بن جاتا ہے۔ اگر ایک خالی بوتل ہو، تو اس میں ہوا بھری ہوتی ہے۔ اس بوتل سے ہوا نکالنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس میں پانی بھرتے جاؤ اور ہوا نکلتی چلی جائے گی۔ اسی طرح نفس میں ہوا (خراب خواہشات) بھری ہوتی ہیں۔ اس کو رب کے حکم پر ڈالتے جاؤ تو ''ہوا'' یعنی چاہت نفس نکلتی چلی جائے گی۔ اس سے تمہاری نفسانیت ربّانیت والی ہو جائے گی۔ اور پھر ایسا ہو جائیگا جس کے متعلق قرآن میں آیا ہے،

صِبۡغَةَ اللّٰهِ وَ مَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبۡغَةً وَّ نَحۡنُ لَه عٰبِدُوۡن ہ

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کا رنگ۔ اور اللہ تعالیٰ کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے۔

اپنی چاہت کو مٹا کر رب کی چاہت پر آ جانا، اسے ولایت کہتے ہیں۔ دینداری، ھدایت اور بزرگی کہتے ہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ چاہت نفس مٹے اور چاہت رب آ جائے۔ ھوا نکلے اور ھدیٰ آ جائے۔ چاہتِ نفس نکلے اور ہدایت ربّانی آ جائے۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے بن گئے کہ تمہاری ہر خواہش اللہ تعالیٰ کے لیے اُٹھتی ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ بھی بہت غیرت مند ہے وہ بھی پھر تمہاری ہر جائز خواہش اور ضرورت کو براہ راست پورا کرے گا۔ اسی مفہوم کو اقبال نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے،

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

پھر انسان اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی خواہشات کو نہیں مٹاتا۔ حدیث میں آتا ہے۔ فرمایا حضور صلی اللہُ علیہ وسلم نے کہ بہت سے پراگندہ حال اور پراگندہ بال اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے ہیں کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ پر کسی چیز کے لیے قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسموں کو پورا فرماتے ہیں۔

گفتن او گفتن اللّٰہ بود

گرچہ از حلقوم عبداللّٰہ بود

بندہ کے منہ سے بات نکلتی ہے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی بات ہوتی ہے۔ مرضی تو اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے۔ اوراس کی ہی چلتی ہے۔ اس کے ساتھ چلاتے رہو تو چلتے رہو گے۔ اگر اس کے خلاف چلو گے تو منہ کے بل گر جاؤ گے۔ ایک شخص سائیکل پر سودا لا رہا ہے، اور جس طرف وہ چل رہا ہے اس طرف ایک بس بھی جا رہی ہے۔ اب اگر یہ سائیکل سوار اس بس کو پکڑ لے تو بغیر پاؤں چلائے بس کی رفتار سے سفر کرے گا۔ اور اگر بس کو پکڑ کر بس کے مخالف سمت میں چلنے کی کوشش کرے گا تو منہ کے بل گر جائیگا۔ اسی طرح اگر زمانہ کے رخ پر چلو گے تو ماتھے کے بل گر جاؤ گے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی مرضیات کے رخ پر چلو گے تو کامیابی ساتھ ہوگی۔ یہاں بھی چمکو گے اور آخرت میں بھی انشاء اللہ چمکو گے۔

من کان اللّٰہ کان اللّٰہ لہٗ (ترجمہ: جو اللہ تعالیٰ کے ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے ہو جاتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ جس کے ہو گئے تو اللہ تعالیٰ کی ساری خدائی اس کی ہو گئی۔ اکبر کہتا ہے،

سب تعلیم مذہبی کا خلاصہ یہی تو ہے

سب مل گیا اسے جسے اللہ مل گیا

اب دیکھنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کیا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے چاہنے والوں میں سب کے سردار ہمارے حبیب و مولا سیدنا حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم ہیں۔ جنھوں نے اپنی مرضی اللہ تعالیٰ کی مرضی پر مٹائی ہے۔ یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بول اپنا بول نہیں ہے۔

وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡھَوٰی ٥ اِنۡ ھُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی ٥ (النجم۔ ۴،۳)

کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے بلکہ وہی بولتے ہیں جو ان کو وحی کی جاتی ہے۔

اور ان کا عمل بھی اپنا عمل نہیں ہے

وَمَا رَمَیۡتَ اِذۡ رَمَیۡتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی (الانفال۔ ۱۷)

ترجمہ: اور تو نے نہیں پھینکی مٹھی خاک کی جس وقت کہ پھینکی تھی لیکن اللہ نے پھینکی۔

ان کا حال اپنا حال نہیں۔ اپنے سے گذر کر اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ایسا دے دیا کہ جو

اللہ تعالیٰ چاہے وہی کریں اور جو اللہ تعالیٰ نہ چاہے وہ نہ کریں۔ تو جو بندہ اس حال پر پہنچ جائے تو کتنا اللہ کو پیارا ہوگا۔ ایسا انسان محبّ سے محبوب کے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ یہ کہتے ہیں،

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ۝ (الضحیٰ۔۵)

ترجمہ: تجھے دے گا تیرا پروردگار یہاں تک کہ تجھے راضی کر کے رہے گا۔

اس میں دو باتیں مثال کے طور پر کہتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ میں تھے بیت المقدس کی طرف منہ کرتے تھے تو کعبۃ اللہ کو بھی اپنے سامنے رکھتے تھے۔ اب جب مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو مکہ جنوب اور بیت المقدس شمال میں ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت گراں گذرتا تھا۔ سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ بار بار آسمان کی طرف دیکھتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ آیت اتری،

قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا ۝ (البقرہ۔۱۴۴)

ترجمہ: بیشک ہم دیکھتے ہیں بار بار اٹھنا تیرے منہ کا آسمان کی طرف، ہم عنقریب پھیر دیں گے تیرے چہرے کو اس قبلہ کی طرف جو تجھے پسند ہے۔

اللہ تعالیٰ کو ایک مرتبہ اپنا بناؤ پھر سب اپنا ہی اپنا ہے۔ ایک دفعہ اللہ تعالیٰ کو منا لو۔ جب اللہ مل گیا پھر کیا چاہتے ہو۔ گھر کا مالک اپنا ہو جائے تو گھر تمہارا ہے۔ ہمارا راستہ تو بہت آسان ہے۔ مخلوق کی ایک ایک چیز لینے کے لیے لوگ محنتیں کرتے ہیں۔ آپ ایک ایک چیز لیتے ہیں۔ جس کے پاس سب کچھ ہے اس کو لے لیا تو سب تمہارا ہو گیا۔ ایک لطیفہ مشہور ہے۔ ہارون الرّشید ایک بہت بڑا بادشاہ تھا مراکش سے لیکر پاکستان اور چین سے کانگو تک اس کی بادشاہت تھی۔ ایک دفعہ بادل کے ٹکڑے کو کہنے لگا کہ جا اور جہاں چاہے برس۔ تیرے پانی سے جو غلہ پیدا ہوگا اس کا عشر میرے ہی خزانے میں آئے گا۔ ایک دن گھر میں بیٹھا تھا، لونڈی پنکھا جھل رہی تھی۔ اس سے کہا کہ مانگو، کیا مانگتی ہو، جو مانگو گی دوں گا۔ لونڈی خاموش تھی اس سے پھر پوچھا کہ تو کچھ نہیں مانگتی! لونڈی نے سر پر ہاتھ رکھا کہ میں تجھے مانگتی ہوں کہ جب تو میرا ہو گیا تو تیری تمام چیزیں میری ہیں۔

جس کا اللہ، اس کا سب کچھ۔ جس کا خالق، اس کی مخلوق۔ جتنا دنیا داری کے لیے محنت کرنا پڑتی ہے اگر اس کا دسواں حصہ محنت خدا کے لیے کی جائے تو ولایت مل جائے۔ اندازہ کرو کہ ایک شخص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے چار سال نکالے اور کوئی کام نہ ہو۔ ذکر، مجاہدات، فکر اور مراقبات کرے تو ولی بن جائے گا یا نہیں؟ اور اگر بی۔ اے اور بی۔ ایس۔ سی اور ایم۔ ایس۔ سی کرے تو کیا ہوگا؟ بوٹ پالش کرے گا۔ اس سے اندازہ لگا لو

کہ اللہ تعالیٰ کا ملنا آسان ہے یا ڈاکٹری اور انجنیئری؟

ایک ایم۔ایس۔سی پاس لڑکا میرے پاس آیا کہ دعا کرو نوکری مل جائے۔جتنی محنت دنیا کے لیے کرتے ہیں اس کا دسواں حصہ اللہ تعالیٰ کے لیے کریں تو کیا سے کیا مل جائے گا۔شیطان نے ہمارا رخ اللہ تعالیٰ اور آخرت سے دنیا کی طرف پھیر دیا ہے۔حالانکہ اگر ہم اللہ کی طرف آئیں تو مخلوق قدموں میں ہو گی۔ مرغی کے بچوں کو پکڑنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ مرغی کو پکڑ لو، تو بچے خود بخود ہاتھ آجائیں گے۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے مثال دی ہے کہ دنیا کی مثال سایہ کی سی ہیاور آخرت کی مثال پرندہ کی ہے، پرندہ کو پکڑلو تو سایہ خود بخود ہاتھ آجائے گا۔

آپ کہیں گے کہ کون پوری دنیا پر لات مارے؟ تو اللہ تعالیٰ کا بھی آپ سے ایسا مطالبہ نہیں ہے کہ تم اپنی سب مرضیوں کو ملیا میٹ کر دو۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی رضامندی کا جو خاکہ مقرر کیا ہے، وہ ایسا بنایا ہے کہ تمہاری جائز خواہشات بھی بیچ میں پوری ہوں اور اللہ تعالیٰ کی مرضی بھی حاصل ہو۔خواہشات کو پورا کرو لیکن اس میں دو چیزوں کا خیال رکھو۔عمل کرو تو اللہ تعالیٰ کی رضا کے جذبے کے ساتھ کرو اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ سے کرو۔جو عمل بھی کرو عمل کرنے سے پہلے معلوم کرلو کہ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم کیا ہے؟ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ اس میں کیا ہے؟ اخلاص اور اتباع محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حدود کے اندر جو بھی اپنی چاہت کو پورا کرے گا وہ دین ہے۔حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مرضیات الٰہیہ کا آئینہ ہیں۔جو اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کر کے دکھایا ہے۔جو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاکہ پر آئے گا اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو گا۔اگر تمہاری مرضی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہوئی اور عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے سے رنگا گیا، تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے لیے محبوبیت کے دروازے کھلیں گے۔

اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ (ال عمران۔۳۱)

ترجمہ: اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری راہ چلو، تا کہ محبت کرے تم سے اللہ۔

خدا کی محبوبیت کا دروازہ اخلاص کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع سے کھل جاتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا با اخلاص اتباع محبوبیت رب کے دروازے کو کھول دیتا ہے۔جب تم اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جاؤ گے تو محبوب کو کوئی بھی تکلیف نہیں دیتا۔اللہ تعالیٰ یہاں (دنیا میں) بھی پھولوں کی طرح رکھیں گے اور آخرت میں بھی۔اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق کرلو۔اللہ تعالیٰ کھانے پینے اور کھلانے

پلانے سے منع نہیں کرتا۔ ہاں جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے ان میں انسان کا نقصان ہے اور حلال میں سراسر فائدہ ہی فائدہ ہے۔ حلال کی ہوئی چیزوں کو اختیار کرنے میں اپنا فائدہ ہے۔ ایک شخص ہپیوں (hyppies) میں پھنس گئے۔ تو تین ہفتوں میں شراب پینے کی عادت ہوگئی۔ اور چرس پینا بھی شروع کر دیا۔ اس نے کہا کہ ۱۰۰ روپیہ پر ایک شراب کی بوتل ملتی ہے (یہ ۱۹۷۳ء کی بات ہے)۔ اور بھی اس نے عجیب عجیب قصے سنائے۔ تھوڑا عرصہ ایسوں کی صحبت میں اور رہتا تو بیڑا غرق ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو کھینچا اور ھدایت دی۔ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے اور اس کی ہی چلتی ہے۔ جو حالات چاہے طاری کرے۔ وہ حاکم ہے، مالک ہے۔ ہم مملوک اور محکوم ہیں۔ جو چاہے ہم پر تصرّف کرے۔ لیکن حکیم ہے، رحیم ہے، شفیق ہے، رؤف ہے، کریم ہے اور بندوں پر حنّان اور منّان ہے۔ جب وہ ایسا پروردگار ہے تو ہمارے ساتھ کوئی معاملہ ظلم کا نہیں کرے گا۔ مثال کے طور پر اگر بچہ کو ز کام ہو جائے تو امّاں انجکشن لگواتی ہے، حالانکہ ماں بچہ کی کسی قسم کی تکلیف گوارا نہیں کر سکتی لیکن بچہ کی صحت یابی مقصود ہوتی ہے۔ اس لیے انجکشن لگوانے کی وقتی تکلیف کو برداشت کر لیتی ہے۔ اسی طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہم پر جو ناخوشگوار حالات آتے ہیں وہ ہمارے اعمال بد کا مداوا ہوتے ہیں۔ تاکہ آخرت میں بداعمالی کی سزا نہ ہو، اور یہاں اس کا علاج ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ عافیت، چین اور آسانی، اس دنیا کی بھی اور آخرت کی بھی مانگنی چاہئے۔ اور اگر خدانا خواستہ کوئی ناخوشگوار معاملہ ہو تو اس پر صبر کرنا چاہئے اور راضی رہنا چاہئے۔ جب تسلیم و رضا انسان کا مقام بن جاتی ہے تو پھر انسان کے دل میں جو خشاخش اور اندوہ وغیرہ پیدا ہوتے ہیں اس پر راضی ہوتا ہے۔ ایک بزرگ حضرت شیخ جیلیؒ گذرے ہیں۔ وہ اپنے مرید سے کہتے ہیں کہ میں تم کو ایسی بات نہ بتاؤں کہ دنیا میں بھی جنت کا مزہ آجائے؟ وہ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہو تو چین ہی چین ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ یوں کیوں ہوا؟ ایسا کیوں ہو گیا؟ تو پھر ہم پریشان ہوتے ہیں۔ اہل اللہ کے دلوں کو سکون اس لیے ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں مگن ہوتے ہیں۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (یونس۔۶۲)

آگاہ رہو کہ اللہ کے ولیوں کو نہ کوئی خوف ہوتا ہے اور نہ کوئی غم۔

تیرے فقیر حال مست، تیرے امیر مال مست

انسان جب اپنی مرضی کو مٹاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع ہو جاتا ہے تو طالب سے مطلوب

بن جاتا ہے۔اور محبؔ سے محبوب بن جاتا ہے۔چاہنے والا سے چہیتا بن جاتا ہے۔اور بقول مجذوبؒ کے

کیا سے کیا تو نے ہمیں ذوق فراواں! کر دیا

پہلے جاں پھر جانِ جاں پھر جانِ جاناں کر دیا

یعنی اے اللہ کی طلب کے جذبے! تو نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا۔پہلے ابتداء ہوئی تو اپنی جان کا احساس ہوا۔پھر جان کی جان کا اور پھر محبؔ رب العالمین بنے۔

بس یہ حالت ہو کہ مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ (اللہ کی مرضی سب سے پہلے)

****

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

(مَثَلُ مَا فِی الْاٰیَۃِ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلاً کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَ)

شَجَرَۃِ طَیِّبَۃِ

اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ

حمد ہے سب تیری ذات کبریاء کے واسطے — اور درود ونعت ختم الانبیاء کے واسطے

اور سب اصحاب وآل انبیاء کے واسطے

دربدر پھرتی ہے خلقت التجا کے واسطے — آسرا تیرا ہے پر مجھ بے نوا کے واسطے

رحم کر مجھ پر الٰہی اولیاء کے واسطے

اِن بزرگوں کو شفیع لایا ہوں میں ہو کر ملول — کیجیو یہ عرض میری ان کی برکت سے قبول

ہاتھ اٹھاؤں جب ترے آگے دعا کے واسطے

دین میں مجھ کو شرف دے حق میں دے مجھ کو علُو — دور کر دل سے مرے ہر منقصت اور ہر غُلُو

حضرت اشرف، فقیرو تھانوی کے واسطے

خلق کو ہوتا ہے حج زیارت خانہ نصیب — کر مجھے اپنی مدد سے حجِ مردانہ نصیب

حاجی امداداللہ ذوالعطاء کے واسطے

پاک کر ظلماتِ عصیاں سے الٰہی دل مرا — کر منور نورِ عرفاں سے الٰہی دل مرا

حضرت نورمحمد پرضیاء کے واسطے

ایسے مرنے پر کروں قربان یارب لاکھ عید — اپنی تیغِ عشق سے کر لے اگر مجھ کو شہید

حاجی عبدالرّحیم اہلِ غزا کے واسطے

کر وہ پیدا درد و غم میرے دلِ افگار میں — بار پاؤں جس سے اے باری ترے دربار میں

شیخ عبدالباری شاہ بے ریا کے واسطے

شرک وعصیان وضلالت سے بچا کر اے کریم — کر ہدایت مجھ کو اب راہِ صراطِ مستقیم

شاہ عبدالہادی پیرہدیٰ کے واسطے

دین و دنیا کی طلب عزت نہ سرداری مجھے　　　اپنے کوچے کی عطا کر ذلت و خواری مجھے
شاہ عضد الدّین عزیز دوسرا کے واسطے

دے مجھے عشقِ محمد اور محمد یوں میں گن　　　ہو محمد ہی محمد ورد میرا رات دن
شہ محمد اور محمدی اتقیا کے واسطے

حبِّ حق حبِ الٰہی حبِّ مولیٰ حبِّ رب　　　الغرض کر دے مجھے محوِ محبت سب کا سب
شہ محبّ اللہ شیخ باصفا کے واسطے

گرچہ میں غرقِ شقاوت ہوں سعادت سے بعید　　　پر توقع ہے کرے مجھ سے شقی کو تو سعید
بوسعید اسعدِ اہل ورا کے واسطے

مال ابتر حال ابتر سب مرے ابتر ہیں کام　　　لطف سے اپنے مرے کر ملک دیں کا انتظام
شہ نظام الدّین بلخی مقتدا کے واسطے

ہے یہی سب دین میرا اور یہی سب ملک و مال　　　یعنی اپنے عشق میں کر مجھ کو باجاہ و جلال
شہ جلال لدّین جلیل اصفیا کے واسطے

حبّ دنیاوی سے کر کے پاک مجھ کو اے حبیب　　　اپنے باغِ قدس کی کر سیر تو میرے نصیب
عبد قدوس شہ قدس و صفا کے واسطے

کر معطّر روح کو بوئے محمد سے مری　　　اور منور چشم کو روئے محمد سے مری
اے خدا شیخ محمد رہنما کے واسطے

کر عطا راہ شریعت روئے احمد سے مجھے　　　اور دکھا نور حقیقت خوئے احمد سے مجھے
شیخ احمد عارف صاحب عطا کے واسطے

کھول دے راہِ طریقت قلب پر یا حق مرے　　　کر تجلی حقیقت قلب پر یا حق مرے احمد
عبد الحق شہِ ملکِ بقا کے واسطے

دین و دنیا کا نہیں درکار کچھ جاہ و جلال　　　ایک ذرّہ درد کا یا حق مرے دل میں تو ڈال
شہ جلال الدّین کبیر اولیاء کے واسطے

ہے مکدّر ظلمتِ عصیاں سے میرا شمس دیں　　　کر منور نور سے میرا عرفاں کے میرا شمسِ دین

شیخ شمس الدّین ترک شمس ضحیٰ کے واسطے

اے مرے اللہ رکھ ہر وقت ہر لیل ونہار عشق میں اپنے مجھے بے صبر و بے تاب وقرار
شیخ علاؤ الدّین صابر با رضا کے واسطے

دے ملاحت مجھ کو حق تمکینیِ ایمان سے اور حلاوت بخش گنجِ شکر عرفان سے
شہ فرید الدّین شکر گنج بقا کے واسطے

عشق کی راہ میں ہوئے جو اولیا اکثر شہید خنجر تسلیم سے اپنے مجھے بھی کر شہید
خواجہ قطب الدّین مقتول ولا کے واسطے

بے ترے ہی نفس وشیطاں درپئے ایمان ودیں جلد ہو یا رب مرا آکر مددگار ومعیں
شہ معین الدّین حبیب کبریا کے واسطے

یا الٰہی بخش ایسا بے خودی کا مجھ کو جام جس سے اٹھ جا پردۂ شرم وحیا، ننگ ونام
خواجہ عثمان با شرم وحیا کے واسطے

دور کر مجھ سے غمِ موت وحیات مستعار زندہ کر ذکر شریف حق سے اے پروردگار
شہ شریف زندنی با اتقیا کے واسطے

آتشِ شوق اس قدر دل میں مرے بھرا ے ودود ہر بُنِ مو سے مرے نکلے تری الفت کا دُود
خواجہ مودود چشتی پارسا کے واسطے

رحم کر مجھ پر تو اب چاہِ ضلالت سے نکال بخش عشق ومعرفت کا مجھ کو یا رب مُلک ومال
شاہ بو یوسف شہِ شاہ وگدا کے واسطے

مست اور بیخود بنا بوئے محمد سے مجھے محترم کر خواریٔ کوئے محمد سے مجھے
بو محمد محترم شاہ ولا کے واسطے

صدقے احمد کے یہ ہے امید تیری ذات سے کہ بدل کردے مرے عصیان کو حسنات سے
احمد ابدال چشتی با سخا کے واسطے

حد سے گذرا رنجِ فرقت اب تو اے پروردگار کر مری شامِ خزاں کو وصل سے روزِ بہار
شیخ ابو اسحٰق شامی خوش ادا کے واسطے

شادی وغم سے دوعالم کی مجھے آزاد کر اپنے دردوغم سے یارب دل کو میرے شاد کر
خواجہ ممشاد علوی بوالعلا کے واسطے

ہے مرے تو پاس ہر دم لیک میں اندھا ہوں پر بخش وہ نوربصیرت جس سے تو آوے نظر
بوہبیرہ شاہ بصری پیشوا کے واسطے

عیش وعشرت سے دوعالم کے نہیں مطلب مجھے چشم گریاں سینہ بریاں کرعطا یارب مجھے
شیخ خذیفہ مرعشی شاہ صفا کے واسطے

نے طلب شاہی کی نے خواہش گدائی کی مجھے بخش اپنے در تلک طاقت رسائی کی مجھے
شیخ ابراہیم ادھم بادشاہ کے واسطے

راہزن میرے ہیں دو قزاق باگر زِگراں تو پہنچ فریاد کو میری کہیں اے مستعاں
شہ فضیل ابن عیاض اہل دعا کے واسطے

کر مرے دل سے تو اے واحد دوئی کا حرف دور دل میں اور آنکھوں میں بھر دے سربسر وحدت کا نور
خواجہ عبدالواحد بن زید شا کے واسطے

کر عنایت مجھ کو توفیقِ حسن اے ذوالمنن تا کہ ہوں سب کام میرے تیری رحمت سے حسن
شیخ حسن بصری امام الاولیا کے واسطے

کچھ نہیں مطلب دوعالم کے گل وگلزار سے کر مشرف مجھ کو تو دیدارِ پُرانوار سے
سرورِ عالم محمد مصطفٰے کے واسطے

آپڑا در پر ترے میں ہر طرف سے ہو ملول کر تو ان ناموں کی برکت سے دعا میری قبول
یاالٰہی اپنی ذاتِ کبریا کے واسطے

ان بزرگوں کے تئیں یارب غرض ہر کار میں کرشفاعت کا وسیلہ اپنے تو دربار میں
مجھ ذلیل وخوار ومسکین وگدا کے واسطے

اس دوئی نے کر دیا ہے دور وحدت سے مجھے کر دوئی کو دور کر پُرنور وحدت سے مجھے
تا ہوں سب عمل میرے خالص رضا کے واسطے

کر دیا اس عقل نے بے عقل و دیوانہ مجھے کر ذرا اس ہوش سے بے ہوش ومستانہ مجھے

یا حق اپنے عاشقانِ باوفا کے واسطے

کشمکش سے نا امیدی کی ہوا ہوں میں تباہ دیکھ مت میرے عمل، کر لطف پر اپنے نگاہ
یارب اپنے رحم واحسان وعطا کے واسطے

چرخِ عصیاں سر پہ ہے زیر قدم بحرِ الم چار سُو ہے فوجِ غم کر جلدی اب بہر کرم
کچھ رہائی کا سبب اس مبتلا کے واسطے

گرچہ میں بدکار و نالائق ہوں اے شاہِ جہاں پر تیرے اب چھوڑ کر در کو بتا اب جاؤں کہاں
کون ہے تیرے سوا مجھ بے نوا کے واسطے

ہے عبادت کا سہارا عابدوں کے واسطے اور تکیہ زہد کا ہے زاہدوں کے واسطے
ہے عصائے آہ مجھ بے دست و پا کے واسطے

نے فقیری چاہتا ہوں نے امیری کی طلب نے عبادت نے زہد نے خواہشِ علم وادب
دردِ دل پر چاہئے مجھ کو خدا کے واسطے

عقل و ہوش و فکر اور نعمائے دنیا بے شمار کی عطا تو نے مجھے پر اب تو اے پروردگار
بخش وہ نعمت جو کام آوے سدا کے واسطے

گرچہ عالم میں الٰہی سعی میں نے بسیار کی پر نہ کچھ تحفہ ملا لائق ترے دربار کی
جان و دل لایا و لے تجھ پر فدا کے واسطے

گرچہ یہ ہدیہ مرا ناقابلِ منظور ہے پر جو ہو مقبول کیا رحمت سے تیری دور ہے
کشتگانِ تیغ تسلیم و رضا کے واسطے

حد سے ابتر ہو گیا ہے حال مجھ ناشاد کا کر مری امداد اللہ وقت ہے امداد کا
اپنے لطف و رحمتِ بے انتہا کے واسطے

جس نے یہ شجرہ دیا ہے جس نے یہ شجرہ لیا جس نے یہ شجرہ پڑھایا جس نے یہ شجرہ پڑھا
بخش دیجئے سب کو ان اہلِ صفا کے واسطے

****